

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نوجوانی و نسوانی
رکن نیشنل آف پاکستان نوجوانی و نسوانی

MEMBER
APNS
CPNE

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیر — سادہ خاتون

مدیر — قدر ریاض

نائب مدیر — رضیہ جمیل

مدیر خصوصی — امت اصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات — عدنان

بشیرا — خالد جیلانی

قانونی مشیر — نور الدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈیٹرز اینڈ پبلشرز

واپس اپ

0317 2266944



مکمل ناول

محبت کی دُعا، راشدہ رُحمت 70
دُور کے درختوں تک، فرزانہ کھرن 108

ناولٹ

پریت کی ریت، فرح بھٹو 220
صحیح جوڑ، نظیر فاطمہ 198

افسانے

پس چہ باید کرد، قانہہ رابعہ 59
میرا بھڑم، عنبرین ابدال 64
وجہ تنازعہ، حمیرا شفیق 104
لذت نہ رہی، عصامہ نورین 167
برداشت، ہاجرہ ریحان 161
کاری ہوتی زندگی، ماریہ کامران 188
حقیقت، شازیہ الطاف ہاشمی 217

اکتوبر 2021

جلد 49 نمبر 06

قیمت 100 روپے

سیر 10

ادب 11

ناد و خاتون 25

آپس کیل پرندہ

قدرت اللہ شہاب کی باتیں، انشا جی 16

ظنون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت (اصبور) 240

مجھ سے ملے

آلو الحسن سے باتیں، شاہین رشید 242

انٹرویو

اُم طیفور سے ملاقات، شاہین رشید 18

ناول

رنگ ریز میک، عفت حیر 170
زندگی ہم تجھے گزاریں گے، راحت جبین 32

ماہنامہ خواتین، خواتین اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے ماحول ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیوی میٹل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



نظمیں غزلیں

- غزل
غزل
نظم
غزل
- 234 اتباف ابرک
235 ساغر نظامی
234 ام رجا بابر
235 آنعم سجیل

رنگارنگ پہول

- رنگارنگ سلسلہ
خبریں ویریں
- 236 شگفتہ جاہ
250 واصفہ سہیل

نفسیات

- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں
عدسان
- 256

نیوٹی بکس

- نیوٹی بکس کے مشورے
امت الصبر
- 258

پکوان

- موسم کے پکوان
آپ کا باورچی خانہ
- 252 خالہ جیلانی
254 حمیرا رضا

میری بیاض سے

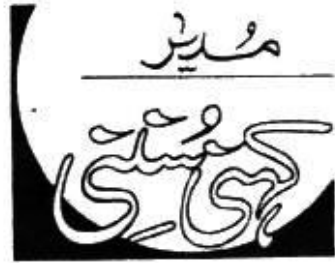
- آپ کی بیاض سے
خالہ جیلانی
- 239

زنگارنگ بک کیفٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 1,200 روپے
ایشیاء افریقہ یورپ ----- 18,250 روپے
امریکہ کینیڈا آسٹریلیا ----- 20,750 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91 بلاک W، تارچھ ناظم آباد، کراچی
Phone 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 ☎ 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجٹ اکتوبر کا شمار میلے حاضر ہیں

اکتوبر میں اسلامی سال کے - تیسرے چھینے ربیع الاول کا آغاز بھی ہوا ہے۔ ربیع الاول کے لغوی معنی پہلی جہلہ کے ہیں۔ ربیع الاول کی ایک مقررہ جمع پوری کا تہرات کے لیے رحمت کا وہ پیغام لے کر آئی جو ہمارے پہلے ہے خاتم الانبیاء، محسن انسانیت، رحمتِ دو عالم، پیغمبرِ من و سلامتی سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز وڑوں درود، لاکھوں سلام۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی توید رب العالمین نے تخلیقِ آدم سے پہلے دے دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہی وجہ تخلیقِ کائنات ہے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی کامل ہستی نہ آپ سے پہلے کوئی ہے نہ آپ کے بعد قیامت تک کوئی ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُنیا میں تشریف آوری پوری کائنات پر پروردگارِ عالم کا سب سے عظیم صلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو بلند مقام عظمت و رفعت اور بلندی عطا کی، وہی مثالی ہے۔ اس رفعت و عظمت تک کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام کو وہ بلند مقام عطا فرمایا ہے کہ دُنیا کے ہر خطے، ہر ملک، ہر کمرے میں پانچ وقت ہر اذان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ بلند ہو رہا ہے۔ جب تک کہ ارض پر اذان کی آواز گونجی رہے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی گونجتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی کلمہ طیبہ کا حصہ ہے۔ اس کا اعتراف تو غیر مسلم تاریخ دان اور دانش ور بھی کرتے ہیں کہ لاکھوں سال کی انسانی تاریخ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل مقام پر فائز ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی تاریخ کی وہ عظیم ترین اور بااثر شخصیت ہیں جنہوں نے انسانیت کو سعادت و فلاح کی راہ پر گامزن کیا۔ ایک عظیم ترین مذہب کی بنیاد رکھی اور اس کی اشاعت کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ، ہر گوشہ روشن اور متوجہ ہے۔ آپ کی حیات طیبہ انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اگر آپ کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو دُنیا امن اور سکون کا گوارہ بن سکتی ہے۔ ساتھ ارحام،

تاریخ کی پسندیدہ مصنف بہن فرح بخاری کے شوہر سید مظہر عباس کا سفر حیات 12 ستمبر کو اختتام کو پہنچا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ
سید مظہر عباس کو دناؤ کا شکار ہونے اور بندہ دن بیدار رہ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جملے۔ وہ ایک اچھے انسان اور بہت اچھے شوہر اور باپ تھے۔ ان کی دائمی تبدیلی بہن فرح بخاری کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہم نہیں فرح بخاری کے غم میں بلکہ ان کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ان کو اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ان کے بچوں کو دُلیل کے ہر سرورِ گرم سے محفوظ رکھے اور سید مظہر عباس کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

محمود بابر فیصل کو دُنیا سے رحلت ہوئے جو تھائی صدمے سے زیادہ صدمہ میت گیا لیکن ان کی بارگاہِ دہلیہ طبعیت ان کی شگفتہ بیانی کو ہم آج تک نہیں بھول سکتے ہیں۔ یہ ان کی کرشمہ ساز شخصیت کا کمال تھا کہ انہوں نے عمر تو زیادہ نہیں پائی لیکن تجلیں بہت زیادہ جلیں۔ ان کے خدمتِ احباب اور سامعین انہیں آج بھی یاد کرتے ہیں۔

دُنیا سے رحلت ہوجانے والوں کے لیے بہترین تحفہ دُعا ہے۔ اللہ تعالیٰ محمود بابر فیصل کی مغفرت فرمائے۔ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔
قارئین سے دُعا کی مغفرت کی درخواست ہے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کون کون روشنی

ادارہ

جو شخص ان کی بات مانے گا وہ اسے جہنم میں پھینک دیں گے۔“

میں نے عرض کیا: ”اللہ کے رسول! ہمیں ان کے اوصاف (اور علامات) بتا دیجیے۔“

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ ہم ہی میں سے کچھ افراد ہوں گے اور ہماری زبانوں ہی میں بات کریں گے۔“

میں نے کہا: ”اگر مجھے (ان کا) یہ زمانہ ملے تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مسلمانوں کی اجتماعیت اور ان کے امام کے ساتھ پیوستہ رہنا۔ اگر ان کی اجتماعیت نہ ہو اور نہ کوئی

(متفقہ) امام ہو تو ان سب فرقوں سے الگ رہنا اگرچہ تجھے کسی درخت کی جڑ چبانی پڑے حتیٰ کہ تجھے

اسی حالت میں موت آجائے۔“

فوائد و مسائل:

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر دور میں

افضل انسان

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا:

”کون سا انسان افضل ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنے والا۔“

اس نے کہا: ”اس کے بعد کون سا (افضل ہے)؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”وہ آدمی جو کسی گھائی میں اللہ کی عبادت کرتا ہے، لوگوں کو اپنے شر سے بچائے رکھتا ہے۔“

اجتماعی نظم و ضبط

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”کچھ لوگ ہوں گے جو جہنم کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو (جہنم کی طرف) بلائیں گے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”مومن ایک سو راح سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔“
فوائد و مسائل:

- 1- مومن سے بعض اوقات غلطی ہو سکتی ہے لیکن غلطی واضح ہونے پر اس سے رجوع کر لینا چاہیے۔
- 2- جو شخص ایک بار ناقابل اعتماد ثابت ہو جائے دوبارہ اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لینا درست نہیں۔

مشتبہ کام کرنے سے رک جانا

امام شعبی رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا:
میں نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو
منبر پر اپنے کانوں کی طرف انگلیوں سے اشارہ
کر کے یہ فرماتے سنا:

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔
آپ ﷺ فرما رہے تھے: ”حلال واضح ہے اور
حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ
شبہ والی چیزیں ہیں۔ جن سے اکثر لوگ واقف نہیں۔
تو جس نے شبہ والی چیزوں سے اجتناب کیا اس نے
اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا اور جو کوئی شبہ والی
چیزوں میں مبتلا ہو گیا۔ وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا۔
جیسے ممنوعہ چراگاہ کے ارد گرد بکریاں چرانے والا،
ہو سکتا ہے کہ (نادانستہ طور پر) اس کے اندر (جانور)
چرائے (اور اس طرح مجرم قرار پا جائے)

خبردار! ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی
ہے (جس میں عام لوگوں کے جانوروں کا داخلہ ممنوع
ہوتا ہے) خبردار! اللہ کی ممنوعہ چراگاہ سے مراد اللہ کی
حرام کردہ چیزیں (اور کام) ہیں۔

سن لو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ
صحیح ہو تو سارا جسم صحیح ہوتا ہے۔ اگر وہ خراب ہو جائے
تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ دل ہے۔“
فوائد و مسائل:

- 1- کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا روزمرہ کے
اعمال، ان میں کچھ واضح طور پر حلال ہیں جن میں

ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جو باطل کی طرف
دعوت دینے والے تھے اور عام لوگ ان کی چرب
زبانی سے متاثر ہو کر ان کی بات مان لیتے تھے۔

2- اختلاف کے اس دور میں صحیح راستہ وہی تھا
جس پر صحابہ کرام اور تابعین قائم تھے، بعد میں پیدا
ہونے والے اختلافات میں بھی صحابہ تابعین کا طرز
عمل ہی قابل اتباع ہے۔

3- مسلمانوں کے امام سے مراد وہ حکمران اور خلیفہ
ہے جو اسلامی شریعت کی روشنی میں ان کے معاملات کا
انتظام کرتا اور دوسرے فرائض انجام دیتا ہے۔

4- فتنوں کے زمانے میں کسی پارٹی کے ساتھ
مل کر دوسرے مسلمانوں کے جان و مال کو نقصان
پہنچانا جائز نہیں، البتہ خلیفہ المسلمین کے ساتھ مل کر
باغیوں کے خلاف جنگ کرنا اسلامی سلطنت کے
دفاع اور قوت کے لیے ضروری ہے۔

فتنوں کا مقابلہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”قریب ہے کہ مسلمان کے لیے بہترین مال
بکریاں ہوں جن کو پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کی
جگہوں میں (جہاں گھاس چارہ مل سکتا ہے) لیے پھرتا
رہے۔ اور (اس طرح) اپنے دین کو فتنوں سے
بچانے کے لیے (فتنوں سے دور) بھاگتا پھرے۔“

فوائد و مسائل

1- جب عام لوگوں کے ساتھ رہنے میں ایمان
کو خطرہ ہو تو گوشہ نشینی اختیار کرنا جائز ہے۔

2- جو شخص فتنوں میں غلط کار لوگوں کی غلطیاں
واضح کرنے کے لیے اپنی زبان اور علم کو استعمال کر سکتا
ہو، اس کے لیے وعظ و نصیحت اور بحث و مناظرہ کے لیے
آبادی میں رہنا اور یہ خدمت سرانجام دینا افضل ہے۔

غلطی دہرانے سے اجتناب کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

کوئی شک نہیں، مثلاً روٹی، شہد، اللہ کا نام لے کر ذبح کیے ہوئے حلال جانور کا گوشت، جائز ضرورت کے لیے کہیں آنا جانا اور کسی سے بات چیت کرنا وغیرہ۔ کچھ چیزیں اور کام واضح طور پر حرام ہیں۔ مثلاً: خنزیر کا گوشت، شراب، مردار، جھوٹ بولنا، چوری کرنا اور زنا کرنا وغیرہ۔

بعض چیزیں اور کام ایسے ہیں جن کا حلال یا حرام ہونا واضح نہیں۔ عام لوگ ان مسائل سے واقف نہیں ہوتے۔ علماء ان کا حکم قرآن و حدیث کے الفاظ کے اشارات و اقتضاء سے یا قیاس وغیرہ سے معلوم کرتے ہیں۔

2۔ جس چیز کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ مسئلہ پوچھنے سے پہلے بھی اس سے پرہیز کرنا بہتر ہے کیونکہ ہو سکتا ہے معاملے کی ایک صورت جائز اور ایک ناجائز ہو۔ مسئلہ معلوم ہو جانے کے بعد صحیح اور رائج موقف کے مطابق عمل کیا جائے۔

3۔ انسان کو بلا وجہ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے وہ بدنام ہو جائے۔

4۔ جس کام سے ممنوع کام تک نوبت پہنچنے کا خطرہ ہو، اس سے بھی پرہیز کرنا ضروری ہے۔ جیسے غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں ملنا، اگرچہ پردہ کی پابندی کے ساتھ ہو۔ اس سے خطرہ ہے کہ شیطان گناہ کی خواہش پیدا کر دے۔ اور دونوں افراد کبیرہ گناہ میں ملوث ہو جائیں۔

5۔ دل کی اصلاح بہت ضروری ہے تاکہ اخلاص، یقین اور اللہ کی محبت وغیرہ جیسی صفات حاصل ہوں۔ ان کی وجہ سے نیکی پر عمل کرنا اور گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔

گوشہ نشینی

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قل وعارت (اور فتنوں کے ایام) کے دوران میں عبادت کرنا ایسے ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا۔“

فوائد و مسائل:

1۔ فتنہ و فساد کے ایام میں فتنوں میں شمولیت سے بہتر ہے کہ ان سے الگ تھلگ رہا جائے۔ اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارا جائے۔

2۔ رہبانیت ممنوع ہے لیکن فتنوں کے ایام میں گوشہ نشینی رہبانیت میں شامل نہیں، کیوں کہ اس گوشہ نشینی کا مقصد اپنے آپ کو قتل و غارت اور فساد میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھنا ہے۔

3۔ ہجرت میں وطن چھوڑا جاتا ہے اور گوشہ نشینی میں اہل وطن کی برائیوں اور شرارتوں سے دامن بچانے کے لیے ان سے تعلق محدود کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں عمل مشابہ ہیں اور ان دونوں کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔

صحیح عقائد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اسلام شروع میں اجنبی تھا، اور وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا۔ اس لیے اجنبیوں کو مبارک ہو۔“ فوائد و مسائل:

1۔ ”غریب“ اجنبی اور بے وطن کو کہتے ہیں۔ شروع میں اسلام کی یہ کیفیت تھی کہ اسے کوئی جانتا نہ تھا۔ معاشرہ اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ اسے سمجھتے اور قبول کرتے گئے حتیٰ کہ ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو گیا اور کفر و شرک ختم ہو گیا۔

2۔ خلفائے راشدین کے دور کے بعد اسلام میں بدعات کا ظہور ہوا۔ بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کے رسم و رواج اور خیالات اپنا لیے۔ اس طرح اصل اسلام چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اکثریت نے خود ساختہ رسم و رواج اور غلط عقائد و اعمال ہی کو صحیح اسلام سمجھ لیا۔

3۔ جن اجنبیوں کو مبارک باد دی گئی ہے۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدعات کی کثرت میں سنت

پر عمل پیرا رہیں، غلط عقائد مشہور ہونے پر صحیح عقیدے پر قائم رہیں اور اخلاقی انحطاط کے دور میں صحیح اسلامی اخلاق کو اختیار کریں۔

اجنبی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اسلام اجنبی کے طور پر شروع ہوا، اور وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا۔ تو اجنبیوں کو مبارک ہو۔“ عرض کیا گیا: اجنبی (غرباء) کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قبائل سے الگ ہونے والے۔“

اللہ کے پسندیدہ لوگ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

وہ ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: ”آپ کیوں رو رہے ہیں؟“ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے ایک ارشاد کی وجہ سے رونا آ رہا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے۔

”تھوڑا سا دکھاوا بھی شرک ہے۔ اور جو کوئی اللہ کے کسی دوست سے دشمنی رکھتا ہے۔ وہ (گویا) اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ گناہ متقی نیک لوگ پسند ہیں جو غیر حاضر ہوں تو انہیں تلاش نہیں کیا جاتا۔ اگر موجود ہوں تو انہیں بلایا نہیں جاتا، نہ انہیں پہچانا جاتا ہے۔“

ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں، وہ ہر ایک غبار آلود تاریک فتنے سے نکل جاتے ہیں (اور فتنوں سے متاثر ہو کر گمراہ نہیں ہوتے۔)

صاحب کمال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لوگوں کی مثال ان سواونٹوں کی سی ہے جن میں سے ایک بھی سواری کے قابل نہ ملے۔“ فوائد و مسائل:

1- صاحب کمال لوگ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔

2- عوام میں زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کہ انہم ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یہودی اکہتر (71) فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ اور میری امت تہتر (73) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔“

قرآن و سنت پر عمل کرنے والے

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یہودی اکہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ (ان میں سے) ایک فرقہ جہنمی تھا اور ستر جہنمی

عیسائی بہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہوئے (ان میں سے) اکہتر جہنمی تھے اور ایک جہنمی۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میری امت ضرور تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ (ان میں سے) ایک

فرقہ جنت میں جائے گا اور بہتر جہنم میں۔“

عرض کیا گیا۔ ”اللہ کے رسول! وہ کون لوگ ہیں؟“

فرمایا: ”جماعت۔“

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بنی اسرائیل اکہتر (71) فرقوں میں تقسیم ہوئے

ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی سائڈے کے بل میں گھسے ہوں گے۔ تو تم بھی ضرور اس میں گھسو گے۔“
صحابہ نے عرض کیا:

”اللہ کے رسول! کیا یہودیوں اور عیسائیوں کی پیروی کریں گے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اور کن کی؟“
فوائد و مسائل

1۔ یہود و نصاریٰ کے رسم و رواج کی پیروی کرنا گمراہی کا باعث ہے۔

2۔ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کے تہواروں میں شریک ہونا ان کی محبت پیدا کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کا مذہب بھی اچھا محسوس ہونے لگتا ہے۔

3۔ ”باع“ مراد وہ فاصلہ ہے جو دونوں ہاتھوں کے سروں کے درمیان اس وقت ہوتا ہے۔ جب دونوں بازو مخالف سمتوں میں دائیں بائیں پھیلا لیے جائیں۔ ”ہاتھ“ (ذراع) سے مراد ہاتھ کی انگلیوں سے کہنی تک کا فاصلہ ہے۔

4۔ سائڈے کے بل میں گھسنے کی کوشش کرنا ایک نامعقول حرکت ہے لیکن یہود و نصاریٰ کی پیروی میں مسلمان یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ یہ کام یا سوچ درست بھی ہے یا نہیں، بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی شروع کر دیں گے۔

5۔ اس پیش گوئی پر عمل کی موجودہ دور میں متعدد مثالیں ہیں۔ جیسے آج سے چند سال قبل جب ”سوشلزم“ کا تصور نیا نیا سامنے آیا تو مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن و حدیث کی نصوص کی اس انداز سے تاویل شروع کر دی کہ جس سے سوشلزم کا اسلام میں شامل ہونا ثابت کیا جاسکے۔ جب روس نے سوشلزم کے اس تصور کو چھوڑ دیا تو ان ہی لوگوں نے قرآن مجید سے مغربی جمہوریت اور مادر پدر آزادی کے حق میں ”دلائل“ تلاش کرنے شروع کر دیے۔



اور میری امت بہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک کے سوا وہ سب فرقتے جہنم میں جائیں گے اور وہ جماعت ہے۔“
فوائد و مسائل:

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل میں پیش آنے والے جن جن واقعات کی جس طرح خبر دی۔ وہ اسی طرح پیش آئے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہے۔

2 فرقوں میں تقسیم ہونے کے بارے میں اس لیے بتایا گیا ہے کہ مسلمان ان اختلاف میں صحیح عمل اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

3۔ مسلمانوں کی اصل ”جماعت“ وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلی آرہی ہے۔ اس جماعت سے لوگ الگ ہو کر مختلف فرقوں کی شکل اختیار کر گئے لیکن اصل ”جماعت“ بھی قائم ہے۔ مسلمانوں کو اسی ”جماعت“ کے ساتھ رہنے اور ان کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔

4۔ جماعت سے الگ ہونے والے خواہش نفس یا غلط تاویلات کی وجہ سے الگ ہوئے۔ جو لوگ ان فرقوں میں شامل نہیں ہوئے۔ وہ قرآن و حدیث پر قائم رہے۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

5۔ نجات کا دار و مدار اپنی پارٹی کا کوئی خاص نام رکھ لینے پر نہیں بلکہ قرآن و سنت کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عالمین کتاب و سنت مختلف زمانوں اور علاقوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ الگ الگ فرقے بن گئے ہیں بلکہ وہ سب تنظیمیں یا جماعتیں ”الجماعۃ“ میں شامل ہیں۔

دیگر اقوام کی پیروی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تم لوگ پہلوں کے طریقے کی (پوری طرح) پیروی کرو گے۔ جیسے باع باع کے برابر، ہاتھ ہاتھ کے برابر، اور بالشت بالشت کے برابر ہونی

قدرت اللہ شہاب کی باتیں

انشائی

قسط بنگال کے دنوں میں جب کہ یہ نئے نئے آئی سی ایس ہوئے تھے اور بدناپور میں تملوک کے ایس ڈی اوتھے تو انہوں نے اپنی نگرانی میں بیویوں کے گودام لٹوا دیے تھے جن میں ہزاروں بوریاں لالہ ہلالا اگر وال نے موقع مناسب پر سونے کے مول بیچنے کے لیے ذخیرہ کر رکھی تھیں، ان پر ایک تحقیقاتی کمیٹی بھی بنی تھی لیکن یہ دیکھ کر لوگ تو ان کو پوجنے لگے ہیں، بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

اور بھاگل پور کا واقعہ تو اس سے بھی عجیب ہے، کوٹ انڈیا تحریک زوروں پر تھی۔ ایک گاؤں میں لوگوں نے سرکاری ڈاک خانہ جلادیا تھا، اوپر کی سطح پر فیصلہ ہوا کہ یہ پورا گاؤں جلادیا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، چنانچہ کمشنر میکفرسن، ڈپٹی کمشنر پریدو، ڈی آئی جی پولیس کچھ نفری لے کر تیل کے کنستروں سے مسلح شہاب صاحب کی عمل داری میں پہنچ گئے، انہوں نے پوچھا۔

”خیریت؟“

جواب ملا۔ ”ہم فلاں گاؤں جلانے آئے ہیں۔“

یہ بولے۔ ”مجھ سے اجازت لے لی؟“

کمشنر وغیرہ بہت ہنسے اور بولے۔ ”تو کون ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”میں اس علاقے کا ایس ڈی

او، آپ کتنے بھی بڑے حاکم ہوں یہ علاقہ میری تحویل

میں ہے۔ یہاں کے نظم و نسق کا میں ذمہ دار ہوں،

آپ لوگ چلے جائیے۔“

وہ اور زیادہ ہنسے کہ چہ پدی چہ پدی کا شور با۔

ان کے پاس ایک اردلی تھا شیر خان، جہلم کا

رہنے والا، اس سے انہوں نے کہا۔

”دیکھو شیر خان! یہ صاحب لوگ گاؤں کو

جلانے آئے ہیں، تم میرا حکم مانو گے؟“

بولے۔

”حضور آپ ہی کا حکم مانوں گا۔“

انہوں نے فرمایا۔

لاہور اور کراچی کے کئی اخباروں میں یہ خبر چھپی ہے کہ قدرت اللہ شہاب جو اردو کے ایک نامور ادیب ہیں، بھیس بدل کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ان علاقوں میں گھس گئے جو ہمارے نزدیک عرب علاقے ہیں اور ہمارے دشمنوں کی اصطلاح میں ”اسرائیلی“۔ وہاں یہ بیت المقدس میں گھومے پھرے، عربوں کی گھروں میں گئے، ان کے انڈر گراؤنڈ لیڈروں سے ملے کیونکہ یہ فاتح کے مجاہدین کے ساتھ یا ان کی مدد و اعانت سے ہی تو گئے تھے اور اسرائیلی چہرہ دستیوں کے ثبوت مع فلم فوٹو وغیرہ لے کر واپس پہنچ گئے اور وہاں یونیسکو کے پلیٹ فارم سے ایسی معرکے کی تقریر کی، اسرائیلی اور حامیاں اسرائیل بوکھلا کر رہ گئے۔ اقوام متحدہ کے اس پلیٹ فارم سے نہ صرف اسرائیل کی مذمت ہوئی بلکہ یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کو تفتیش کے لیے خود بھاگ کر قتل ایب جانا پڑا۔

☆☆

ہم نے یہ خبر پڑھی اور آنکھیں ملیں، پھر اپنے چنگلی لی،

یہ جاننے کے لیے کہ ہم جاگ رہے ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں

کیونکہ ہم اس قسم کی جرات کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمارا واسطہ

زیادہ تر کاغذی شیروں کے ساتھ پڑتا ہے، سچ کچ کا شیر صرف

چڑیا گھر میں یا ایم بی جی ایم کی فلموں میں ٹائٹل پر دیکھا ہے۔

دیکھا جائے تو اس میں چنگلی لینے کی چنداں بات بھی نہ تھی،

کیونکہ ایک صاحب کے قول کے مطابق قدرت اللہ شہاب ایک

آئس برگ ہیں۔ برف کا پہاڑ، ایک درجہ پانی کے اوپر دس درجے

نیچے، ایک طرف درویش خداست ہیں، دوسری طرف شوخ و شنگ

افسانہ نگار، ایک طرف الحاج، تہہ گزار، اعتکاف نشین، دوسری

طرف بقول ایک صاحب کے راہن مذ کے ہم زلف۔

1948ء میں کشمیر پر حملہ ہوا تو نوکری چھوڑ کر اڑی یا تراڑ

کھل میں جا بیٹھے لیکن ہم سے پوچھیے تو ان کا مزاج اس

سے پہلے سے بلکہ لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھا۔

”اچھا تو ان صاحب لوگوں میں سے جو بھی اس دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے اس کو گولی مار دو۔“ وہ اور بھی بگڑے دل تھا، بولا۔

”جناب! اگر حکم ہو تو، یہ لوگ اگر نہ بھی نکلیں تب بھی گولی مار دوں؟“

انہوں نے کہا۔ ”نہ نہ، ایسا مت کرنا۔“

یہ بات ان افسران علیٰ مقام کو سنا کر کبھی گئی تھی، ڈی آئی جی صاحب نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شیر خان کی بندوق کی نال دیکھ کر سہم گئے۔ ساری پارٹی کو بے نیل و مرام غصے کے شعلے اگلنے لوثا پڑا۔

چیف سیکریٹری کے ہاں طلبی ہوئی تو یہ استعفیٰ جیب میں رکھ کر لے گئے، انہوں نے کہا بر خوردار! تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ ایک گاؤں جل جاتا تو سارے بہار میں آگ لگ جاتی لیکن اتنے بڑے بڑے حاکموں کی، حکم عدولی نہیں کیا کرتے، اب جاؤ میں سمجھ لوں گا۔“

تمتہ اس کہانی کا یہ ہے کہ راجندر پرشاد جوان ہی نواحیات کے رہنے والے تھے اور بعد میں بھارت کے صدر ہوئے۔ یہ ماجرا سن کر ایک جلوس لیے زندہ باد کے نعرہ لگاتے ان کے گھر پر آئے اور اس رشتے سے بعد میں تاحیات ان کو عید پر عید کارڈ بھیجتے رہے۔

☆☆☆

جھنگ اور لائل پور کی ڈپٹی کمشنری کے زمانے میں بھی یہ ہارون الرشیدی کیا کرتے تھے، یعنی بھیس بدل کر شہر اور دیہات میں گھوما کرتے تھے۔ وہاں انہوں نے لوگوں کے لیے جو کچھ کیا اس کی بنا پر اب تک یاد کیے جاتے ہیں لیکن وہاں کے پیروں اور جاگیرداروں کو یہ ایک آنکھ نہ بھائے اور آخراں کی ڈپٹی کمشنری چھڑا کر انہیں ہالینڈ بھیج دیا گیا۔

ایران کے بادشاہ فتح علی قاچار کے ملک الشعراء پر بھی یہی گزری تھی، ایک بار بادشاہ نے کچھ اشعار لکھے جو نہایت ہیچ پوچ تھے، ملک الشعراء سے رائے مانگی تو انہوں نے کہا۔

”حضور! یہ کہاں کی شاعری ہے؟“

بادشاہ نے غصے ہو کر اسے طویلے میں بند کرادیا۔ کچھ دن بعد پھر بادشاہ نے فکر خن کی اور ملک الشعراء کو بلایا تاکہ آ کر دواویس، انہوں نے شعر سنے اور اٹھ گئے۔

شاہ نے پوچھا۔ کہاں چلے؟“
بولے۔ ”پھر طویلے جاتا ہوں۔“

☆☆☆

لاہور کے ایک اخبار نے کمال کیا، ان کے عرب مقبوضہ علاقوں میں جانے کی خبر دی اور سات ہی ٹانکا لگایا کہ یہ کس ملک کا جعلی پاسپورٹ بنا کر گئے تھے؟ وہ کوئی پاکستان کا دشمن ملک ہی ہو سکتا ہے۔ ان کی تحقیق ہونی چاہیے، تب ہمیں معلوم ہوا کہ ارتح کے مجاہدین جب چھاپہ مارنے جاتے ہیں، سرحد پر اسرائیلی افسروں کو بتاتے ہیں کہ ہم آپ کے علاقے میں بم پھینکنے جا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، اچھی بات ہے اور مہر لگا کر اجازت دے دیتے ہیں، بلکہ آدمی بھی ساتھ کر دیتے ہیں تاکہ کوئی ان کو منع نہ کرے۔

دوسری بات بھی ایسی ہی جوڑ دی کہ ایک صاحب جو شہاب کے دوست ہیں۔ پچھلے دنوں کراچی سے لندن آتے ہوئے ماسکو اترے تھے اور ایک تھفل میں پاکستان بھارت کی کنفیڈریشن کے بارے میں خیال آرائی کرتے سنے گئے۔ لیجے ”رائی“ یہ تھی کہ کوئی صاحب جو شہاب کے ایک ہزار ایک دوستوں میں سے ہوں گے۔ پی آئی اے کی اس فلائٹ سے آئے جو ماسکو کے راستے جانی ہے، اتر کر ماسکو کی سیر بھی کی ہوگی۔ اگرچہ کوپچن سے ان کے ملنے کا امکان کم ہے۔ بہر حال پر بت یہ بنا کہ ضرور قدرت اللہ شہاب لندن میں بیٹھے پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن بنا رہے ہیں۔ خبر سے خبری نکلتی ہے بلکہ نکالی جاتی ہے۔

وہ بزرگ بڑے دورانڈیش تھے، جن کی چھاتی پر سے چوہا گزر گیا تو رونے لگے۔ لوگوں نے کہا۔

”میاں اس میں کیا بات گھبرانے اور رونے کی ہے۔“

بولے۔ ”میں چوہے کو نہیں روتا، چوہے کے پیچھے بلی دوڑی آئے گی، بلی کے پیچھے کتا آئے گا، کتے کے پیچھے پولیس کا پیادہ آئے گا اور پھر پوری فوج پریڈ کرتی میری چھاتی پر سے گزر گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔“

شہاب صاحب سمجھے ہوں گے کہ انہوں نے اسرائیل پر چھاپہ مار کر بڑا کام کیا، یہاں ایک معمولی اخبار والے نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ٹنگوی ماری اور چاروں شانے چت کر دیا۔ واہ بھی واہ اخبار والو۔

☆

ام طیفور سے ملاقات شاہن رشید

ماشاء اللہ گزشتہ تین سال سے یہاں اپنے بال بچوں میں خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ انہیں ہمیشہ خوش و خرم اور آباد رکھے آمین۔ میں نے ماسٹر کیا ہے۔ الحمد للہ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی..... میری شادی کو نومبر 2021ء میں سولہ سال ہو جائیں گے۔ میرے میاں صاحب کا نام ”نفیل احمد“ ہے۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا بزنس ہے ”پیکنگ“ کا۔ اللہ پاک نے بھرم رکھے ہوئے ہیں اور اس کی ذات کا بہت کرم ہے۔

”بچپن کیسا گزرا؟“

”بچپن میرا ویسا ہی گزرا جیسا کہ عام بچوں کا گزرتا ہے۔ کویت میں، میں نے جتنا عرصہ گزارا وہ میری زندگی کا سب سے پیارا وقت تھا۔ جب ہم پاکستان آئے تو کچھ عرصہ کے بعد کویت کے حالات ٹھیک ہو گئے تو ابو جی واپس چلے گئے۔ ہم یہاں، ایک اکیلی امی اور چار بچوں کی ذمہ داری، تو اس لحاظ سے امی کو بہت دھیان سے اور بہت ذمہ داری کے ساتھ وقت گزارنا پڑا۔ امی ہمیں بہت زیادہ باہر نہیں نکلنے دیتی تھیں جبکہ ہمارے اطراف میں زیادہ تر لڑکیاں ہی تھیں۔ امی کا کہنا تھا کہ بجائے یہ کہ آپ دوسروں کے گھروں میں جائیں اپنی دوستوں کو اپنے ہی گھر بلا لیں چنانچہ ہم ایسا ہی کرتے تھے اور گھر میں اسٹاپو، گوٹیاں اور ککشن یہ کھیل ہم نے بہت کھیلے ہیں۔ اگرچہ 90ء کا دور بہت اچھا تھا اس کے باوجود ہم بلا ضرورت گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ یہ بھی بتاؤں کہ میرے دوھیال والوں کا تعلق وزیر آباد اور نھیال والوں کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے۔ ہمارا جھکاؤ قدرتی

ہمارے قارئین کا اصرار ہوتا ہے کہ ہر ماہ مصنفین کا انٹرویو کیا جائے۔ قارئین کی فرمائش کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے اس بار ام طیفور کا انتخاب کیا ہے۔

ام طیفور نے بہت زیادہ نہیں لکھا، لیکن انہوں نے جو بھی لکھا، قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔ ملن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مزاح بہت اچھا لکھتی ہیں۔

”کیسے مزاح ہیں؟“

”الحمد للہ۔“

”اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے اور اپنا اصلی نام

بھی بتائیے؟“

”ضرور..... لیکن اس سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی کہ آپ نے اتنی محبت سے رابطہ کیا۔

آپ کا اخلاق بہت اچھا ہے جزاک اللہ..... میرا اصلی نام ”عاصمہ افضل“ ہے اور لکھتی میں

ام طیفور کے نام سے ہوں۔ جائے پیدائش کویت ہے جہاں میں 4 مارچ 1982ء کو پیدا ہوئی..... اور

بچپن کے آٹھ سال وہیں گزارے۔ 1990ء میں جب عراق نے کویت پر حملہ کیا تب ہم لوگ بھی

ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور بائے روڈ آئے اور بائے روڈ کیا جانے والا سفر اور اس کی صعوبتیں آج بھی یاد ہیں۔

ہجرت کر کے گوجرانوالہ آئے اور تب سے لے کر اب تک یہاں ہی رہائش پذیر ہیں۔ ہم ماشاء اللہ

چار بہن بھائی ہیں۔ دو بہنیں اور دو بھائی۔ امی مکمل ہاؤس وائف ہیں ابو جی نے اپنی سروس کے پینتالیس

(45) سال بعد ریٹائرمنٹ لے لی ہے اور اب

اچھا گزرا اور جو وقت اچھا گزرا جائے اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ دادی اماں کے ساتھ گزرا وقت تو بہت یاد آتا ہے۔ ہمارے زمانے کی نانیاں دادیاں تو ”ون مین شو“ ہوا کرتی تھیں اور میری دادی تو واقعی اسی طرح کی تھیں، ان کے ساتھ دس سے پندرہ بچے ایک ساتھ بٹھا دو تو وہ ہر ایک کو انٹرٹین کر لیا کرتی تھیں۔ تو ان کی باتیں سن کر بڑا مزہ آتا تھا.....

دادی اماں نے تقسیم پاکستان کا وقت دیکھ رکھا تھا تو وہ ہمیں اپنے قصے سنایا کرتی تھیں کہ ہماری ہندو لڑکیاں دوست ہوتی تھیں اور وہ ہمیں اپنی رسوئی، کچن میں نہیں آنے دیتی تھیں اور ہم ان کے ساتھ باہر کھیلا کرتے تھے۔ مجھے ہندو لڑکیوں کی یہ باتیں بہت بری لگا کرتی تھیں۔ تو خیر دادی اماں کی باتیں سنتے جانا اور ساتھ ساتھ ان کے ساتھ باتیں کرنا ان کے ساتھ شرارتیں بھی کرنا۔ مجھے آج تک یاد ہے بہت پیارا وقت تھا۔“

”کب لگا کہ اب بڑی ہو گئی ہوں بچپن کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیے؟“

”آپ کا یہ سوال بڑا مشکل ہے اور متنازعہ بھی۔ میں اگر اس کا جواب دینے پر آؤں تو بہت طویل جواب ہو جائے گا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہر بچہ یقین مانیے میرا تجربہ ہے مجھے نہیں معلوم کہ پڑھنے والے کو کیسا لگے لیکن میں اپنے تجربے سے کہہ رہی ہوں کہ ہر بچہ اس وقت بڑا ہو جاتا ہے جب وہ اپنے ارد گرد رہنے والوں کے بد صورت رویوں کو دیکھتا ہے اور پرکھنا اور جانچنا شروع کر دیتا ہے۔ کون اس پر کیسی نظر ڈالتا ہے، کون اس کے ساتھ طنزیہ انداز گفتگو اپناتا ہے، کون اس کے ساتھ غلط رویہ روارکھتا ہے، جب وہ اس چیز کو سمجھنے اور پرکھنے لگ جاتا ہے تو سمجھ لیں کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ یہی حساب تھا میں اس وقت بڑی ہو گئی تھی جب میں نے سب سے پہلے ”کاٹ دار نظر۔ بد صورت رویہ۔ طنزیہ گفتگو

طور پر دوھیال کی طرف زیادہ تھا اور اس کے لیے میں اپنی امی کی ایک صفت ضرور بیان کروں گی۔ کہ امی نے ہمیں دوھیال کے بہت قریب رکھا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انھیال میں جو ہمارے رشتے دار تھے ان کے رویے بہت عجیب تھے ہم ان سے بچ نہیں کر پاتے تھے۔ ان کے رویوں میں عجیب طرح کا تکبر تھا۔ جبکہ دوھیال میں ماحول بہت اچھا اور کھلا ڈالا تھا۔ بڑوں کے درمیان اگر کوئی چیقلش ہو بھی جاتی تھی تو اس کا اثر بچوں پر نہیں پڑنے دیا جاتا تھا۔ دادی سے، پھوپھو سے بہت زیادہ محبت تھی..... امی کے اس رویے کو میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ ہم بچپن میں بہت ضد کر کے دادی اماں اور پھوپھو کے گھر جایا کرتے تھے۔ یعنی تھوڑے عرصے کے بعد ضد کرتی کہ ہم نے جانا ہے.....

بچپن میں، میں کوئی شرارتی بچی نہیں تھی گھر کے کاموں میں امی کا بہت ساتھ دیتی تھی۔ ان کا احساس کرنے والی تھی۔ بہت زیادہ پڑھا کو نہیں مگر نالائق بھی نہیں تھی۔ ہمیشہ اچھے گریڈ سے پاس ہوئی اور آٹھویں جماعت میں اسکا لرشپ بھی ملا۔ اس وقت آٹھویں جماعت کے امتحان بورڈ کے ہوتے تھے۔

آج کل کے بچوں کی طرح ہم اپنے بچپن میں بور نہیں ہوتے تھے۔ آج کل کے بچوں کے پاس دنیا جہاں کی سہولتیں ہونے کے باوجود وہ بور ہو جاتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنی امی کو یہ نہیں کہا تھا کہ ”امی ہم بور ہو رہے ہیں“ حالانکہ ہمارے وقت میں کیبل بھی نہیں تھا۔ ڈش اینٹینا بھی نہیں لگا ہوا تھا موبائل اور انٹرنیٹ بھی نہیں تھا۔ میں جب حد سے زیادہ بور ہوتی تھی تو ڈرائنگ کرنے بیٹھ جاتی تھی اور گھر میں جتنے بھی رسالے، اخبار جہاں اور اخبار آتے تھے ان میں خواتین کی تصاویر کا میک اپ بڑے شوق سے کرتے تھے یہ کام میرا اور میری بہن کا تھا۔ ہم اسی طرح تصاویر کا بیڑا غرق کر دیا کرتے تھے۔ یہ ہمارا بوریت اور فارغ وقت کا مشغلہ تھا خیر بچپن اچھا گزرا بلکہ بہت

محسوس کی، اپنے ساتھ کرتے سنتے دیکھا اور مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں تھی کہ یہ نفرت کیوں؟ بلا جواز نفرت کیوں؟ اور وہ بھی انتہائی قریبی رشتے دار، میں تو بچی تھی، میرا تو بڑوں سے مقابلہ نہیں تھا تو جب اس طرح کی بلا جواز نفرت سہنی پڑے تو وہ نفرت آپ کو بڑا کر دیتی ہے۔ مجھے بھی میرے اپنوں کے رویوں نے بڑا کر دیا تھا۔“

”والدین کی محبت کس بچے سے زیادہ تھی؟“
 ”ہم ماشاء اللہ چار بہن بھائی ہیں مگر ہمیں کبھی بھی محسوس نہیں ہوا کہ کسی ایک پر توجہ زیادہ ہے..... ہاں یہ ضرور ہے کہ جو ہمارا چھوٹا بھائی تھا وہ ہم سب کا لاڈلا رہا ہے اور لاڈلا ہے اور ہاں جو ہماری آپنی ہیں انہیں بڑا ہونے کے ناتے ایک پر نوکول ضرور ملا کیونکہ بڑے ہونے کے ناتے ان پر ذمہ داریاں زیادہ تھیں..... اور ہم سارے بہن بھائی ایک طرح سے ملے ایک جیسا پیار ملا..... ایک جیسی سہولیات ملیں البتہ ہم بہن بھائیوں میں لڑائیاں ہوتی تھیں.....“

میری بہن کے ساتھ میری بہت لڑائیاں ہوتی تھیں مگر پیار بھی بہت تھا۔ ہم جب لوڈ کھیلتے تھے تو جہاں آپنی کو لگتا کہ یہ توجہ رہی ہے وہ ساری گولیاں بکھیر دیتیں اور گیم ختم ہو جاتا۔ میرا چھوٹا بھائی جب ہارنے لگتا تو لوڈ وگا گتہ ہی پھاڑ دیتا تھا۔ تب امی کی ”تر لے منت“ کرتے کہ نئی لوڈ ونگوا دیں۔ ہم نے ”اناری“ بہت کھیلی، ویڈیو گیمز ٹی وی کے ساتھ کھیل کر کے گیمز کھیلتے تھے اور اس پر بھی لڑائیاں ہوتی تھیں، میری آپنی میرے پیال بہت پیچتی تھیں۔ کیونکہ میری زبان بہت چلتی تھی۔ زبان کی وجہ سے میں آپنی سے بہت مار کھاتی تھی۔ ہم سب نے ہی ایک دوسرے کو مارا بھی بہت مگر ایک دوسرے کی تکلیف کو برداشت بھی نہیں کر پاتے تھے۔ بہت اچھا وقت گزرا۔

یہاں میں اپنی امی کی ایک اور صفت کو ضرور بیان کروں گی کہ ہماری امی نے ہمیں خاندانی سیاست، چالاکیوں اور سازشوں سے دور رکھا۔ ہمیں

نہیں پتا ہوتا تھا کہ بڑوں میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا چل رہا ہے، کیا مسائل چل رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم اپنی لائف میں مست رہتے تھے۔ مگر ہمارے کزنز کو سب پتا ہوتا تھا اور ان کے رویے ہمارے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے تھے اور ہم یہ ضرور سوچتے تھے کہ ان کو کیا ہو جاتا ہے بھی اچھے ہو جاتے ہیں تو بھی برے۔

اب جبکہ ہم سب بڑے اور شادی شدہ، بچوں والے ہو گئے ہیں ہم نے اپنی امی کی پالیسی اپنائی ہے کہ کوئی خاندانی مسئلہ بچوں کے سامنے ڈسکس نہیں کرتے۔ آج بھی ہم بہن بھائی اسی طرح ایک دوسرے کے قریب ہیں جس طرح شادی سے پہلے تھے۔ لگتا ہے ہماری شادیاں ہی نہیں ہوئی ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ آج تک مالی معاملات، وراثتی معاملات میں، خاندانی معاملات اور سیاسی معاملات میں بھی جھگڑا نہیں ہوا۔ ہمارے درمیان آج بھی بچوں کی طرح لڑائیاں ہوتی ہیں بڑوں والی نہیں..... یہ سارا کمال اچھی تربیت کا ہے۔“

”لکھنے کا ادراک کب ہوا پہلی تحریر کیا تھی؟“
 ”میں شاید چھٹی یا ساتویں کلاس میں بھی تو گھر میں آئے ہوئے میگزین بہت شوق سے پڑھتی تھی اخبار جہاں میں بچوں کی کہانیاں پڑھنا، تعلیم و تربیت پڑھنا اور میچور رائٹرز کی چیزیں بھی ضرور پڑھتی تھی جیسے اخبار جہاں میں تین عورتیں تین کہانیاں بھی ضرور پڑھتی تھی تو ہمارے اطراف والوں کو یعنی رشتے داروں اور دیگر لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ عاصمہ کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے لکھنا چاہتی تھی مگر سمجھ نہیں تھی کہ کس طرح شروع کروں، کس طرح اینڈ کروں۔ میرے ایک کزن کو احساس تھا کہ اسے لکھنے کا شوق ہے۔ تو وہ ایک دن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اسلام آباد میں مقابلہ مضمون نویسی ہو رہا ہے اور ”تمباکو نوشی“ کے خلاف یعنی نقصانات کے بارے میں لکھنا ہے۔ میں بھی حصہ لے رہا ہوں تم بھی لو۔ وہ تو مجھ سے اچھا خاصا بڑا تھا جبکہ میں ساتویں جماعت کی طالبہ تھی.....“

اور میں اپنی تحریریں دیکھ کر خوشی سے چھلانگیں ماری تھی کہ یہ میں ہی ہوں.....؟

اس وقت مجھے پتا چلا کہ آپ کی جگہ آپ کی تحریریں بناتی ہیں۔ آپ کی تحریروں میں جان ہے تو وہ بھی کبھی ”رد“ نہیں ہوں گی۔ مجھے کتنی ہی لڑکیوں نے کہا کہ ہم تحریر بھیجتے ہیں مگر وہ رد ہو جاتی ہیں۔ تو میں ان کو یہی کہتی ہوں کہ اگر تحریر میں جان ہے تو وہ بھی بھی رد نہیں ہوگی۔ 2011ء میں شروع کیا گیا یہ سفر آج تک جاری ہے اس کے بعد میں نے کرن اور پاکیزہ میں بھی لکھا۔

”معاوضہ ملا تھا؟ گھر کا ماحول ادبی تھا کیا؟“

”جی پہلی تحریر سے ہی معاوضہ مل رہا ہے اور پہلے معاوضے پر تو میں بہت خوش ہوتی تھی۔“

نہیں گھر کا ماحول ادبی نہیں تھا ہاں..... امی کو پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کی اس وقت شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ تو جب میں نے ہوش سنبھالا تو اخبار جہاں کی تین عورتیں کہانیاں پڑھیں باقی کچھ نہیں پڑھتی تھی کہ امی کا خوف بہت تھا کیونکہ جس چیز کے لیے امی منع کرتی تھیں، ہم وہ کام بھی نہیں کرتے تھے پھر آہستہ آہستہ جب انگلی پکڑائی تو میں نے بازو ہی پکڑ لیا۔ پھر تھوڑا سا زیادہ پڑھنا شروع کیا تو ساجدہ حبیب کی تحریریں مجھے بہت پسند آئی تھیں اس وقت کی برائی رائٹرز کمال لکھتی تھیں۔ عمیرہ سید نے ایک مصور کی زندگی پر ایک ناول لکھا تھا وہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ امی کا اعتماد بحال ہوا تو ان کے سامنے پڑھنا شروع کیا اور بس پھر پڑھتے ہی گئے کبھی رائیٹر کا نام دیکھ کر نہیں پڑھا اس کا افسوس ہے البتہ بشریٰ رحمن کے ناول میں نے بہت شوق سے پڑھے۔“

”پہلی تحریر شائع ہونے کے بعد مزید لکھنے کی کال آئی یا بس آپ نے لکھ دیا ڈائجسٹ والوں نے شائع کر دیا؟“

”ہائے..... وہ تو بڑا حسین اور عجیب وقت تھا۔ تقریباً دوسری یا تیسری تحریر کے بعد اہتل نے مجھے کال کی..... اور میں حیران پریشان بس انہی کو سننے جا

اس زمانے میں ایک ڈرامہ سیریل چل رہا تھا ”انگاروادی“ اس میں ایک صاحب نے ڈاکٹر طلحہ کا رول کیا تھا وہ صاحب مجھے بہت اچھے لگتے تھے کیونکہ ان کی برستلی بہت اچھی تھی۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ اس مقابلہ مضمون نویسی کے وہ آرگنائزر ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے خوشی خوشی مضمون لکھ کر بھیج دیا۔ پندرہ بیس دن کے بعد مجھے حوصلہ افزائی کا ایک سٹوفکیٹ آ گیا۔ میں نے اپنے کزن کو فون کیا وہ بھاگے بھاگے آئے میرا سٹوفکیٹ دیکھا اور غصے سے لال چیلے ہوتے کندھے اچکاتے ہوئے چلے گئے۔

میں حیران کہ یہ کیا ہوا انہیں، میں نے دوبارہ سے نام پڑھا کہ میرا ہی تھا یا یہ کہ ان کا تھا..... مگر نام تو میرا ہی تھا۔ خیر کچھ عرصے کے بعد میں نے کزن سے رابطہ کیا کہ اب دوبارہ کب مضمون بھیجنا ہے تو انہوں نے مختلف کہانیاں سناتے ہوئے کہا کہ یہ تو ادارہ ہی بند ہو چکا ہے۔ میں نے اس کے بعد پھر کچھ نہیں لکھا البتہ شاعری کرتی تھی مگر اپنی ڈائری میں لکھتی تھی.....

اسکول لائف میں بھی اور کالج لائف میں بھی شاعری کرتی تھی۔ وقت گزرتا گیا، ماسٹرز ہو گیا انگریزی ادب میں اور میری شادی ہو گئی اور مجھے خود کو آشکار کرنے میں وقت لگا..... اور خود کو آشکارا اس طرح کیا کہ میرے تین سال کے بیٹے کی طبیعت ناساز تھی..... وہ سو نہیں رہا تھا..... اور جب تک اس نے نہیں سونا تھا مجھے بھی نیند نہیں آتی تھی، چنانچہ ٹائم پاس کرنے کے لیے میں نے ٹیبل پر پڑے کاغذ اور قلم کو اٹھایا اور بالکل بے دھیانی میں اپنی پہلی تحریر لکھی اور اس کا نام ”کئی جی جی“ رکھا پھر ایک اور تحریر لکھی ”ٹرائل“ کے عنوان سے..... اس کے بعد میں نے یہ تحریریں خواتین ڈائجسٹ میں بھیج دیں۔ تو خواتین ڈائجسٹ میں ”کئی جی جی“ لگی اور دوسری تحریر شعاع میں لگی..... اور اپنی تحریریں دیکھ کر میں حیران پریشان تھی کہ یہ کیسے ممکن ہو گیا کیونکہ سنتے یہی تھے کہ یہ ادارہ نئے رائٹرز کی تحریریں اتنی جلدی شائع نہیں کرتا (آپ باصلاحیت تھیں۔ ادارہ اچھی تحریر فوراً شائع کرتا ہے)

رہی تھی۔ میری زبان تو بالکل جیسے بند ہو گئی تھی۔ وہ ہر ایک کے لیے بہت خاص رویہ رکھتی ہیں یہ ان کی طبیعت کا خاصہ ہے اور مجھے بھی ایسا ہی لگا کہ میں ان کے لیے بہت خاص ہوں..... اور جب جب انہوں نے مجھ سے تحریر مانگی وہ میرے لیے بہت فخر کا لمحہ ہوتا ہے اور میری بھی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی امیدوں پر پوری اتروں۔“ (ام طیفور! آپ لکھیں، ہم منتظر ہیں آپ کی تحریر کے۔)

”پلاٹ کب ذہن میں آتا ہے؟“

”پلاٹ تو کبھی بھی کسی بھی وقت ذہن میں آ جاتا ہے۔ پیاز کاٹتے ہوئے، ہانڈی پکاتے ہوئے، ڈسٹنگ کرتے ہوئے، بچوں کو پڑھاتے ہوئے، بچوں کی کسی بات پر..... بات سے بات نکلتی جاتی ہے اور پلاٹ ذہن میں آ جاتا ہے۔ مگر پلاٹ کو صفحات پر محفوظ نہیں کر پانی البتہ ذہن میں ضرور محفوظ کر لیتی ہوں اور رات کو ہر کام سے فارغ ہو کر پھر اپنے کام کو سرانجام دیتی ہوں۔ مگر میں بہت زیادہ دیر بیٹھ کر لکھ نہیں پانی، زیادہ سے آدھا پون گھنٹہ تھی ہوں اور پھر چھوڑ دیتی ہوں.....

دن میں گھریلو امور اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ میں لکھ نہیں پانی اور یہ میرے لیے سب سے زیادہ ضروری ہیں۔ اس کے لیے میں کوتاہی تو مجھے برداشت ہی نہیں ہے..... صفائی ستھرائی کے معاملے میں بہت کریزی ہوں اور صفائی ستھرائی میں کرتی بھی خود ہی ہوں۔ پھر بچوں کو اسکول کا پڑھانا، شام کے وقت اپنے بچوں اور بھائیوں کی بچیوں کو قرآن پڑھانی ہوں..... تو وقت ہی نہیں ملتا بس رات میرے لیے بہترین ہوتی ہے۔“

”آپ کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ مزاح بہت اچھا لکھ لیتی ہیں؟“

”جی..... یہ بات مجھے اہل نے بھی کہی تھی۔ انہوں نے ہی مجھے کہا کہ تم لکھو کیونکہ مزاح بہت کم لوگ لکھتے ہیں تو ان کے کہنے پر میں نے مزاح بھی لکھا اور سنجیدہ بھی لکھا۔ مگر مزاح پر میرا فوکس زیادہ

ہو گیا کیونکہ میرا اپنا مزاج بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ میں جلی کٹی اور سڑے ہوئے مزاج کی بالکل بھی نہیں ہوں..... اور نہ ہی ہر وقت چٹکے چھوڑنے والوں میں شمار ہوتی ہوں۔ اور مزاج جب لکھنے بیٹھتی ہوں تو خود بخود لکھا جا رہا ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو مزاج میری تحریروں میں نظر آتا ہے وہ گفتگو میں بھی ہو۔ میرا اپنا دل تو سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھانے کا دل چاہتا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی کہ سب کچھ لکھ سکوں۔“ (ام طیفور! لکھیں)

”اپنی ہی تحریروں میں پسندیدہ تحریر جس کو لکھتے وقت یا لکھ کر پڑھنے کے بعد روٹا آیا ہو؟ مگر قارئین کو پسند نہیں آتی؟“

”مجھے اپنی تحریروں میں ایک افسانہ ”کٹھا“ بہت پسند ہے جسے لکھ کر میں بہت روٹی۔ یہ ایک ماں کی کہانی تھی۔ جس کی اولاد اسے چھوڑ کر چاچکی ہوئی ہے اور وہ اپنے شوہر کی تصویر کے ساتھ بائیں کرتے ہوئے اپنی تنہائی کا وقت گزارتی ہے..... ایک تحریر جسے لکھتے وقت میں بہت روٹی۔ ”من عاجز من بے کم“ ہے یہ ناول مجھے خود پسند ہے مگر میرے قارئین کو میرا یہ ناول اس طرح سے پسند نہیں آیا جس طرح سے مجھے پسند آیا یا جس کے بارے میں، میں سوچ رہی تھی کہ بہت ہٹ جائے گا۔ اس کو بھی لکھتے وقت کئی مقامات پر میں بہت روٹی اس کے علاوہ ”تم سے تم تک“ بھی مجھے بہت پسند ہے یہ دو دوستوں کی بے لوث محبت کی کہانی تھی اور اس میں ”موت“ کے سین لکھتے وقت میں بے تحاشا روٹی پہلے قلم اور کاغذ ایک طرف رکھ کر روٹی اور پھر جب تھوڑا اقرار آیا تو میں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔

اب یہ تو قارئین کے مزاج پر ہے کہ انہیں کیا اچھا لگتا ہے۔ کبھی عام سی تحریر انہیں بہت پسند آ جاتی ہیں اور کبھی خاص جو میری نظروں میں ہوتی ہے انہیں پسند نہیں آتی..... اور عام سی کہانی لگتی ہے اور یہ ہر رائٹر کے ساتھ ہوتا ہوگا کیونکہ ہر رائٹر اپنی تحریر میں اپنا سو فیصد دیتا ہے اور ہر تحریر کو وہ اسی طرح لکھتا ہے جیسے

ہیں جو میں اپنے بچوں کی ساتھ بیٹھ کر دیکھتی ہوں اور مجھے بہت مزہ آتا ہے.....

لکھنے والے لکھ رہے ہیں اور بہت اچھا لکھ رہے..... جیسے سائرہ رضا ہیں میں نے اگرچہ ان کا کوئی ڈرامہ نہیں دیکھا مگر ان کو پڑھا ضرور ہے اور میری تو پسندیدہ ترین رائیٹر ہیں۔ اسی طرح فائزہ افتخار کے ڈرامے اچھے ہوتے ہیں۔ صائمہ اکرام چوہدری کے سیریل ”چیکے چیکے“ کی کچھ اقساط میں نے دیکھی بھی تھیں۔ صاف ستھرا ڈرامہ تھا اور بہت مزہ آیا تھا دیکھ کر.....“

”آپ کی تحریریں آپ کے گھر میں کون کون شوق سے پڑھتا ہے؟“

”میری تحریریں سوائے میرے میاں صاحب کے سب ہی شوق سے پڑھتے ہیں اور میں اپنے میاں صاحب کو اپنا پلاٹ ضرور بتاتی ہوں۔ یہ مجھ پر واجب ہے کہ میں نے ان سے ڈسکس کرنا ہے چاہے وہ سن رہے ہو یا نہ سن رہے ہوں..... جب ڈائجسٹ آتے ہیں تو وہی لیتے ہیں۔ یہ خود ہی کھولتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں کہ اب بھی بولو، کس میں تمہاری تحریر آئی ہے تو میں بتاتی ہوں تو اس کو کھول کر سارے اوراق پر (میری تحریر کے) نظر ڈالتے ہیں اور پھر مجھے پکڑا دیتے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے، ان کا یہ انداز مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے بعد اگلے مہینے تحریر پر خطوط کے ذریعے جو تبصرے ہوتے ہیں وہ بھی سب سے پہلے انہیں ہی پڑھنے ہوتے ہیں۔ اور ویسے گھر میں بہن، بھابھی، میکے والے اور میری بھانجی میری تحریریں بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ سسرال میرا ہے نہیں، میری ساس کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے تایا ابو جو کہ میرے سسر بھی تھے ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے میری نند دیور بھی نہیں ہیں۔ میرے میاں صاحب اکلوتے ہیں تو کوئی ہے نہیں، البتہ میری ممانی ساس ضرور پڑھتی ہیں۔ میری بھانجی کو بھی شوق ہے لکھنے کا اور یہ شوق بھی اسے میری تحریریں پڑھ کر ہوا ہے اور میرے بچوں میں تو فی

وہ اس کی پہلی تحریر ہو۔ وہ جو پہلی تحریر کا شوق اور چاہ ہے وہ ہر تحریر کی دفعہ ہوتا ہے۔“

”میں نے اکثر پڑھا ہے کہ ہانڈی پکاتے ہوئے ہیروین کا دل بھی جل رہا ہوتا ہے۔ دوپٹہ بھی جل رہا ہوتا ہے ہاتھ بھی جلتے ہیں اور ہانڈی تو جل ہی جاتی ہے۔ اس سے رائٹر کب باہر آئیں گی؟“

”ہنستے ہوئے یہ آپ نے خوب بات کی۔ واقعی ایسا ہے میرے اپنے افسانوں اور ناولز کی ہیروئن بہت پیاری ہوتی ہیں کوئی ایک آدھ ہی ہوگی جو پیاری نہ ہوگی۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے جو پڑھنے والے ہیں ان کو ہلکا پھلکا اور بھاری موضوعات سے ہٹ کر ایسی تحریر جو ان کے دل و دماغ پر گراں نہ گزرے پسند ہے کیونکہ بقول احتل جی کے کہ لوگوں کے پاس خوشیاں محدود ہیں اور دکھ، غم اور پریشانیاں زیادہ ہیں۔ ویسے میری تحریروں میں دل کافی جلے ہیں مگر دوپٹہ بھی نہیں جلا ہے۔“

س: ”آج کل کے ڈراموں کے متعلق کیا کہیں گی؟“

”سن کر حیرت ہوگی کہ الحمد للہ میرے گھر میں تو نہ ٹی وی ہے، نہ کیبل ہے، نہ ڈش انٹینا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے بچے اس چیز سے بچے ہوئے ہیں۔ میرا بڑا بیٹا جب پانچ سال کا تھا تو میں نے اپنے گھر سے کیبل ہٹا دیا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک نہ کیبل ہے نہ ڈش انٹینا اور نہ ہی ٹی وی ہے، میرے بچوں نے اس چیز کا کبھی شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی انہیں اس چیز کی طلب ہوتی ہے۔“

میرے بیٹے کے اب 9th کے ایگزام ہیں مگر اس کے پاس موبائل نہیں ہے۔ میرا بڑا بیٹا ماشاء اللہ پندرہ سال کا ہے مگر اس نے کبھی موبائل کی فرمائش نہیں کی..... بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ میرے دوستوں کے پاس موبائل ہیں ان کے ماما پاپا نے اتنی چھوٹی عمر میں انہیں موبائل کیوں دیئے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے ڈراموں کی ”لغویات“ دیکھ کر متاثر ہوں۔ میرے پاس تو کارٹونز کی بے شمار ”سی ڈیز“

میری تفریح ہے اسی کے لیے گھر سے نکلتی ہوں اور زیادہ تر شاپنگ آن لائن کرتی ہوں، بازار جانا مجھے پسند ہی نہیں ہے۔ میری زیادہ سے زیادہ دوڑ ”سیلاٹ ٹاؤن مارکیٹ تک یا فضل سینٹر“ یہاں بھی سال میں ایک یا دو بار جاتی ہوں..... بچے زیادہ تر مجھ پر ہی گئے ہیں، اگر انہیں کہیں جانا ہو تو اسے ماموں کی ساتھ چلے جاتے ہیں۔ میاں صاحب کو چھٹی گھر میں اور اپنے کام میں مصروف رہنا اچھا لگتا ہے۔“

”تو پھر سارا دن گھر میں وقت کیسے گزرتا ہے؟“ گھر میں پڑھائی لکھائی کرتی ہوں۔ سلائی کا شوق ہے تو سلائی کر لیتی ہوں۔ ایل کے سے کرو شاپنگ کی کوشش کر رہی ہوں۔ فیس بک پر بھی کبھار نظر مار لیتی ہوں..... اور وائس اپ پر، وائس میسج پر جواب دے دیتی ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے ام طیفور سے اجازت چاہی اس شکرے کے ساتھ کہ ام طیفور اور ان کا سارا گھر کو رونا کا شکار ہوا تھا..... اور اس بیماری میں بھی انہوں نے ہمارے سوالوں کے جواب دیئے۔ اس کے لیے ہم ان کے انتہائی ممنون ہیں۔ ☆

الحال کسی میں رجحان نظر نہیں آتا، لکھنے کی صلاحیت بھی خداداد ہی ہوتی ہے اسے موروثی نہیں کہہ سکتے۔“

”اپنے مزاج کے بارے میں بتائیے کیسی ہیں؟“ مزاج میرا نارمل ہے، نہ بہت گرم نہ بہت نرم نہ بہت سخت۔ غصہ آتا ہے اور بچوں پر آتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب وہ گھر میں پھیلاوا کرتے ہیں..... گندگی کرتے ہیں..... یا میرے شیڈول میں کوئی فرق آئے اس کی ترتیب بگڑ جائے، تب بھی غصہ آتا ہے اور میں جڑ جڑی ہو جاتی ہوں۔ میں نے کاموں کا ایک شیڈول رکھا ہوا ہے۔ یہ کام اس وقت ہونا ہے تو ہو جانا چاہیے۔ بچوں نے اس وقت پڑھنا ہے تو پڑھنا ہی ہے یعنی اس وقت سے لے کر یہ کام اور اس وقت سے لے کر یہ کام ہونا ہی ہوتا ہے۔ صفائی کے معاملے مجھے بہت غصہ آتا ہے ورنہ نہیں آتا۔ میرا حلقہ احباب وسیع نہیں ہے کیونکہ میں ملنے ملانے کی شوقین نہیں ہوں۔ مجھے زیادہ تر گھر میں رہنا پسند ہے۔ ہوٹلنگ بالکل بھی نہیں کرتی۔ یارکوں میں بھی نہیں جاتی..... تفریح کے لیے کہیں نہیں جاتی، مہینے میں ایک بار گروسری کے لیے جاتی ہوں۔ وہی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



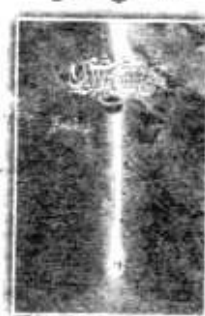
تزیلہ ریاض
قیمت - 350 روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جبین
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



گلہبت عبداللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

منعوانے
کا پتہ



نائد خالون



خط بھجوانے کے لیے ہوتا۔

خواتین ڈائجسٹ - 37 - اردو بازار کراچی۔

Email: Info@khawateendigest.com

شمینہ اکرم بہار کالونی..... لیاری کراچی

سب سے پہلے میں بات کروں گی اگست میں فرزانہ کھل کے ناول ”وہ میرے کیسری پھول“ کی، فرزانہ کھل کی ہر تحریر قاری سے توجہ اور فرصت کی متقاضی ہوتی ہے۔ میں نے سب سے پہلے ناول ”وہ میرے کیسری پھول“ ہی پڑھا اور اس کے بعد کچھ اور پڑھا ہی نہیں گیا؟ اس ناول کو پڑھنے کے بعد کیسری کے پھول کو دیکھنے کی خواہش شدت سے من کے اندر جاگی (میں نے کبھی یہ پھول دیکھے ہی نہیں؟ کس کلر کا ہوتا ہے؟) ورثہ اور قسم بہت یونیک نام اور کہانی بہت ہی جاندار۔ بہت عرصے بعد کوئی کہانی سیدھی دل میں ٹھاہ کر کے لگی۔ ”خوش رہیں فرزانہ کھل“ (پچھلے مہینہ سے یہ تبصرہ لکھا رکھا ہے مگر پوسٹ نہ کر سکی۔ ہائے رے میری سستی.....؟) اب آتے ہیں تبصرے کے خواتین ڈائجسٹ کی طرف،

تبصرے سے پہلے یہ بتا دوں کہ تبصرے میری گڑبا غنوی اور بیٹے طرکی سا لکھ کا مہینہ ہے۔ اللہ میرے بچوں کو خوش و آبدار رکھے (آمین)۔ ٹائٹل پر دلہن دیکھ کر یاد آیا کہ لاک ڈاؤن میں لوگوں نے خوب شادیاں منپائیں۔ کم خرچ بالائین۔ سادگی اختیار کرنے میں ہی بھلائی ہے۔ ”رنگ ریز میرے“ کافی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے، یہ کہانی مگر عفت سحر صاحبہ کہانی کی اسپنڈ کو فاسٹ کیجیے۔

سیدہ عمر کی کہانی ”پرداز سے پہلے“ بہت اہم اور حساس موضوع پر لکھی گئی ایک تحریر ہے۔ کیوان کے کردار نے ثابت کر دیا کہ ہر مرد ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا جو اینڈ میں دونوں ایک ہو جاتے۔ ”نفسیاتی اور ازدواجی الجھنیں“ عدنان بھائی کے مخلصانہ مشورے بہت مفید اور قابل قدر ہیں۔

بہن (ن۔س۔) سعیدہ آباد نے آپ سے پوچھا ہے کہ نیند میں دم گھٹنا اور سانس بند ہونے کی بیماری ہے انہیں۔ اور اس بیماری کو کیا کہتے ہیں؟ بہن (ن۔س) اس بیماری کا نام ”سلیپ آپنیا“ ہے۔ اور اس بیماری میں سوتے میں انسان کا سانس بند ہو جاتا ہے، نیند میں اس کا دم گھٹتا ہے۔ میرے صاحب اکرم کو بھی یہ تکلیف رہی، کافی سالوں تک اور میں ہمیشہ ہی بہت چوکنا ہو کر سوتی

ہوں۔ آپ صبح نہار منہ چوتھائی فیمل اسپون کلونجی کھائیں۔ آہستہ آہستہ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ دنیا میں موت کے سوا ہر مرض کا علاج موجود ہے۔ آپ مایوس مت ہوں۔ اللہ اپنا کرم کرے گا۔ (آمین) راحت جہیں کی ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ اس کہانی کو پڑھ کر دل بہت دکھتا ہے۔ غربت تو خود سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ افسانہ ”ہاں اور ناں“ صائمہ نور کا فی دلچسپ لگا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ ایسی ہلکی پھلکی کہانیاں انسان کی ٹینشن کو بھگا دیتی ہیں۔ مکمل ناول ”روپ بہروپ“ نعیمہ ناز سلطان کا اچھا لگا، پسند آیا۔ اس میں ایک پیغام چھپا ہے ان لوگوں کے لیے جو صبر برداشت کرنا نہیں جانتے۔ ”سفر تمام ہوا“ احمل الصبور کا رخ چودھری کو خراج تحسین کا منفرد انداز..... پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ تو بے شمار خوبیوں کی مالک تھیں۔ جن کی کمی احمل صرف آپ کو نہیں، ہم قارئین بھی تاحیات محسوس

ہے آپ یقین کریں ایک ہفتے میں دونوں ڈائجسٹ مکمل پڑھ لیتی ہوں اور ہمیشہ ہر تحریر ہی خاص لگتی ہے بس میں آپ کو چند تجاویز دینا چاہتی تھی اگر ممکن ہو تو پوری کرنے کی کوشش کریں۔ شکر گزار ہوں گی۔

(1) ایک کہانی تاریخی بھی لگایا کریں، کوئی ایک واقعہ جو کسی بھی دور کا ہو، اس کے متعلق کہانی بتا کر بیان کریں جیسے صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی اور ایاز، مغل بادشاہ، پیغمبروں کے متعلق، 14 اگست کے موقع پر ہجرت کے وقت کے واقعات وغیرہ۔

آپ نے نوٹ کیا ہوگا جب بھی ماضی کے متعلق کوئی تحریر شائع ہوتی ہے، اکثریت اسے پسند بھی کرتی ہے۔

(2) خواتین کی بیماریوں سے متعلق کسی مستند ڈاکٹر یا حکیمہ کا علاج۔

(3) اور اداکاراؤں کے علاوہ دوسری مشہور شخصیات کا انٹرویو بھی لگایا کریں، آپ کا بہت بہت شکریہ۔

ج: پیاری خالده! خواتین کی محفل میں تشریف آوری کا شکریہ۔ تیس سالہ رفاقت میں آپ نے پہلی بار خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی تجاویز بہت اچھی ہیں، انٹرویو کے سلسلے میں تو ہم مصنفین اور دیگر شعبوں کی شخصیات کے انٹرویو دیتے رہتے ہیں، تاریخی پس منظر میں اگر کسی مصنفہ نے لکھا تو ہم ضرور شائع کریں گے۔ حکیم یا ڈاکٹر کے مشوروں کے بارے میں بھی آپ کی تجویز پر غور کریں گے۔

زرینہ خانم لغاری..... مظفر گڑھ
”کرن کرن روشنی“ کو نہ پڑھنا بد قسمتی ہے، دین کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ”رنگ ریز میرے“ یہ کیا عباد مرچکا ہے۔ حریم کے ساتھ زیاد و سیم کی شادی ہوئی ہے۔ یتیمی کا لنگ سن کراتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے، یعنی یتیمی مل گئی۔ ہمیں یتیمی کے دکھوں پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ فرزانہ کھرل کا ناول سر کے اوپر سے گزر گیا۔ نرمین کے دکھ دور ہو جائیں گے، نرمین نے ہمت پکڑی ہے۔
ج: پیاری زرینہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ

کریں گے۔ دوسرا مکمل ناول ”مرک“ صدف ریحان گیلانی کا تحریر کردہ ناول ہے۔ وہی روایتی اور پرانی خاندانی رنجشوں کی کہانی، جس میں دولت و جائیداد میں دھوکہ دہی اور نا انصافی کا قصہ پڑھ کر ہمیں ازبر ہو گیا ہے۔ بعد میں احساس جرم اور ندامت۔ اینڈ میں سب اچھے معاملات سلجھ جاتے ہیں اور سب پپی پپی..... مرک کا بے جا غصہ، تننا، اور ایکٹنگ ہی لگا، ایک ذرا سی غلط فہمی میں ہی آدھا ناول ختم ہو گیا۔ کیا جاتا جو مرک ایک دفعہ سجادول سے کلیئر کر لیتی کہ شادی کی ہے یا نہیں؟
افسانہ ”من میلا“ حنا بشری روایتی خاندانی چپقلش مگر شگفتہ بی بی آپ اگر اپنے شوہر سے ایک فون کال کر کے رقم کی بابت پوچھ لیتیں۔ بعد کی شرمندگی سے کیا حاصل۔

سچ تو یہ ہے کہ سب ناول میں ”پرواز سے پہلے“ اول نمبر پر رہا۔ ماریہ کامران کی کہانی (پرچھائی) بس ٹھیک تھی۔ ہماری ذرہ برابر کی گئی نیکی ہو یا برائی۔ لوٹ کر ہم تک ضرور آتی ہے۔ سلسلہ ”ہمارے نام“ بہت موسٹ فیورٹ سلسلہ بنتا جا رہا ہے۔ بہت ساری قارئین کا نام اب رائٹر کی فہرست میں آنے لگا ہے۔ (ماشاء اللہ) ڈاکٹر فریال کا خط مزادے گیا۔ اس پر سونے پر سہاگا آپ کا جواب کیا کہنے؟

”کرن کرن روشنی“ بہت توجہ اور دھیان سے پڑھا ”عشاء کے بعد بات چیت کی کراہت“ بہت الجھن تھی ذہن میں جو آج سلجھ گئی۔ ہمارے کراچی میں تو سارے کام ہوتے ہی عشاء کے بعد ہیں۔

ج: پیاری ثمنینہ! آپ کا تفصیلی تبصرہ پڑھ کر اطمینان ہوا کہ اب آپ کی طبیعت بہتر ہے۔ کافی عرصہ بعد آپ نے پرانے رنگ میں تبصرہ کیا۔ بہت خوشی ہوئی غنوی اور طہ کو ہماری طرف سے دلی مبارک باد اور دعائیں۔

سنیچہ عمیر کی کہانی میں اگر دونوں ایک ہو جاتے تو یہ ایک روایتی کہانی ہو جاتی۔

خالده ندیم..... راہوالی کینٹ
عرصہ تیس سال سے خواتین اور شعاع کی قاری ہوں، باقاعدگی سے دونوں ڈائجسٹ خریدتی ہوں اور آج بھی بچپن والی خوشی محسوس ہوتی ہے جب بھی ڈائجسٹ ملتا

خواتین ڈائجسٹ ملا اور خالدہ جیلانی کے بارے میں علم ہوا۔ افسوس ہوا دکھ بھی۔

زمانے گزر جاتے ہیں ساتھ کے، مگر وہ اک لمحہ ہمیشہ یاد رہتا ہے جب آپ کا ساتھی آپ سے پچھڑتا ہے۔ یہ تکلیف آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ملی جس کا سد باب صرف اللہ ہی کر سکتا ہے اور ان شاء اللہ وہ کرے گا بھی۔

بہت چھوٹی تھی، میں جب معلوم ہوا کہ بھائی کے دوست کا انتقال ہو گیا ہے۔ بھائی بھی وہ جو ہر دل عزیز۔ تب انہوں نے اپنے دوست کے لیے ایک شعر لکھا تھا اپنی نوٹ بک پر.....

پچھڑ کے مجھ سے میرے فاروق اداس ہونا تو لوٹ آنا زندگی کی اداس راہیں نہ کاٹ سکتا تو لوٹ آنا پرانے دیس میں تمہیں میرے سوا اور کون منا سکے گا مگر کسی سے یونہی مذاق، جھگڑے میں روٹھ جانا تو لوٹ آنا مگر یوں لکھ دینے سے کون آتا ہے ان کے دوست بھی نہیں آئے لیکن پھر جی نہ عجب نہ حیرت کہ وہ ان کے ساتھ رہتے ہیں۔

خالدہ جیلانی بھی رہیں گی ہمیشہ۔ کتابوں سے محبت رکھنے والوں کا یہی تو مسئلہ ہے وہ کچھ بھی نہیں بھولتے، بھول ہی نہیں سکے۔

اللہ خالدہ جیلانی کی مغفرت فرمائے اور اپنی جوار رحمت میں جگہ دے انہیں۔ (آمین)

عذر را پروین..... ٹنڈو جام جو آپ نے اپریل ساگرہ نمبر میں میرا تین لائن کا خط شائع کیا تھا وہ میرا پہلا خط تھا۔ مجھے بالکل بھی دکھ نہیں کہ آپ نے میرے تین صفحات کا خط تین لائن میں کیوں چھاپا، بلکہ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے پاس خط پہنچا تو ہمارے شہر کا نام تو میپ (نقشہ) میں بھی نہیں آتا۔ ایک بار پھر سے شکریہ۔

سب سے پہلے پچھلے شمارے پر تبصرہ جو رہا فرزانہ کھل کے ”وہ میرے کیسری پھول“ کے نام۔ ناول اس قدر جان دار تھا کہ لفظ لفظ ماضی، حال، مستقبل گنگنا رہا تھا۔ رائٹر نے کس ادا سے ماضی اور حال مستقبل کو دادی کے ریشم میں پرویا تھا رائٹر نے۔ قسام مالک نے ہر حال

دل سے ممنون ہیں۔ فرزانہ کھل کی تحریریں قدرے مشکل ضرور ہوتی ہیں لیکن دلچسپ بھی ہوتی ہیں اگر شروع کے دس صفحات پڑھ لیے جائیں تو پھر کہانی پھلنے لگتی ہے اور کہانی پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ آپ ایک بار پھر پڑھیں تب آپ اس کہانی سے لطف اندوز ہو سکیں گی۔

حمیرا گل..... ملتان سب سے پہلے تو یہ بتانا چاہوں گی کہ میں ماسٹرز کے کمپوزٹ ایگزام دے رہی ہوں جو شاید ایک ڈیڑھ ماہ میں شروع ہو جائیں گے۔ اس بار ہاتھ سے خط لکھنے کے بجائے بھائی سے کمپوز کروا کر بھیج رہی ہوں۔ تھوڑا میری صحت کا بھی پرالہم ہے کہ زیادہ دیر بین نہیں پکڑا جاتا۔ اب آتے ہیں دوسری بات کی طرف جس نے میری نیند چمین سب چرایا ہوا ہے۔ پیاری آبی میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس روز ڈھیروں کہانیاں بھیجی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ سے ایک درخواست کر رہی ہوں، پلیز میرا ہاتھ تھام لیں پلیز، میں بہت اکیلی، بہت دکھی اور بہت پریشان ہوں اور میری زندگی میں سوائے کہانیاں لکھنے کے اور کوئی خوشی نہیں ہے کوئی مقصد نہیں ہے (کیونکہ صحت کی خرابی کی وجہ سے میں کسی اور میدان میں اپنی صلاحیتیں نہیں آزما سکتی) اور رائٹر بننا میرا خواب بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے اللہ نے مجھے لکھنے کے لیے ہی بنایا ہے۔ ایسا ہو جائے تو زندگی ضائع ہو جانے کا جو ایک تکلیف دہ احساس ہے، وہ ختم نہیں تو بہت کم ضرور ہو جائے گا۔

ج: پیاری حمیرا! اللہ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔

ہم نے آپ کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ آپ کو لکھنا آتا ہے اگر آپ کہانی پہ توجہ دیں تو بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ دراصل آپ کی کہانی بہت سپاٹ ہوتی ہے، اس میں کوئی موڑ نہیں ہوتا۔ اطمینان رکھیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ نے محنت کی تو ضرور کامیاب ہوں گی ان شاء اللہ۔ فی الحال آپ کوئی مختصر افسانہ لکھ کر بھیجیں پھر ناول لکھیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی سے نوازے، آمین۔

راؤ سمیرا یاز..... کراچی

میں نہ صرف محبت کی بلکہ بھائی بھی شکریہ فرزانہ جی۔ راحت جیسے کے ناول میں مایوسی بہت نظر آ رہی ہے (کوئی امید بر نہیں آتی، کوئی صورت نظر نہیں آتی) اور عفت سحر طاہر کا ناول یک دم سے ایکشن میں آ گیا ہے۔ قسط مزے دار تھی۔ سدیہ عمیر کا ناول (پرداز سے پہلے) بہت حساس موضوع پر تھا۔ بالکل سچ لکھا پورے ناول میں۔ شمر کو اس کے گھر والوں نے اس گڑھے میں ڈالا،

صدف ریحان گیلانی کو اتنے عرصے بعد دیکھ کر اچھا لگا۔ ”مرک“ ناول بہت ہی اچھا تھا۔ افسانوں میں ”پرچھائی“ ماریہ کامران کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ ”دورخ کہانی“ ماہم کا افسانہ بھی دل کو بھایا اور ہمارے نام میں ڈاکٹر فریال کی واپسی اچھی لگی، گڑیا راجپوت اور ناہید اسماعیل کے خط بھی اچھے لگے۔ صدف ناز نے تو ماڈل کے متعلق بال کی کھال ہی نکال لی۔ اب بات ہو جائے کچھ برائی رائے کی، جو ہمیں اور ہمارے خواتین ڈائجسٹ کو بھول چکی ہیں۔ ثمنہ عظمیت علی ہیں، بہت یاد آتی ہیں۔ اسمیل رضا وہ بھی غائب ہیں منظر سے، ان سے بھی پوچھیں۔ کیا آپ کو ہماری یاد نہیں آتی اور اب ام طیفور اس درودی دوا کرے کوئی (ضمیمہ کا وزن کم کروا کر آپ تو گھر ہی کی ہو گئی ہیں۔ اس ماہ ”سوال یہ ہے“ غائب تھا۔ اب میں آتی ہوں، اپنے اہم مسئلے پر جو کہ صرف آپ ہی حل کر سکتی ہیں۔ خط کے ساتھ اپنی چھوٹی بہن کا ناول بھی بھیجا ہے۔ فروری میں پہلا خط بھیجا تھا تو ساتھ میں افسانہ بھی تھا۔ آپ پلیزیہ ناول پڑھ کر ضرور بتائیے گا کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں، ہمارے ابو اور بھائی والے بالکل بھی روک ٹوک نہیں کرتے بلکہ بھائی خود پوسٹ آفس خط لے جاتے ہیں۔ لیکن اس بار بھائی نے دھمکی دی ہے کہ اگر اس بار یہ ناول نہ چھپا تو اگلی بار تب تک نہیں بھیجنا جب تک ٹائپنگ نہ سکھ لو۔

ج: پیاری عذرا! آپ نے اپنی بہن کا نام تو لکھا ہی نہیں، کم از کم کہانی کا نام ہی لکھ دیتیں تاکہ ہم متعلقہ شعبے سے کہانی کے متعلق دریافت کر سکتے۔ کہانی ای میل کے ذریعے بھی بھیج سکتی ہیں اور ڈاک سے بھیجنا بھی درست ہے۔ جس میں آپ کو آسانی ہو، آپ وہ طریقہ اختیار کریں۔

ثمنہ عظمیت اور اسمیل رضا تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ اگر انہیں اپنے قارئین کی محبتوں کا احساس ہوگا تو خواتین میں ان کی تحریریں شامل ہوں گی۔

خواتین آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ فرزانہ کھرل کی ایک اور تحریر اس ماہ شامل ہے۔

فرحانہ مہناز..... اسلام آباد

نوے کی دہائی میں جائیں تو رخ چودھری کے ناول ہی یاد آتے ہیں۔ خوب صورت انداز بیان، دلچسپ جملے اپنے سحر میں جکڑے ہوئے۔ رخ چودھری اور شمرہ بخاری کی مزاح سے بھرپور تحریریں ان دنوں ہم شدت سے انتظار میں رہتے۔ دلوں کے قریب یہ لوگ جن سے ہمارا تحریری رشتہ ہے۔ چپکے سے چلے جاتے ہیں۔ دل اداس ہو جاتا ہے۔ خالدہ جیلانی اور اب رخ چودھری، احتل جی! آپ کی دوستوں کا اچانک جانا ہمیں بھی دکھی کر گیا۔ اللہ تعالیٰ رخ چودھری کو جنت میں اعلیٰ مقام دے۔ آمین ”رنگ ریز میرے“ عفت سحر آپ سے کہتا ہے کہ زیادہ کو حرم کا ہی رہنے دیں۔ کیونکہ کہانی جس انداز سے شروع کی تھی، اس کا خوش گوار اینڈ یہی ہونا چاہیے۔ ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ کہانی شروعات میں رخ اور سنجیدہ موضوع لے کر آئی، اس بار راحت جیسے نے اپنے انداز سے ہٹ کر لکھا۔ احمد فراز کی غزل رخ چودھری کی یاد کا پرتو تھی۔ ماضی کی اداکارہ غزالہ کیفی واقعی میں ڈیسنٹ پرسنالٹی ہیں۔ حمیرا بانو کے سیدھے اور سچے جواب پسند آئے۔ مثل یا قوت جب کوئی قاری بہن دیار غیر سے خط لکھتی ہیں تو بہت خوش ہوتی ہے۔ ”تیلیوں کے پر“ اچھا موضوع تھا لڑکیوں کے لیے لیکن والد صاحب تو پڑھتے ہی نہیں جبکہ یہ کہانی ایک باپ کے لیے مشعل راہ تھی۔ ڈائجسٹ بہت ہی دیر سے ملتے ہیں۔

ج: فرحانہ جی! آپ کا نام مل سا تبصرہ بھی ہمیں بہت اچھا لگا۔ بہت شکریہ۔

سمارا انعم بھٹی..... ڈی جی خان

نازیہ رزاق کا انٹرویو پڑھا بہت پسند آیا۔ ارے یہ تو فیصل آباد کی ہیں۔ نازیہ میں آپ کی تحریروں کی فین تھی اب آپ کی بھی ہو گئی ہوں، اب آتے ہیں اس ماہ کے

تینوں کو جی بھر کے داد دیتے ہیں۔ یہی الفاظ شامکہ والعباد کے ”تیلیوں کے پر“ کے لیے بھی پر چھائی (ماریہ کامران) من میلا (حنا بشری) ہاں یا ناں (صائمہ نور) اور وورخ کہانی (ماہم اوزلین) کبھی کے لیے زوردار تالیاں! صباء شفیق کا باورچی خانہ بہت صاف ستھرا ہے۔ ”ہمارے نام“ میں شکر ہے ڈاکٹر فریال لوٹ آئیں۔ ہادیہ عابد چیمہ، مونا ندیم، عمارہ میر خان کشمیری، راحیلہ ہارون، سیدہ صائمہ کاظمی، ناز (ٹمن) عنبر اور مریم حسین کو محفل میں خوش آمدید۔

صدف، مقدس اور طوبی! تبصرہ تو آپ ہمیشہ ہی بہت اچھا کرتی ہیں جس لیٹر کو آپ نے فرصت میں بیٹھ کر بہت ترتیب سے لکھا تھا۔ وہ یقیناً بہت خاص اور دلچسپ ہوگا۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ورنہ ہم ضرور شائع کرتے۔ ممکن ہے ڈاک میں کوئی گر بڑھوئی ہو یا تاخیر سے ملا ہو۔ خواتین کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔

فائزہ بھٹی..... چوکی

ستمبر کا خواتین ابو سے منگوا یا، میں آج کل ادھر امی کی طرف ہوں، 15 ستمبر کو واپسی ہے۔ سرال میں سبطین ادھر ہوں تو وہ لا کر دیتے ہیں۔ یا پھر بڑے جینٹ سے منگواتی ہوں۔

سسرال میں میرے پڑھنے لکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ سبطین تو بار بار فون پر پوچھتے ہیں، تمہاری کتاب آئی کہ نہیں۔ کچھ لکھا کہ نہیں۔ یا لکھا کرو مجھے اچھا لگتا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ شہر میرے سسرال سے بہت دور ہے۔ قریبی قصبے سے ضروری اشیاء کی خریداری کر لی جاتی ہے۔ مگر اس قصبے سے ڈائجسٹ نہیں ملتے اور نہ ہی باقاعدہ ڈاک خانہ ہے کہ میں خط پوسٹ کر سکوں۔ اس لیے خط لکھنے کی خواہش دھری رہ جاتی ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میں رسالہ تو منگوا لیتی ہوں مگر رسالہ سسرال میں مجھے دیکھتا رہ جاتا ہے۔

کرلاتا رہتا ہے کہ کچھ نظر کرم ادھر بھی..... مگر ان شاء اللہ آہستہ آہستہ ہر کام سیٹ ہو جائے گا۔ ابھی ابتدا ہے نا اس لیے۔ ویسے الحمد للہ کافی اچھا سسرال ہے میرا۔

شمارے کی طرف۔ ستمبر کا شمارہ دلہن کے سرورق سے سجایا بہت اچھا لگا۔ کہنی سخی! میں تفکر آمیز گفتگو پڑھی۔ ساتھ بری خبر کہ محترمہ رخ چوہدری راہی عدم ہوئیں آہ، میں نے ان کی تحریریں پڑھی ہیں۔ وہ مقبول رائٹر تھیں اللہ ان کے درجات بلند فرمائے آمین اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

ہمارے نام میں ناہید اسماعیل اور زینب نور کی شرکت اچھی لگی ساتھ شکر کہ ڈاکٹر فریال جلوہ افروز ہیں۔ انٹرویو، اس مرتبہ دونوں اچھے نہیں لگے۔ شاہین سے بہت معذرت، مستقل سلسلوں میں، کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، بہترین ہیں اللہ آپ کو اجر دے، کافی مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ آپ کا باورچی خانہ، صبا نے اچھا لکھا، خبریں و بریں، کرکٹر راشد خان کی تصویر بھی خبر نہیں میں ان کے بارے میں خبر ڈھونڈتی رہی، کہانیوں کی بات کریں تو فیورٹ نعیمہ ناز کا مکمل ناول، روپ بہروپ بہترین لگا۔ سلسلے وار ناول میں راحت جہیں بڑی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہیں دوسرا ناول، رنگ زیر میرے، آنٹی آپ کو یاد ہے میں نے ایک خط میں کہا تھا کہ حریم کی شادی زیادہ سے ہوئی ہے۔ ناولٹ ایک ہی تھا۔ تیلیوں کے پر شامکہ والعباد لا جواب تھا افسانوں میں حنا بشری، امن میلا اور وورخ کہانی، ماہم اوزلین اچھے تھے۔ ماہم اوزلین کا نام پہلی مرتبہ پڑھا بہر حال شمارہ اور آل بہترین تھا پسند آیا۔

ج: پیاری سارا آپ کے افسانے ابھی دیکھے نہیں۔ خواتین پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ جان دار تبصرے کے لیے شکریہ۔

صدف ناز انصاری، مقدس ناز انصاری،

طوبی شوال انصاری..... ملتان

رخ چوہدری کی وفات پر ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگتے ہوئے محل کا مضمون، ”سفر تمام ہوا“ دکھی دل کے ساتھ پڑھا، انشاء جی کا شادی کارڈ ہم قبل ازیں بھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔ سینئر اداکاراؤں حمیرا بانو اور غزالہ کیفی کے انٹرویوز ان کے تجربات سے سچ بھر پور تھے۔ بڑی رائٹر نعیمہ ناز ”روپ بہروپ“ صدف ریحان گیلانی ”مرک“ اور سنیعہ عمیر ”پرداز سے پہلے“ کے ساتھ ملیں۔

بے وجہ روک ٹوک نہیں ہے۔ سبطین کی مکمل سپورٹ حاصل ہے۔ ان شاء اللہ ہر کام ہو جائے گا۔ سبطین میرے شوہر کا نام ہے۔ آج کل ہم سے دور چھاؤنی میں بیٹھے ہیں۔ اور میں دن رات انہیں یاد کرنے کے علاوہ اور آج کل کچھ نہیں کرتی۔

اس ماہ کا ٹائٹل اچھا لگا۔ رخ چوہدری کے بارے میں سن کر افسوس ہوا اور ان کی ایک پرانی تصویر ذہن کے پردے پر ابھر کر ان کا درشن کروائے جاتی ہے۔

حمد و نعت اور احادیث کے بعد ”رنگ ریز میرے“ کے درشن کیے اگست کا شمارہ مجھے نہیں ملا تھا۔ حالانکہ فرزانہ کھرل کے ناول کے بارے میں شعاع میں پڑھ کر کیسا منہ میں پانی آیا۔ بتا نہیں سکتی۔

حریم، اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم نے غلط کیا تو زیادہ کو بتا دو۔

آمنہ جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر نا، زیادہ اب مجبوری کی زنجیر میں بندھ چکا ہے۔ ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے۔“ زمین مجھے دکھ ہوتا ہے۔ تمہارے دکھوں پر مراد کا دکھ تو سب دکھوں پر بھاری پڑ گیا۔

”تیلیوں کے پر“ لڑکیاں واقعی تیلیوں کی مانند ہوتی ہیں۔ نرم و نازک۔ ایک بار زور سے ہاتھ بھی لگ جائے تو گر جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو مرجاتی ہیں۔ ڈاکٹر سائرہ مجھے تمہارا فیصلہ بہت اچھا لگا۔

”پرداز سے پہلے“ سدیدہ عمر نے اچھے ٹاپک کو چنا۔ یہاں بھی والدین کی غفلت کسے کیسے رنگ دکھا گئی۔ ایسے اساتذہ کو تو بیچ چوراہے میں پھانسی دینی چاہیے۔ کیوان نام مجھے اچھا نہیں لگا مگر کردار کا کافی اچھا تھا۔

ج: پیاری فائزہ کافی عرصہ بعد آپ کو محفل میں دیکھ کر بہت خوش ہوئی، زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کے سرال والے اور شوہر بہت اچھے اور خیال رکھنے والے ہیں۔ شوہر آپ کے لکھنے پڑھنے سے خوش ہوتے ہیں اور آپ کے جیٹھ آپ کو پرچے لا کر دیتے ہیں۔ بہت اچھی بات یہ بھی ہے کہ آپ بھی سرال کے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ آپ کی سمجھ داری ہے، آپ کے افسانے ضرور پڑھیں گے۔ اچھے ہوئے تو شائع بھی ضرور کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

ثانیہ بلال..... عالی والا

اس ماہ کا رسالہ مجھے مشکلوں سے ملا۔ ”رنگ ریز میرے“ بہت اچھا ناول ہے۔ اس میں مجھے حریم پر بہت ترس آتا ہے اور مائرہ پر بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ راحت آپ کی تو میں دیوانی ہوں۔ پہلے ”تلی جیسا پیار“ اور اب ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ مجھے ہر ماہ رسالے کا شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ آپ کی میں نے سنا ہے کہ نمرہ احمد اب رسالوں میں اپنے ناول نہیں لکھیں گی تو کیا عالم ان کا ہمارے رسالوں میں آخری ناول ہے۔ پیاری زینب کیسی ہو؟ میں آپ کو یاد تو ہوں نا، اقراء سرور کیا واقعی آپ نے ایک غیر مذہب بندہ کو اپنا آئیڈیل بنایا ہوا ہے؟ ڈاکٹر فریال آپ کا ہسپتال کہاں ہے میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ پیاری آپ! عدنان بھائی کے مشورے دل کے بند دروازوں کو بھی کھول دیتے ہیں، میری پیاری سی فرزانہ کھرل کہاں ہو آپ؟ جلدی سے آ جاؤ اور مزید اس ناول لے کر۔ آپ کا ناول ”نوکمین شہر جمال کا“ میں کوئی دس مرتبہ پڑھی چکی ہوں اور اپنی سہیلیوں کو بھی سنا چکی ہوں۔ شاہین رشید آپ فرزانہ کھرل کا انٹرویو لیں۔

پیاری ثانیہ! ہم نے آپ کا نمبر اٹل کو دے دیا ہے۔ وہ آپ سے ضرور بات کریں گی۔ فرزانہ کھرل کا ناول اگست کے شمارے میں شامل تھا۔ اب اس ماہ کے شمارے میں بھی ان کا ناول شامل ہے۔ خوش؟

لا سبہ نوید..... اچھرہ لاہور

میری پسندیدہ کہانی ”رنگ ریز میرے“ عفت سحر طاہر جی بہت خوب لکھ رہی ہے میں تو ہر ماہ انتظار کرتی ہو کہ کب خواتین آئے اور کب میں خرید کر پڑھوں۔ عندلیب زہرانے بھی بہت اچھا لکھا تھا۔ ”محبت ہم سفر“، ”تقدیر بدلتی ہے“ بھی بہت اچھا تھا۔ ”قرۃ العین خرم ہاشمی“ کا ناول ”درنایاب“ تو بہت ہی اچھا تھا۔ اس کی پیمپھونے اس کو کتنا سمجھایا تھا لیکن پھر بھی اس نے اپنے ہاتھوں سے ہی اپنا گھر خراب کر لیا۔ ”فرزانہ کھرل“ کا ناول ”میرے کیسری پھول“ بس ٹھیک ہی تھا اتنا خاص نہیں لگا اور ایک اوز ناول ہے جو میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ”راحت جبین“ کا ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ بہت ہی اعلیٰ ہے۔

ج: پیاری لائے! آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کے افسانے شائع نہیں ہوئے۔

ڈاکٹر ہانیہ خان..... راولپنڈی

رخ چوہدری کی وفات کے بارے میں پڑھا یقین ہی نہیں آیا سچ بتاؤں بہت افسوس ہوا اللہ پاک ان کو جنت میں جگہ دے۔ آمین۔ ثم آمین۔

”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ ہمیشہ کی طرح اچھا۔ ”رنگ ریز میرے“ کے صفحے اس بار زیادہ تھے۔ اچھی بات ہے۔ ”مرک“ اچھی تحریر تھی۔ شائد العباد لکھیں اور ہم نہ پڑھیں نیور، سو فوراً پڑھا، ہمیشہ کی طرح ایک سبق دے گئی۔ ”شکریہ“ حمیرا بانو سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ”روپ بہروپ“ کے شروع صفحے پڑھے شائد کے ماں پاپا کی لڑائیاں۔ اف سچ بتاؤں وہ والدین مجھے سخت برے لگتے ہیں جو اپنے بچوں کے سامنے لڑتے ہیں۔ اس لڑائی کا بچوں پر کتنا برا اثر ہوتا ہے یہ بات ان کو معلوم نہیں ہے کیا؟ اب میرا دماغ خراب ہو رہا ہے سو اس بات کو چھوڑیں اگر میں اس موضوع پر شروع ہو گئی تو شاید چپ نہ ہوں۔

☆ پیاری ہانیہ! ہم آپ سے متفق ہیں۔ بلاشبہ والدین کی لڑائیاں بچوں کے ذہن پر بہت برے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تر مرد اپنا فرسٹریشن بیویوں پر نکالتے ہیں اور بیویاں بچوں پر۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثناء اسلم رانا..... کلور کوٹ ضلع بھکر

ہماری امی بہت سادہ مزاج ہیں جب بھی خط بھیجا سب سے پہلے پوچھتی ہیں کہ ڈائجسٹ میں نام آیا تمہارا یا نہیں؟ جس مہینے خط نہ لکھوں تو حیران ہوتی ہیں کہ اب کیوں پڑھ رہی ہو، تمہارا نام تو ہے ہی نہیں اس رسالے میں شکر ہے آپ نے ہر دفعہ عزت رکھ لی۔ تھینک یو۔ اب کچھ تھوڑا سا اپنے شہر کے بارے میں بتاؤں۔ یہاں الحمد للہ ضرورت کی ہر چیز باآسانی میسر ہے، آبادی لاکھوں میں ہے۔ تعلیم انتہائی اعلیٰ۔ دھڑا دھڑکاں کھل رہے ہیں خاص طور پر لڑکیوں کے (واہ)۔ لوگ بھی اچھے اور مہمان نواز ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں بالعموم اور ہمارے گھر میں خاص طور پر ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ (ہلہلہ)

ہمارے پرنسپل تو کلور کوٹ کا نام لیتے ہی ”ذہانت کی سرزمین“ کے نام سے ہیں، واہ کیا نام ہے۔ یہاں کے سوسے بہت مشہور ہیں۔ آپ آئیں گی تو ضرور کھلاؤں گی۔ دریائے سندھ بھی یہاں سے گزرتا ہے اور خیبر کی طرف لے جانے والا پل بھی اور..... بس کافی ہے۔

14 کوتمبر کا شمارہ اور اسکول گھٹنے کی خبر ایک ساتھ

ملی۔ سب سے پہلے ”رنگ ریز میرے“ پڑھا۔ جیان نیا کردار، ناول اچھا چل رہا ہے لیکن اس قسط میں شاعری مزے دار نہیں تھی۔ اس کے بعد ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ پڑھا۔ اف زمین کی بے وقوفی۔ ”مرک“ بہت ہی عجیب اسٹوری تھی، پتا نہیں یہ کس طرح کی محبت اور نفرت ہے منٹ میں شروع منٹ میں ختم۔ ویسے ڈرامائی اینڈ نہیں ہونا چاہیے جہاں اتنی بڑی کہانی لکھی ہو تھوڑا اور اتنا بڑا کر دیں لیکن جھٹ سے سب دشمنیاں نہ ختم کیا کریں۔ ”پرچھائی“ واقعی ماں کی پرچھائی اس کی بیٹی ہوتی ہے۔ ”تکلیوں کے پر“ اف موبائل کی تباہ کاریاں شکر سبق سیکھ لیا اور اینڈ اچھا ہو گیا۔ ”روپ بہروپ“ اینڈ بس ٹھیک ہی رہا۔ لیکن دادا دادی کی محبت اور خلوص اچھا لگا۔ کاش ایسے لوگ ہر گھر میں ہوں۔ محسن کا غصہ اچھا نہیں لگا ہیرو صاحب ہنستے ہوئے اچھے لگتے ہیں بس۔ ”ہاں یا ناں“ اف اتنی گندگی، اور بھڑکیلے کپڑوں پر ہنسی آئے۔ ”پرداز سے پہلے“ اف کیا کیا ہو رہا ہے معاشرے میں کیوان نام بھی منفرد اور کام بھی۔ گڈ اسٹوری، لیکن آخر میں علیحدہ علیحدہ کیوں کر دیا۔ جدائی! حمدہ خان کی غزل اچھی لگی۔ حمیرا بانو اور غزالہ کیفی دونوں انجان تھیں ہمارے لیے۔

پیاری شائ! آپ کا خط اس ماہ بھی شامل ہے۔ اپنی امی کو بھی دکھا دیجیے گا۔

آپ کے شہر کا احوال پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر یہ جان کر کہ آپ کے شہر میں لڑکیوں کے لیے تعلیم کی بھی سہولیات مہیا ہیں اور لڑکیوں کے کالج دھڑا دھڑا کھل رہے ہیں۔ کلور کوٹ کے باسی بہت ذہین ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ تو آپ کے خط سے بخوبی ہو گیا تھا۔

زمین اسکول میں پڑھنے والی ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ شکر قندی اور مونگ پھلی کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی دکان منشی اکرم کے پاس گروی رکھتا ہے اور سود بھرتا ہے۔ زمین اور افشاں اسکول سے واپسی پر باتیں کرتی آتی ہیں، راستے میں مراد کا رکشہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کھتی ہے، میں تو رکشہ چلاؤں گی۔ اسی وقت سامنے والے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، مراد کے باہر نکلنے پر دونوں بھاگ جاتی ہیں۔ زمین اپنا بیگ بھول جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر بیگ کا خیال آتا ہے۔ وہ ماں سے کہتی ہے کہ کتنا پیچھے لگ گیا تھا، بیگ گر گیا راستے میں۔ فرخ کے ہمراہ شمینہ سے بیگ لینے بھیجتی ہے لیکن وہاں رکشہ نہیں ہوتا۔ فرخ کہتا ہے کہ وہ لا دے گا، رکشہ والا اس کا استاد ہے۔ مراد اس کا بیگ گھر دے جاتا ہے لیکن بیگ کھولنے پر اسے زمین کا نام پتا چل جاتا ہے۔ وہ زمین کے بہن بھائی کو پیسے دیتا ہے مونگ پھلی کھانے کے لیے۔

وہ فرخ کے گھر جاتی ہے۔ فرخ کے کمرے کے دروازے میں آٹومینک لاک لگا ہوا ہے، وہ بند ہو جاتا ہے۔ زمین ایک دم چیختی ہے۔ شمرین جو بہن کو بلانے آتی ہے اس کی چیخ سن کر گھر سے باہر نکلتی ہے، جہاں خالی آرہی تھیں، وہ ان کو بتاتی ہے۔

راحت جبین

زندگی آج بھی کراہتی ہے



منشی اکرم، انور حسین کے گھر آتا ہے جہاں زمین کو دیکھ کر اس کی نیت پھسل جاتی ہے۔ وہ اس کو پانچ سو روپے دے کر جاتا ہے اور انور حسین سے اس کا رشتہ مانگتا ہے۔ انور حسین انکار کر دیتا ہے۔
ہوٹل میں مراد کو انور حسین ملتا ہے، وہ اسے اپنے رکشہ پر گھر چھوڑ دیتا ہے۔



زمین افشاں اور ان کی امی کے ساتھ بازار جاتی ہے جو تا خریدنے، وہاں مراد اسے دیکھتا ہے وہ جس چیز کو دیکھتی ہے، ہاتھ میں لے کر وہ سب خرید کر اس کے گھر دے جاتا ہے۔

افشاں رکھ لیتی ہے لیکن زمین ڈر کے مارے شمینہ کو سب بتا دیتی ہے۔
مراد کا کہنا ہے کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ کا کا کہتا ہے کہ وہ اور منشی رشتہ لے جائیں گے۔
ملک صاحب کے بیٹی کی شادی میں پھانا اور رشیداں کام کر رہی ہیں۔

ثریا کو تھرکتا دیکھ کر رشیداں کو غصہ آیا ہے۔
زمین بائج سوکی ٹیوشن پڑھانے لگتی ہے۔ انور حسین شمینہ کے منع کرنے کے باوجود اجازت دے دیتا ہے۔ وہ
نمبردار کے گھر بھی ہوا کرتا ہے۔

ثریا ملک صاحب کے گھر سے کھانا چوری کر کے لے کر آتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات بشیر سے ہوتی ہے۔
رشیداں کو ملک صاحب کے گھر سے چاول ملتے ہیں۔ رفیق اسے گالیاں بکتا ہے۔
مراد کو بخار ہو جاتا ہے۔ کا کا اسے دیکھنے آتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ اسے اب شادی کر لینی چاہیے۔ وہ انور حسین
کی بیٹی زمین کا کہتا ہے۔ کا کا رشتے کے لیے منشی کو لے جانے کا بھی کہتا ہے۔ منشی ہامی بھر لیتا ہے۔
مراد اور کا کا، انور حسین کے گھر منشی کا انتظار کر کے چلے جاتے ہیں۔ منشی بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ
مراد کو بھی یہیں آنا تھا تو وہ انور حسین سے کہتا کہ تو نے یا تیری بیٹی نے مراد کو پھنسا دیا ہے۔
مراد منشی کو گھونسا مارتا ہے۔ اس کی ناک سے خون نکلتا ہے۔ کا کا زبردستی مراد کو لے جاتا ہے منشی بھی دھمکیاں دیتا چلا
جاتا ہے۔

مراد فرخ کو بتاتا ہے کہ وہ زمین کے لیے رشتہ لے گیا تھا۔ اور منشی کا بھی بتایا ہے۔ فرخ صدے سے وہاں سے
آ جاتا ہے۔

ثریا بشیر سے ملنے باغ میں جاتی ہے وہ دوبارہ رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔
رشیداں ثریا کے لیے رشتہ دیکھتی ہے وہ لوگ آئے بیٹھے تھے کہ ثریا بشیر سے مل کر آتی ہے وہ انکار کر کے چلے جاتے
ہیں۔ افشاں زمین کو زبردستی مراد کی گلی سے لے کر آتی ہے مراد کے ملنے پر اسے خوش خبری سناتی ہے کہ زمین کے ابا مراد کو
ہاں کہنے والے ہیں۔

فرخ اپنی ماں سے زمین کی بات کرتا ہے وہ اسے ڈانٹ کر چپ کرادیتی ہیں۔ وہ غصے میں زمین کے گھر جاتا ہے
جہاں افشاں اسے زمین کی شادی کی خبر سناتی ہے۔

منشی انور حسین سے پورے پیسے دینے کا کہتا ہے۔ وہ پریشان گھر آتا ہے شمینہ اسے کہتی ہے کہ فوراً مراد سے زمین کا
نکاح کر دو، انور حسین منشی سے کچھ وقت مانگ لیتا ہے۔

رفیق رشیداں سے کہتا ہے کہ اسے اسپتال لے جائے۔ کیوں کہ اس کے زخم پک رہے تھے۔ زمین ٹیوشن پڑھاتا
چھوڑ دیتی ہے۔ مراد گھر پہنچتا ہے تو اس کا سامان باہر پڑا ہوتا ہے۔

کا کا اس کے گھر میں رنگ و روغن کر دیتا ہے۔ فرخ زمین کو مراد سے شادی نہ کرنے کا کہتا ہے۔ زمین اسے گھر
سے بھگا دیتی ہے۔ دروازے پر مراد آتا ہے۔ اس وقت شمینہ اور افشاں کی امی بھی آ جاتی ہیں۔ مراد بچوں کے لیے پڑا لے
کر آتا ہے۔ شمینہ کہتی ہے کہ زمین وہ تیرا بہت خیال رکھے گا، بڑے دل والا ہے۔ وہ شمینہ سے زمین کو بازار لے جانے کا
کہتا ہے۔ افشاں اور اس کی امی کے ساتھ شمینہ، زمین کو بھیج دیتی ہے۔ اسی دوران منشی آ جاتا ہے، شمینہ اسے دروازے سے
ہی ٹر خادیتی ہے۔ منشی کو گلی سے نکلے ہوئے مراد کا رکشہ نظر آتا ہے، وہ انتقامی کارروائی کا سوچتا ہے۔

رشیداں کے ٹوکنے پر ثریا اس پر گرم چائے پھینک دیتی ہے۔ رفیق کے زخم سڑ جاتے ہیں۔ رشیداں اس کے بھائی کو

بلائی ہے، وہ اسے لاہور لے جاتا ہے لیکن رفیق مر جاتا ہے۔

زمین کے گھر میں بارات کے استقبال کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ زمین دہن بن چکی تھی۔ انور حسین بارات کا انتظار کر رہا تھا کہ کا کا آ کے بتاتا ہے کہ مراد کو پولیس پکڑ لے گئی۔ شادی کے گھر میں یہ خبر بجلی بن کر گرتی ہے کہ مراد کو پولس پکڑ کر لے گئی ہے۔

رفیق کے مرنے کے بعد اس کا بھائی شفیق اپنے بیٹے سے ثریا کا نکاح کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ثریا کو عین وقت پر پتا چلتا ہے کہ اس کی شادی بشر سے نہیں کسی اور سے ہو رہی ہے تو وہ غصہ کرتی ہے۔ رشیداں کے دیے سوٹ کو آگ میں جھونک دیتی ہے اور بشر سے رابطہ کر کے عین شادی کے وقت گھر سے بھاگ جاتی ہے، انصی کو دھمکا کر جاتی ہے۔ نکاح کے لیے آنے والوں کو پتا لگتا ہے تو سب باتیں بناتے ہیں۔

منشی، انور حسین کو دھمکیاں دیتا ہے کہ وہ اس کے سارے بچوں کو اور اسے جیل بھیج دے گا، وغیرہ وغیرہ۔ انور حسین مان جاتا ہے۔ ثمنیہ اور خدیجہ زمین سے کہتی ہیں کہ وہ بھاگ جائے لیکن زمین باپ کی حالت دیکھ کر منشی سے شادی پر رضا مند ہو جاتی ہے۔

ثریا کے بشر کے ساتھ بھاگ جانے پر بارات واپس چلی جاتی ہے۔ کا کے کو یہ سن کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ انور حسین، زمین کا نکاح منشی سے کرنے پر راضی ہے۔ خدیجہ گھبراہٹ میں تو فرخ بہن کے گھر سے واپس آ چکا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ منشی کو مراد کے نکاح کی خبر اسی نے دی تھی۔ خدیجہ اسے مارتی ہیں۔ کا کا مراد کو جا کر بتاتا ہے کہ منشی کے دھمکانے پر انور حسین، زمین کا نکاح منشی سے کرنے پر راضی ہے۔ مراد کو غصہ آتا ہے۔

صبح ہو جاتی ہے منشی نہیں آتا۔ خبر آتی ہے کہ منشی کو کسی نے قتل کر دیا۔ منشی کی بیوی اسپتال میں بیان دیتی ہے کہ وہ نہیں جانتی کہ حملہ آور کون تھے۔ منشی بچ جاتا ہے۔ نسیہ کے بھائی اس کا علاج کرواتے ہیں۔ بشر نسیہ کو بچانے کے لیے منشی کو مارتا ہے۔ بشر کے گھر پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ بشر پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی ثریا کو مارتی ہے۔ مراد جیل سے زمین کو پیسے بھیج کر یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ اس مشکل گھڑی میں اس کے ساتھ ہے۔ فرخ کہتا ہے کہ اگر اسے پیسے چاہیے تھے تو وہ اس سے کہتی..... کہ یہ پیسے نہیں اس کا کھویا ہوا راستہ ہے۔ زمین ان پیسوں سے سامان خرید کر ریزمی لگا لیتی ہے۔ پکوڑے، چنے، آلو کی ٹکی وغیرہ۔ ثمنیہ کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر اٹل ہوتی ہے۔ وہ اسکول کے پاس ریزمی لگاتی ہے۔ اس کا سامان ایک گھنٹے کے اندر اندر بک جاتا ہے۔ فرخ اسے ریزمی لگائے دیکھتا ہے تو بہت برا ماننا ہے۔

ثریا اور بشر ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ رفیق علی کا بھائی ان کا مکان بچ دیتا ہے۔ وہ ایک جگہ باڑے میں جھونپڑی ڈال لیتی ہیں۔

زمین مراد کے رکشے میں پیپر دینے جاتی ہے۔ خدیجہ خالہ اپنی بہن کے گھر سے واپس آتی ہیں تو انہیں پتا چلتا ہے وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

منشی زمین کو ریزمی لگائے دیکھتا ہے تو اسے تنگ کرتا ہے۔ منشی کے نہ پیش ہونے پر چند یکطرفہ پیشیوں کے بعد مراد کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مراد رہا ہو جاتا ہے۔

گیارہویں قسط

”کتنے سالوں سے وہ یہاں رکی تھی۔ بس اسی اڈیک میں کہ کبھی اس کا پتر واپس آئے تو خالی گھر دیکھ کر واپس نہ چلا جائے۔“

مراد کی ہتھیلیوں پر پسینہ اتر آیا۔
 ”پر اب تو نہ گھر والا رہا، نہ گھر..... کہیں سے ایک تیلے (تیلے) کا بھی آسرا نہیں۔“ گورکن کی آنکھوں میں
 شناسائی کی چمک تھی۔ جو کہتی تھی، دور دیس سے آنے والے جوان! میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ تمہارا خیر اسی مٹی
 سے اٹھا ہے۔“ وہ مختصر لفظوں اور کم سے کم وقت میں رشیداں کی ریاضتیں مراد کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا۔
 ریاضتیں جو برسوں پر محیط تھیں۔

وقت جو بہت ہی محدود تھا۔
 اس نے بے حد حیرت سے مراد کو دیوانہ وار پکی سڑک کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اور تاسف سے علی بخش کی
 قبر کو دیکھ کر بڑبڑایا۔
 ”بندہ بھی وقت کے پیچھے اسی وقت بھاگتا ہے، جب وقت ہاتھ سے نکل جائے۔ اب تو وگین نکل بھی گئی
 ہوگی۔“

مراد دیوانہ وار پکی سڑک پر اس وگین کے پیچھے بھاگا، جو اس کی دسترس سے دور، بہت دور نکل گئی تھی۔
 وہ گھٹنوں کے بل سڑک پر گرا۔
 ”اماں!“ اس کی اپکار پر کھیت..... درخت..... چہند پرند تھر تھرا گئے۔
 ایک دن وہ بہت مجبور ہو کر اسی طرح ماں کو ماہی بے آب کی مانند تڑپتا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔
 آج نجانے کس بے بس کر دینے والی مجبوری کے باعث رشیداں اسے چھوڑ گئی تھی۔ اس نے وحشت زدہ
 ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

کوئی سواری، کوئی آسرا جو وہ رشیداں کے پیچھے جاسکے۔
 مگر سڑک سنان اور خاموش تھی۔
 ”میں نے دیر کر دی..... دیر.....“

وہ بچوں کی طرح پتی سڑک پر ہاتھ مار مار کر رونے لگا۔ کوئی نہیں تھا جو اس تڑپتے بلکتے نو جوان کو چپ
 کرواتا۔ یہاں تک کہ دل خود ہی ٹھہر گیا۔ مراد نے اٹھ کر ایک بار پھر خالی سڑک کو دیکھا اور درختوں کی چھاؤں
 میں آ گیا۔ کھیتوں میں کہیں نیوب ویل چل رہا تھا اور کھالے بھر بھر پانی کھیتوں کو سراب کر رہے تھے۔ مراد نے
 چیل اتاری اور سست روی سے ہاتھ پاؤں دھونے لگا۔ درختوں کی کھٹی چھاؤں میں کچھ پرندوں کی بولیاں خلط
 ملط ہو رہی تھیں۔ مراد کو لگا، وہ اس پر لعنت بھیج رہے ہیں۔

ایک گلہری درخت سے اُتری۔ مراد کو دیکھا تو دوسرے درخت پر چڑھ گئی۔
 مراد نے اپنی چیل دھوئی اور درخت کے ساتھ کھڑی کر دی۔ اس سے بہتا پانی گھاس میں جذب ہونے
 لگا۔ مراد نے بھی تھکے تھکے انداز میں درخت سے ٹیک لگالی۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔
 ناکامی اور شکست کے احساس نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

وہ خاموشی سے اگلی وگین کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔
 ٹھنڈک آمیز خاموشی اس کے اعصاب کو جو جھل کرنے لگی تو اس نے دکھتی آنکھیں بند کر لیں۔
 ”میں گیا تھا زمین.....! مگر ماں کا انتظار دم توڑ گیا تھا۔“

”اور تم اتنے بزدل نکلے کہ باپ کی قبر پر چار پھول چڑھا کر واپس آ گئے۔“ زمین کے لہجے میں بلا کا طنز
 تھا۔
 مراد کے ننگے پیر کی سائید پر سیاہ مکوڑے نے دانت گاڑ دیے۔ مراد نے بلبل کر پیر سمیٹا اور کیڑے کا سر کچل

دیا، مگر اس کا سر اب بھی اس کے پیر کے ساتھ دانت گاڑے تھے اور ”کاڈے“ کا وجود کھاس میں لم ہو چکا ہے۔
 ”مت مارا کر انہیں، جہاں یہ کالے ”کاڈے“ ہوتے ہیں، وہاں رزق فضل ہوتا ہے۔“ ماں ان کے
 سوراخوں کے پاس روٹی کے بھورے ڈالتی رہتی تھی۔ مراد نے چٹکی سے اس کے سر کو پکڑ کر الگ کیا تو وہاں خون کا
 موٹا سا قطرہ نکل آیا۔ مراد نے چٹکی بھر مٹی اٹھا کر زخم پر مل لی اور تیزی سے کھڑا ہو گیا۔
 وہ کسی کو بتا کر نہیں گیا تھا۔ کوئی نام و نشان نہیں چھوڑا تھا۔ کیا پتا ماں گھر کی دہلیز پر کوئی حنٹی گاڑی ہو۔
 گاؤں بدل گیا تھا، مگر راستے وہی تھے۔ ایک امید کا سراپکڑ کر وہ کھیت کھلیاں، گاؤں کی کچی کچی گلیاں
 ٹاپنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی بٹیاں (دکانیں) کھلی تھیں۔ گھر کے باہر ادھ بنگے بچے کھیل رہے تھے۔ کسی نے اسے
 روکا، نہ مراد نے کسی سے راستہ پوچھا۔ ایک دو گلیاں غلط مڑ گیا، مگر اب بھی کچھ پرانی نشانیاں باقی تھیں جنہیں چتا
 وہ اس چار دیواری کے پاس پہنچ گیا۔

جو بھی ایک گھر تھا.....
 روز و شب کتنے ہی سخت مگر اس کی ماں اس گھر کو سجاتی، سنوارتی رہتی تھی۔

ایک ایک کونے میں اس کا سلیقہ نظر آتا تھا۔
 اب وہاں گوبر کی بو بھی..... دودھ کی خالی بالٹیاں اور چارے کی ڈھیریاں تھیں۔ قطار در قطار بندھی بھینسوں
 نے مندی مندی نیم وا آنکھوں سے اجنبی کو دیکھا۔ اجنبی..... جس کا بچپن اس چار دیواری میں دفن ہوا تھا۔
 ”اس نے ایک بار بھی سوچا جو سوتیلا باپ اس کو مار مار کر نیلو نیل کر دیتا تھا، وہ اس کی بہن کے ساتھ کیا
 سلوک کرتا ہوگا؟

جو اس کی ماں کو بات بے بات گھر سے نکال دیتا تھا، اب کیا کرتا ہوگا۔ اس نے تو اپنی زندگی بنالی اور خود
 غرض ایسا کہ مڑ کر ان کا حال تک نہ پوچھا اور میرے خاندان کو سنبھالنے کی بات کرتا تھا۔“
 رفیق مر گیا تھا۔ اس کا گھر بھینسوں کے باڑے میں بدل گیا تھا۔

تو رشیداں اور اقصیٰ نے کیسی زندگی گزاری ہوگی کہ انہیں گاؤں تک چھوڑنا پڑا۔ مراد کا دل چاہا، وہ اپنا سر
 چارہ کاٹنے والی مشین میں دے ڈالے۔ وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھا۔ دروازہ عبور کیا۔ پھر اس کے قدم جم
 گئے۔

ایک عورت چارے کے ڈھیر کے پاس بیٹھی ٹوکے کے ساتھ چارہ کاٹ رہی تھی۔ بجلی سے چلنے والی مشین
 شاید خراب تھی۔ تب ہی گپ چپ ٹوکے کی ٹنگ ٹنگ سن رہی تھی۔ اس کے سفید سرمئی کھچڑی سے بالوں کی پکلی چٹیا
 پشت پر دوپٹے سے جھانک رہی تھی۔ اس کی ہاں کے بال تو سیاہ تھے۔ مٹی چٹیا دوپٹے میں چھپائے نہ چھپتی۔ وہ
 اس کی گود میں سر رکھ کر چٹیا کے بل گنا کرتا، کبھی گنتی میں بل کم ہو جاتا تو مشکوک ہو کر ماں کو دیکھتا۔
 ”اماں ہتھونے بال کاٹے ہیں۔“

رشیداں پہلے ہنستی، پھر کانوں کو ہاتھ لگا کر استغفار کرنے لگتی۔

”اقصیٰ پتہ پتہ! جھپتی جھپتی ہاتھ ہلا۔“

مراد سر سے پیر تک کانپ گیا۔

آواز بوڑھی اور تھکی ہوئی تھی مگر رشیداں کی تھی۔

”کیوں اماں! تم نے ویمن پکڑنی ہے؟“ لہجے میں بلا کا طنز تھا۔

مراد نے کچھ دور دیکھا، چہرے پر بدن، گندمی رنگت والی دہلی پتلی لڑکی کے ماتھے پر بل ہی بل تھے۔ اگلے
 تھا پتی وہ لڑ رہی تھی، گوبر سے، ایلوں سے بھری دیوار سے اور شاید اپنے آپ سے۔

اسی کو نے میں چار پائی بچھا کر رشیداں کپڑے کا جھولا باندھ کر ٹنھی اقصیٰ کو اس میں لٹا کر مراد سے کہتی تھی۔
 ”سبق یاد کرتا، پینکا (جھولا) ہلاتی جا۔ اتھے ناں میرا کام پڑا ہے۔“
 وہ اردو کا سبق رشتا، ٹانگیں مار مار کر جھولا ہلاتا رہتا۔ کبھی کبھی جھک کر جھانک لیتا تو پڑ پڑ آنکھیں کھولے
 کھلکھلا اٹھتی کہ شاید وہ ”چاہ چاہ“ کھیل رہا ہے۔
 اچلا دیوار پر ٹھوپ کر اقصیٰ مڑی۔
 ماں کے پیچھے کھڑے مانوس ابجی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

☆☆☆

دونوں سڑک سے کچھ دور درختوں کی چھاؤں میں بیٹھی تھیں۔
 ”ہم کہاں جائیں گے؟“
 اقصیٰ کے بار بار پوچھنے پر بھی رشیداں کے ہونٹوں کی چپ نہ ٹوٹی۔
 ”اماں! ویگن آگئی۔“ اقصیٰ تیزی سے کھڑی ہوئی۔
 رشیداں بھی اٹھی۔ کٹھڑی سنبھالی۔ اقصیٰ سڑک کی طرف بھاگی تاکہ ویگن کو روک سکے مگر وہ بھونچکی رہ گئی۔
 رشیداں کا رخ سڑک کی طرف نہیں، گاؤں کی طرف تھا۔ ویگن نے رک کر دوبارہ ہارن بھی بجایا۔ اقصیٰ ماں کے
 پیچھے بھاگی۔
 ”اماں! کہاں جا رہی ہو؟ ویگن چلی جائے گی۔“
 ”آج کی مزدوری لے لی تھی، کام نہ کیا تو حلال کیسے ہوگی؟“ رشیداں منہ ہی منہ میں بد بدائی۔
 اقصیٰ نے بے حد صدمے سے دور جانی ویگن کو دیکھا اور تب سے اب تک وہ کھول کھول کر آدھی ہو گئی تھی۔
 مگر نہیں سمجھ سکی کہ وہ رشیداں کا وجدان تھا جو اسے واپس کھینچ لایا۔
 ”اماں! کیا اب بھی میری بیوی کے لیے گلابی جوڑا سنبھال کر رکھا ہے۔“ رشیداں کے ہاتھ سے ٹوکا
 چھوٹ گیا۔

سائیں سینے میں ایک گیا۔
 مراد اسی کے پیچھے گھٹنوں کے بل گرا۔
 رشیداں سجدے میں گر گئی۔
 مراد بچوں کی طرح اس کی پشت سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

گاؤں پر چھکا نیلا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا تھا، جس کی وجہ سے قبرستان میں لگے درختوں کی ہریالی
 سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ ہوا میں درختوں میں سرسراہٹ، سرگوشیاں کرنی، پیچھے آنے والے طوفان کا پتا دیتی تھیں۔
 وہیں دو قبروں کے پاس ایک تیسری قبر جس کی مٹی کھلی اور تازہ تھی۔ پھولوں اور سبز پتوں سے ڈھکی تھی۔
 اس کی زندگی انتظار تھی۔ انتظار ختم ہوا۔ زندگی بھی ختم ہو گئی۔
 اس نے فیصلہ کر لیا تھا، وہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ شاید رشیداں کی کہانی کو اسی طرح ختم ہونا تھا۔
 کتبے پر سر رکھے مراد بلک بلک کر رو رہا تھا۔

☆☆☆

ناشتہ بشیر کے سامنے رکھتے ہوئے سکیٹھنے نے کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کے تیور اب بھی بگڑے
 اور مزاج برہم تھا۔ جس طرح اس نے ثریا کو پیٹا تھا، سکیٹھنے کو اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔

بشیر نے ٹرے سامنے کی اور بڑے بڑے لقمے لینے لگا۔ وہ خود الجھا ہوا پریشان اور تھوڑا سا پشیمان تھا۔ اسے
 ثریا کو اتنی بری طرح سے نہیں مارنا چاہیے تھا۔
 ”اب اس کا کیا کرنا ہے؟“ سکینہ نے پاس بیٹھ کر لسی کا گلاس بھرا۔
 ”کیا کرنا ہے، اسے سمجھا دیا ہے۔ یہاں کیسے رہنا ہے۔“ سکینہ تلملا گئی۔ دل میں امید تھی کہ اب تو بشیر ثریا
 کو گھر سے نکالے ہی نکالے۔

”رکھنا ہی تھا تو اتنا مارنے کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”مجھے اچھی طرح پتا ہے، کس کو کس طرح رکھنا ہے۔ وہ بھی یہیں رہے گی اور تم بھی۔“
 بشیر نے سکینہ کی آنکھوں میں ڈر کی پرچھائی دیکھ لی تھی، تب ہی اس لکچے میں بات کر رہا تھا۔ سکینہ نے اسے
 حیرت سے جاتے دیکھا۔ کل تک اسے گھر لانے کے لیے وہ قدموں میں بچھا جا رہا تھا۔ اس کی ہر بات پر آمین
 آمین کہنے والا مرد آنکھیں ماتھے پر رکھ کر چلا گیا تھا۔
 ”لعنت ہو۔ اس سے تو اچھا تھا، مر ہی جاتی۔ اتنی مار کھا کے بھی زندہ ہے کم بخت۔“ سکینہ جلتی کلتی رہی کہ
 بشیر کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا، جہاں ثریا رکھی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر ثریا نے سر اٹھا کر دیکھا۔
 اس کمرے میں دو چار پائیاں جوڑ کر رکھی تھیں، جس پر سکینہ کے جہیز کی چادریں پچھی تھیں۔ ایک طرف
 دیوار گیر الماری، جو فالتو ساز و سامان سے بھری تھی۔ دوسری طرف کچھ موڑھے پڑے تھے۔
 ”ناشتہ کرلو۔“

کہہ تو پوئے رہا تھا، جیسے ناشتہ ساتھ لایا ہو۔ وہ رات سے بھوک تھی۔ درد سے برا حال تھا۔ ساری رات
 روتے کراہتے گزر گئی۔ اس بے درد نے مڑ کر دیکھا تک نہیں اور اب اسے ناشتہ کا یاد آ گیا تھا۔
 وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”مجھے گاؤں واپس جانا ہے۔“ بشیر نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر ہنس پڑا۔
 ”کس کے پاس؟“

”کالے چور کے پاس۔“ وہ ترخ کر بولی۔ اس کے انداز میں ڈر نہیں، بغاوت تھی۔
 ”ہاں، کالے چور تو تمہیں بہت مل جائیں گے مگر شوہر دوبارہ نہیں ملے گا۔“
 ”تم ڈنکر ہو ڈنکر.....“ وہ ترخی۔

”تم باز نہ آئیں تو ڈنکر ہی بن جاؤں گا۔“ بشیر تیزی سے اس کے قریب بیٹھا۔ ثریا ڈر کر پیچھے ہوئی۔ ”میری
 بات سنو، اب تم وہ سب نہیں کر سکتیں جو گاؤں میں کرتی رہی ہو۔“
 ”میں نے کیا کیا ہے؟“

”میں لاعلم نہیں تھا۔ جانتی ہو، گاؤں کے لڑکے کیا کہتے تھے، چار چوڑیوں اور دو سموں پر بکنے والی ہے
 ثریا۔“

ثریا کے حلق سے آواز تک نہ نکلی۔ اس کے قصیدے پڑھنے اور اس کی خاطر جان دینے والوں نے اسے کتنا
 سنا سمجھ لیا تھا۔ یا شاید وہ اتنی ہی سستی ہو گئی تھی۔ اسے رشیداں یاد آئی اور اس کی باتیں بھی۔

بشیر قریب کھسک آیا۔
 ثریا اس سے زیادہ پیچھے نہیں جاسکتی تھی کہ پیچھے دیوار تھی۔ وہ بری طرح پھنس چکی تھی۔ نہ آگے جاسکتی تھی نہ
 پیچھے۔

”میری بات سنو۔“ بشیر نے دونوں ہاتھوں سے اس کے بکھرے بال سمیٹے۔ اس کے چہرے کے نیل

نمایاں ہو گئے تھے۔
 ”وہاں کوئی تمہارا منتظر نہیں ہے۔ تم واپس بھی گئیں تو اس سے زیادہ تمہاری قیمت نہیں لگے گی..... اور یہاں..... یہ سب نہیں چلے گا۔ تم میری بیوی ہو۔ میری عزت ہو۔ عزت بن کر رہی رہنا ہوگا۔“
 ”مجھے نہیں پتا تھا تمہاری بیوی بھی ہے۔ اسی کی باتوں میں آ کر تم نے مجھے مارا۔“
 ”معاف کر دو۔ غلطی ہو گئی۔ غصے میں آ گیا تھا۔“ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرنے لگا۔ ثریا کے زخم کچھ اور جلنے لگے۔

”تمہیں دروازے میں کھڑا دیکھا تو برداشت نہ کر سکا بس تم میری بن کے رہنا۔ مجھے دھوکا نہیں دینا۔ دیکھو، میں نے زندگی میں کبھی جھوٹا نہیں کھایا۔ باسی چیز کو سو گھٹا تک نہیں۔“
 ثریا کا دل متلانے لگا۔

یہ کیسا عجیب مرد تھا۔ اس کی بے عزتی بھی کرتا تھا اور محبت کے دعوے بھی۔ اسے دو کوڑی کا بنا کر، پھر سے عزت دینے لگتا تھا۔
 ثریا کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ جہیز میں صرف بے اعتباری باندھ کر لائی تھی اور اسے بری میں محبت میں لپٹی صرف اور صرف تذلیل ملی تھی۔
 اس نے جو بویا تھا..... اب وہی کاٹنا تھا۔

ورنہ وہ خود کاٹ دی جاتی کہ مرد کی لغت میں بے وفائی کی معافی کم از کم عورت کے لیے نہیں تھی۔
 ”میں ابھی آتا ہوں۔“ بشیر کہہ کر چلا گیا۔

ثریا نے خود کو بے حد کمزور محسوس کیا۔ اسے اس گھر میں اسی طرح رہنا تھا جس طرح بشیر چاہتا تھا اور ان ہی حالوں میں، جس میں وہ رکھتا۔ بشیر خود اس کے لیے ناشتہ لایا۔ اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ ایک ایک نوالہ چباتے اس کے جبرؤں میں درد کی لہریں اٹھتی رہیں، مگر یہ درد اس تکلیف سے کہیں کم تھا جو بشیر کے لفظوں نے پہنچائی تھی۔

”جب میرے بارے میں اتنا کچھ معلوم تھا، تو نکاح کیوں کیا؟“
 ”پہلی محبت ہو اور پہلی محبت کہاں بھولتی ہے۔“ اب وہ یکسر بدلا۔ وہی نرم گفتار جان چھڑنے والا بشیر تھا۔
 ”میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا بشیر!“ وہ رو پڑی۔
 ”تم کچھ نہ کرو، اسی لیے یہ کیا تھا۔“

وہ اس کے لیے مرہم اور دوا لایا تھا۔ مرہم اس نے خود لگایا، گولیاں ثریا نے پھاٹک لیں اور سو گئی۔ اسے پتا نہیں چلا، بشیر کب وہاں سے گیا۔
 جب آنکھ کھلی تو دن ڈھل رہا تھا۔

اسے طبیعت بہتر محسوس ہوئی۔ باہر سیکنہ کی سہیلیاں آئی بیٹھی تھیں۔ چائے سموسوں کے ساتھ سیکنہ کی گھر واپسی کا جشن منایا جا رہا تھا۔ سیکنہ نے نمک مرچ لگا کر کل والا واقعہ سنایا۔
 ”مگر تمہارا میاں تو اتنا ظالم نہیں ہے سیکنہ! تم بھی تو سودا دروازے میں جا کر لے ہی لیتی ہو۔“
 ”یہی تو بات ہے، آخر کوئی بات تو ہوئی جو بشیر نے یہ کیا۔ ورنہ مجھے تو آج تک انگلی نہ چھوئی۔ مارنا تو دور کی بات ہے۔“

”تو اب یہ یہیں رہے گی، تمہارے پاس؟“
 ”کیا کروں؟ برداشت کرنا پڑے گا۔ کم بخت مر ہی جاتی تو اچھا تھا۔ پتا نہیں کہاں سے یہ جو نمک بشیر کو

چٹ گئی۔“ سیکنہ کو سوسہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”اس کی مار سے نہ مری تو تمہاری بد دعاؤں سے کہاں مروں گی۔“

ثریا نے تڑخ کر کہا۔ سب کی گردنیں اس کی طرف مڑیں۔ چہرے کے نیل دیکھ کر سب کے دل ڈوب گئے۔ وہ غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔

”یہ تو بہت تیز ہے سیکنہ! ہوشیار رہنا۔“ سب سہیلیوں کی مشترکہ رائے تھی۔

☆☆☆

گھر بھر میں بریانی کی خوشبو نے دھمال ڈال رکھی تھی اور بچوں نے الگ۔ جوش میں کسی نے پیاز کاٹی، کسی نے ٹماٹر، آلو۔ فضلہ نے ہری مرچیں کاٹی تھیں۔ اب دونوں ہاتھ لہراتے ”ہائے آپنی ساڑ پڑ رہا ہے“ کی گردان کر رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ انور حسین نے اس کے ہاتھ پکڑ کر دیکھے۔ ننھی ہتھیلیاں سرخ ہو رہی تھیں۔

”میں نے منع بھی کیا تھا، مرچیں مت کاٹو۔ میری سنتی کہاں ہے۔“ بڑا پتیلا دھونی زمین نے غصے سے کہا۔

ایک تو کام کا بوجھ، اوپر سے شمینہ کی ناراضی۔ وہ اب بھی زمین سے بات نہیں کر رہی تھی۔ بس چپ چاپ کام کروا دیتی۔

”ہائے آپنی! خون نکل آیا..... خون۔“ اندر سے طلحہ نے چیخ پکار شروع کر دی۔

”کیا مصیبت ہے، تم لوگ کچن میں کر کیا رہے ہو؟“

وہ سب جھوڑ چھاڑ کر اندر بھاگی، جہاں طلحہ نے انگلی اور انگوٹھے پر کٹ لگوا لیا تھا۔ زخم تو معمولی تھا، مگر وہ خون دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

”آؤ، میرے ساتھ۔“ انور حسین فضلہ کو لے کرے میں بیٹھ گیا۔ صابن سے اس کے ہاتھ دھوئے۔ پھر سرسوں کے تیل کی شیشی اٹھائی اور اس کے ہاتھوں پر لگانے لگا۔ اکڑوں بیٹھی فضلہ سراٹھا کر باپ کے چہرے کو پیار سے دیکھنے لگی۔ کبھی بھی لگتا تھا، انور حسین اپنے حواسوں میں آنے لگا ہے۔

”ابو جی! آج آپنی نے بریانی بیچنے جانا ہے، آپ بھی ساتھ چلے جانا۔“

”ہوں.....“ انور حسین نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”پہلے میں بیچنے جایا کرتا تھا۔“

”آپ شکر قندی بیچتے تھے، بریانی نہیں۔“ فضلہ نے تصحیح کی۔

”میں اب بھی شکر قندی بیچوں گا، بریانی نہیں۔“

زمین نے طلحہ کے ہاتھ پر سرسوں کا تیل لگا کر ٹالکس پاؤڈر چھڑکا اور پٹی باندھ دی۔

”بس اب تم سب بچن سے نکل جاؤ۔ باقی کام میں خود کر لوں گی۔“

”آنی! میری انگلی اور انگلا ٹھیک ہو گیا تو میں سارا کام کروادوں گا۔“

”بگے، انگوٹھا ہوتا ہے۔“ زمین کو ہنسی آ گئی۔

”نہیں، انگلا ہوتا ہے۔“ وہ کہہ کر بھاگ گیا۔ ہنسی روکتی زمین نے ماں کو دیکھا۔ وہ چاول ابال رہی تھی۔

”ایک کئی رکھ کر ابالنے ہیں۔“ زمین نے آہستہ سے بتایا۔

”پتا ہے مجھے۔“ شمینہ تڑخ کر بولی۔

”کب تک ناراض رہیں گی امی!“ زمین کے لہجے میں بے بسی در آئی۔

”وہ بعد میں آیا ہی نہیں۔“ شمینہ نے چیخ میں چاول نکال کر زمین کے سامنے کیے۔

”وہ گھر نہیں ہے۔“ زمین نے چاول دیکھے اور چولہا بند کر دیا۔
”علاقہ تو ہمیں چھوڑ گیا؟“

”وہ گاؤں گیا ہے۔ اپنی امی اور بہن سے ملنے۔“
”تم سے کس نے کہا؟“ شمینہ چونکی۔ دل میں امید سی جاگی، کیا وہ دونوں اب بھی رابطے میں ہیں۔
”مجھے لگتا ہے۔“ زمین نے نظریں چرا میں۔

”اس کے دل کی ساری خبر رہتی ہے تو پیچھے کیوں ہٹ گئی تھی۔“
زمین دل گرفتہ ہو گئی۔ وہ کچھ بھی کرے، ماں اس کی بات نہیں سمجھ پاتی تھی۔
”امی! اس بات کو جانے دیں، مجھے اپنے گھر کے لیے کچھ کر لینے دیں۔“
”جو دل میں آتا ہے کر۔“ شمینہ غصے سے اٹھ کر چلی گئی۔

”وقت کے ساتھ سمجھ جائیں گی، کوئی کسی کا بوجھ ساری زندگی نہیں اٹھا سکتا۔ اپنے بوجھ خود ہی اٹھانے پڑتے ہیں۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔

وہی کالونی کی آخری سڑک، جہاں تین اطراف کو ذیلی سڑکیں نکلتی تھیں۔
وہ کونے میں آخری کوٹھی کے سامنے پھیلے نیم کے درخت کے نیچے ریڑھی کھڑی کر کے سانس لینے لگی۔
آج طبیعت میں کسل مندی اور اکتاہٹ تھی۔ تب ہی کسی طرف دھیان نہ تھا۔
”ایک پلیٹ دینا۔“ سفید چادر والی عورت اٹھ کر پاس آئی۔

زمین نے کمان دار ابروؤں کو دیکھا۔ اس کے گال عجیب سے سرخ تھے۔
(چارکس کریموں کا کرشمہ)

”میں اکثر تمہیں یہاں بیٹھے دیکھتی ہوں، کام کیوں نہیں کرتی ہو۔“
”کام ہی تو کرتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔ چادر کے اندر سے پھلی نکالی جو نوٹوں سے بھری تھی۔
”مانگنا کام ہوتا ہے؟“

”چل اتنی معصوم نہ بن۔ چار دن مشقت جھیل لے، کتنا کمالے گی۔ آخر میں یہی کچھ کرنا پڑے گا۔“
زمین نے جھرجھری لے کر جلدی سے بریانی اسے تھمائی۔ نوٹ ہاتھ میں لیا تو کراہیت سی محسوس ہوئی۔
”یہ حلال ہے یا حرام۔“ وہ مجھ سے پڑ گئی۔

”پاگل، اللہ تو سب کو رزق دیتا ہے اور تمہاری تو محنت کی کمائی ہے۔“ وہ اپنے ہی سوالوں جوابوں میں گم تھی۔ جب اسٹیڈیم میں بیچ ختم ہو گیا۔

لڑکوں کا ٹولہ سامنے سے نمودار ہوا۔ چہلیں کرتے، ایک دوسرے کی گردنیں دبوچے، ہارنے والوں کا ٹھٹھا اڑاتے، زمین نے دوپٹہ مزید پھیلا یا۔ تب ہی کسی کی نظر ریڑھی پر پڑی۔
”تیری طرف پلینٹی بنتی ہے، کھلا بریانی۔“

”دفع ہو، چنوروں۔ ہر بار ہاروں بھی میں اور کھلاؤں بھی میں۔“
”ایسے بیچ کر نہیں جائے گا۔“ وہ سڑک پار کر کے سیدھے اسی کی سمت آ گئے۔
زمین کو ہلکی سی گھبراہٹ نے گھیر لیا۔ بد مزہ سے لڑکے تھے، اگر بے ہودگی کر بیٹھتے۔
”سسر! یہ پتیلا کتنے کا ہے؟“ ہارنے والے کا لہجہ حوصلہ افزا سا تھا۔ اس پر لفظ سسر.....

”ہاں نہیں، امی کے جہیز کا ہے۔“ گھبراہٹ میں منہ سے نکلا۔

ایک سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ان کے ہتھکڑیوں نے درخت پر بیٹھے کو تے بھی اڑا دیے۔ زمین کی ہتھیلیوں پر

پسینہ اتر آیا۔ وہ خواہ مخواہ ریڑھی پر رکھی چیزوں کو چھیڑتی آگے بڑھنے کا سوچنے لگی۔
 ”میرے پوچھنے کا مطلب تھا، یہ بریانی کا پتلا کتنے کا ہے۔ مطلب یہ ساری بریانی کتنے کی ہے؟“ اس
 لڑکے نے سب کو گھور کر سہولت سے دوبارہ پوچھا۔

یہ حساب تو زمین نے لگایا ہی نہ تھا۔ اسے تو فی پلیٹ کا حساب تھا۔ پھر عقل نے بروقت کام کیا۔ اس نے
 جتنی رقم بریانی بنانے میں خرچ کی تھی۔ اس پر اپنا منافع رکھ کر بتا دیا۔
 ”ساری دے دو۔“

”ساری دے دوں گی تو بیچوں گی کیا؟“
 ”سسر! آپ بیچ ہی رہی ہیں۔“ اس نے بے حد تحمل سے یاد دہانی کروائی۔
 ”ہاں، پتلا اتنیس دوں گی۔“

”بالکل اماں کے جہیز کا ہے۔“ اس نے بردباری سے سر ہلایا۔ ساتھ ہی ایک لڑکے کو اشارہ کیا کہ وہ گھر
 سے برتن لے آئے۔ شاید اس کا گھر اسی گلی میں تھا، تب ہی بھاگ کر برتن لے آیا۔ بریانی برتنوں میں منتقل
 ہونے تک زمین کا ننھا سادل دہلتا رہا۔ اگر انہوں نے پیسے نہ دیے تو وہ کیا کر پائے گی۔

مگر اس لڑکے نے پیسے بھی دیے اور جاتے جاتے بریانی کی تعریف بھی کر گیا۔ چکھ جولی تھی۔
 زمین کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ میں ساری بریانی بک گئی تھی، وہ بھی منہ مانگے داموں۔ اس
 نے سرشاری میں ادھر ادھر دیکھا۔ دوسری طرف فروٹ والا کھڑا تھا، جس کی ریڑھی پر بس انگور ہی بچے تھے۔
 زمین نے زندگی میں پہلی بار پورے ایک کلو انگور خریدا۔

”آپی!“ دروازہ ٹھہرنے لگا تو پریشانی سے منہ کھل گیا۔
 ”کیا ہوا، بریانی نہیں بکی؟“

”ساری بک گئی۔“ زمین نے جوش میں بتایا۔

”اتنی جلدی۔“ وہ لڑکیاں ڈالتے ریڑھی اندر لے آئے۔

شمینہ بچوں کے دھونے والے کپڑے جمع کر رہی تھی، زمین نے جھکی ڈال کر اس کا منہ چوم لیا۔ کپڑے
 ہاتھ سے لے کر شب میں پھینک دیے۔

”میں آگئی ہوں نا، دھو دوں گی۔ آپ بچوں کو انگور بانٹ دیں۔“

شمینہ مزید غصہ نہ دکھاسکی۔

”آپا، اتنے انگور۔“ کتنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ترستے تھے ان کے بچے۔ یہ ننھی منی خوشیاں جگنوؤں کی
 طرح ان کی ہتھیلیوں پر جگمگا رہی تھیں۔ صرف اور صرف زمین کی ہمت کی وجہ سے۔ شمینہ نے زمین کو دیکھا، وہ
 کپڑے سرف میں بھگور رہی تھی، اس نے مڑ کر بچوں کو دیکھا۔

طلحہ پلیٹ میں انگوروں کا گول دائرہ بن رہا تھا۔ حذیفہ ایک آنکھ بند کر کے دوسری کے پاس دانہ رکھے سورج
 کی روشنی میں نجانے کیا کھوج رہا تھا۔

فضہ کے منہ میں ایک دانہ تھا۔ وہ اسے چبا نہیں رہی تھی، بس چوس رہی تھی اور ٹھہرین اپنے حصے سمیت
 غائب تھی۔

ان کے بچے کھانے سے پہلے ان کے ذائقے اور لطف کو پوری طرح محسوس کرنا چاہتے تھے۔ آنکھ میں
 آئے پانی کو پیتے شمینہ نے زمین اور انور حسین کا حصہ ڈھک دیا اور اندر چلی گئی۔
 ”کیوں بچو! مزا آیا؟“ زمین کپڑے بھگو کر آئی۔

”بہت مزا آیا آیا!“
 زمین درمیان میں بیٹھ گئی۔ طلحہ حذیفہ کو دائیں بائیں بٹھالیا۔
 ”فضہ! تم کیوں نہیں کھارہیں؟“ زمین پر آلتی پالتی مارے پیالی گود میں رکھے، اس نے بہت کم انگور کھائے تھے۔
 ”آپی! میں اسکول لے کر جاؤں گی۔“ لہجہ باکس تو ان کے پاس نہیں تھا مگر جو ڈباوہ روٹی کے لیے لے کر جاتے تھے، اسے بھرنے کے خیال سے ان کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔
 ”صبح تک اپنے دل کو مت مارو میری جان! میں دوبارہ لے آؤں گی۔“
 ”پکا؟“
 ”ہاں، پکا۔“

تب ہی سرین بھاگی آئی۔ اس نے سارے انگور دھاگے میں پرو کر گلے میں ڈال لیے تھے۔ وہ اچک کر چار پائی پر کھڑی ہو گئی۔
 ”میں ایک شہزادی ہوں اور یہ میرا ہار ہے۔“
 سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ طلحہ نے اس کے ہار پر جھپٹا مارنا چاہا مگر زمین نے بروقت کھینچ کر گود میں دبا لیا۔

”شہزادی صاحبہ آپ کا شہزادہ کہاں ہے؟“ زمین نے شرارت سے پوچھا۔
 ”وہ تو مینڈک بن گیا تھا۔“ حذیفہ کو کہانی یاد آ گئی۔
 ”اچھا، اچھا..... لڑائی نہیں۔ ایک اور مزے کی بات سنو۔“ زمین نے ٹوک کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔
 ”میں نے فیصلہ کیا ہے، ہم اتوار کو پارک جائیں گے۔“
 ”نمو آپی زندہ باد۔“ انہوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ زمین کا دل سکون سے بھر گیا۔ زمین نے سوچ لیا تھا ہر وہ خوشی جو ان بچوں سے روٹھ گئی تھی، وہ ان کے دامن میں بھر دے گی۔ وہ زندگی کو ان کے لیے بوجھ نہیں بننے دے گی۔
 ”اچھا، اب جلدی سے کتابیں لے کر آؤ، میں پڑھا دوں۔ آج میرے پاس وقت ہے۔“

☆☆☆

”یہ نمو کیا ایکشن میں کھڑی ہو گئی ہے۔“ شور دیوار پار بھی گیا تھا۔ افشاں کی امی نے ازراہ مذاق پوچھا تھا مگر بیسن پر ہاتھ منہ دھوتے افشاں کے بھائی نے زہرا گلا۔
 ”تب ہی کالونی میں لڑکوں کا مجمع لگائے کھڑی تھی۔“
 ”کیا مطلب بھائی؟ کیا کر رہی تھی.....؟“ افشاں تولیہ لے کر آئی۔
 ”چاول بیچ رہی تھی اور اس نے کیا کرنا ہے۔“ اس نے تولیہ جھپٹا۔
 ”تو اس میں بری بات کیا ہے۔ محنت کر رہی ہے.....“ افشاں سائیڈ لیے بغیر رہ نہ سکی۔
 ”اماں! سن رہی ہو اس کی باتیں..... اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ یہی حالات رہے تو میں نے اسے کالج نہیں جانے دینا، لڑکوں کے ساتھ ٹھٹھے اڑا کے کون سی محنت ہو رہی ہے۔“
 وہ تن فن کرتا۔ چلا گیا۔

”جب پتا ہے کہ اس نے بات نہیں سنی، کرتی کیوں ہو؟“ اماں نے لتاڑا۔
 ”سب کو پتا ہے، زمین ایسی لڑکی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اس کے خلاف محاذ کھولا ہوا ہے۔ میرے بچپن کی سہیلی

چھڑوا دی۔“

”اچھا، میری ماں، مل لیا کر، وہ کون سا سارا دن گھر میں ہوتا ہے۔“ انہوں نے جان چھڑائی۔
”کس منہ سے ملوں؟“

تار سے کپڑے اتارتی زمین نے یہ سارا مکالمہ دیوار پار سنا۔

”جو پاس ہے اسی سے ملے گی، نیا کہاں سے دوں؟“ اماں زچ ہو گئی۔

زمین نے کپڑے اتارے اور کمرے میں رکھ کر چھت پر چلی آئی۔ شام جھک کر تاریکی کو چھونے لگی تھی۔
وہ خاموشی سے منڈیر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ سارا بچپن افشاں کے ساتھ یہیں بیٹھ کر بائی پاس سے گزرتی بسوں کو گنتے گزراتھا۔

”پاگل؟ میرے لیے لڑ رہی ہے۔“

اس کے سامنے پالک کے کھیت اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ بائی پاس سے گزرتی ٹریفک کی بتیاں اسے آنکھ مارنے لگیں۔

خواب تعبیر کر دکھائیں گے

راتے بھی تراشیں گے اسے

اور سب منزلیں سنواریں گے

زندگی ہم تجھے گزاریں گے

وقت کرتا ہے فیصلہ اکثر

کون رہن ہے، کون ہے رہبر

خوش نما پھولوں کی مہک باقی

ڈھل گیا وقت، ہے کسک باقی

نفسی! تجھ پر خود کو داریں گے

زندگی ہم تجھے گزاریں گے

(انعم بھیل)

وہ جسے سوچنا نہیں چاہتی تھی گویا چپکے سے ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”جب چھوڑ ہی گئے ہو تو پوری طرح چھوڑ جاؤ۔ کیوں بار بار آ جاتے ہو راستہ روکنے۔“

”میں تو جانا ہی نہیں چاہتا تھا، تم نے نکال باہر کیا۔“ زمین کے لہجے کی بے بسی پر وہ شکوہ کناں ہوا۔ ”جب

حوصلہ نہیں تھا تو دامن کیوں چھڑایا؟“

”نا کہ تم ان سے جاملو جن کا تم پر سب سے زیادہ حق ہے۔“ زمین نے احتجاج کرتے دل کو یکسر نظر انداز

کرنا چاہا۔ مگر دل ضدی بچہ بنا لڑنے کھڑا ہو گیا تھا۔

”اے تم انتظار کا کہہ سکتی تھیں۔“

”مجھے تو خود نہیں پتا، میں آنے والے سالوں میں کہاں کھڑی ہوں گی۔ اسے کیسے روک لیتی۔“

”نہ خود خوش رہو گی، نہ وہ۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔ چلو، وعدہ کرتی ہوں، واپس آ گیا تو روک لوں گی۔“ ان کی انا اور خود داری نے چپکے سے

ہار مان لی۔

”کیونکہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔“

”ہاں کرتی ہوں..... بہت زیادہ کرتی ہوں۔“ اس نے چلتی ہواؤں پر اعتراف محبت باندھا اور تاریک رات کے پاس امانتار کھوادیا تھا۔

☆☆☆

بچوں نے پارک میں تھر تھلی ڈال دی تھی۔ انہوں نے وہ سارے جھولے لیے تھے جن پر ٹکٹ نہیں تھا۔ وہ انور حسین کو بھی ساتھ لے آئی، جو اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کے بچوں کو بھی جھولے دے دے کر خوش ہو رہا تھا۔

زمین بچ پر بیٹھی آتی جاتی فیملیز کو دیکھ رہی تھی۔ فضا خوشی اور جوش میں دوبار آ کر زمین کا منہ چوم گئی۔

”آئی! آپ بہت اچھی ہیں۔“

بچے گلی محلے میں کھلتے ہی رہتے تھے مگر اس طرح پارک آنا بہت کم ہوتا تھا۔

”میری گڑیا۔ ساری خوشیاں پیسے کی محتاج نہیں ہوتیں۔ جاؤ، مزے کرو۔“ اس نے فضا کے بال سمیٹ کر پونی کس دی تو وہ واپس بھاگ گئی۔

”اپنی ماں کو بھی ساتھ لے آئی۔ ہر وقت سڑی ہی رہتی ہے۔“ انور حسین پاس آ بیٹھا۔ اس کی سانس پھولی اور ماتھے پر پسینہ تھا۔ زمین نے دوپٹے کے پلو سے پسینہ صاف کیا۔

”ابنیں آپ نے کہنا تھا ابو.....“

انور حسین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم بہت محنت کرتی ہو.....“

”ہاں..... بہت.....“

”تم بہت اچھی بیٹی ہو۔“

”شکریہ، ابو جی.....“

”لیکن بیٹیاں بیٹے نہیں بن سکتیں.....“ کبھی کبھی وہ یوں بات کرتا جسے بہت ہوش مند ہو۔

”ابنیں بیٹے بننے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ بیٹیاں رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں۔“

پتا نہیں اپنی ذات پر فخر کا احساس وہ بھی بغیر کسی احساس کمتری کے..... خود کو تسلیم کرنا..... یہ سب زمین کے اندر کہاں سے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ حالات کے ساتھ بہنے والوں میں سے نہیں۔ حالات کا رخ اپنے حق میں کرنے والوں میں سے تھی۔ کم از کم کوشش تو کر ہی سکتی تھی۔

”میں تھک جاتا ہوں۔“ انور حسین نے داڑھی کھجائی۔ ”فارغ رہ رہ کر..... میں کام کرنا چاہتا ہوں، لیکن میرے پاس کام نہیں ہے۔“

”کرنے والوں کے لیے بہت کام ہوتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ چلا کریں۔“ زمین نے بڑی امید کے ساتھ باپ کا ہاتھ پکڑا۔

”میں چلا تو جاؤں، مگر.....“ اس کی نظر پارک کی جالی سے باہر گئی۔ جہاں سے پولیس کی گاڑی معمول کا راؤنڈ لے کر جا رہی تھی۔ انور حسین کا رنگ فق ہو گیا۔

”پولیس آ جاتی ہے۔“

وہ بھاگ کر بچ کے پیچھے چھپ گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جو انور حسین کے دماغ کے کسی کونے میں خوف بن کر بیٹھ گیا تھا۔ زمین نے گہری سانس لے کر خود کو تسلی دی۔

”پولیس چلی گئی ہے ابو جی۔“

اس نے بچ کے پیچھے جا کر انور حسین کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔
”چلی گئی؟“

”وہ آپ کو نہیں ڈھونڈ رہے تھے۔“

”سچ میں.....“ وہ زرا نفی کی طرح گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ زمین بچوں کو آوازیں دینے لگی۔

☆☆☆

وہ ریڑھی لے کر واپس آرہی تھی جب اس نے فرخ کو دیکھا اور نظر انداز کر گئی۔ اسے کسی کے لیے رکنے یا مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خاص طور پر وہ لوگ، جنہوں نے اسے اور اس کے کام کو حقیر سمجھا۔ اور اس کا نظر انداز کرنا فرخ کو کھل گیا۔

”سنا ہے بڑا کام جمالیا ہے تم نے.....“

”اللہ کا شکر ہے۔“ زمین نے سادگی سے کہا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ زمین نے ریڑھی روک دی اور خود بھی کھڑی ہو گئی۔

”کون سی بات؟“ اب وہ براہ راست اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم نے مراد سے شادی کیوں نہیں کی؟“ فرخ واقعی الجھا ہوا تھا۔

”میری مرضی.....“

”کس آسرے پر اس کو چھوڑ دیا؟“

”اللہ کے آسرے پر کہ اگر وہ میرا نصیب ہوا تو آجائے گا۔“

”وہ تو تمہارا نصیب بننے جا رہا تھا۔“

زمین نے گہری سانس لے کر ریڑھی پر اوندھے پڑے برتنوں کو دیکھا۔

”یہ بہت مشکل کام ہے فرخ! پہلے چولہے کے سامنے کھینا پڑتا ہے۔ پھر بھاری ریڑھی کو گھسیٹ کر سڑک

تک آنا پڑتا ہے۔ لوگوں کی نظریں، باتیں برداشت کر کے سارا سامان بیچنا پڑتا ہے۔ رات کو میرے کندھے

اتنے دکھتے ہیں کہ بعض اوقات رات کو نیند بھی نہیں آتی۔“

فرخ اکتا گیا۔ پتا نہیں وہ کون سی کہانیاں سن رہی تھی۔

”اس ساری مشقت کے بعد میں ہر گز نہیں چاہوں گی کہ مراد کی آنکھوں میں حقارت ہو۔“ اس نے ہلکا سا

توقف کیا اور جملہ پورا کیا۔ ”تمہاری طرح۔“

فرخ چونک گیا تو وہ جانتی تھی۔

”جاؤ، کوئی تمہیں میرے پاس کھڑا دیکھ کر کیا سوچے گا۔ خواہ مخواہ بے عزتی ہو جائے گی اگر اس نے ایک

محنت کش لڑکی کے پاس کھڑا دیکھ کر تمہیں اس کا رشتے دار سمجھ لیا۔“

زمین کی زبان دودھاری تلووار ہو چکی تھی۔ کانتی تھی مگر بہت پیارا اور تحمل سے۔ فرخ نے سچ مچ ڈر کر ادھر ادھر

دیکھا۔ زمین کو ہنسی آئی اور اس کی ہنسی پر فرخ کو غصہ۔

”کل بہنیں گھر آرہی ہیں۔ امی کہاں کھیتی رہیں گی۔ تین کلو چاولوں کی بریانی بنا کر دے جانا۔“ وہ زمین کو

اس کی اوقات یاد دلا کر جانے لگا۔

”تم کچھ بھی کہو فرخ! مجھے اپنی محنت کے کام میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ خدیجہ خالہ سے کہنا اور بھی کوئی

کام ہوا تو بتا دینا۔“

اس نے ریڑھی کو دھکا لگایا۔ اور چل دی۔
فرخ کے اندر طیش کی لہر اٹھی۔ مگر وہ رکا نہیں، تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ وہ خود کو کتنا بھی مضبوط ظاہر کرتی، ایسا نہیں کہ اسے دکھ نہیں ہوتا تھا۔ تب ہی تو پورا راستہ اس کی آنکھیں بھٹکتی رہیں۔

☆☆☆
اس نے بڑی محنت سے اور دھیان لگا کر بریانی بنائی تھی۔ کہیں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ کیا پتا اس نے یونہی کہہ دیا ہو۔ خدیجہ خالہ رہیں یا نہ رہیں۔ ریڑھی سیٹ کرنے تک وہ متذبذب تھی۔
”خیر، نہ رہیں گی تو کون سا بکے گی نہیں۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔
بچے کو نے میں کپڑا بچھائے سبق رٹنے میں مصروف تھے۔ شمرین انہیں سنبھال لیتی تھی۔ زمین کی دیکھا دیکھی ہر کوئی اپنے اپنے سر کوئی نہ کوئی ذمہ داری لینے لگا۔
”لوگوں کے گھر روز روز بریاں بنتی ہیں، مجال ہے کوئی چکھا ہی دے۔“
افشاں اپنے صحن میں با آواز بلند بڑبڑا رہی تھی۔
زمین کو ہنسی آگئی۔

پلیٹ بھر کے دیوار پر رکھی اور دیوار بجا دی۔
منٹوں میں پلیٹ دیوار سے غائب ہو گئی۔
”اللہ کھلانے والے کے رزق اور کمائی میں برکت دے۔“
افشاں نے بڑے بوڑھوں کی طرح دعا دی تو زمین نے صدق دل سے آمین کہا۔
”آپا! پیچر فیس مانگ رہی تھیں۔“ شمرین نے یاد دلایا۔
”ان شاء اللہ واپسی پر دوں گی۔“ اس نے بسم اللہ کہہ کر دروازہ بجایا۔ دروازہ فرخ نے ہی کھولا تھا۔
ایک لمحے کو پزل ہو گیا۔ اس کے عقب میں بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔
”اب یہ نہ کہنا تم نے مذاق کیا تھا۔“ زمین مسکرائی۔
”مجھے لگا، تم نہیں لاؤ گی۔“ فرخ نے راستہ دیا۔
”کیوں بھی! اس طرح آرڈر واپس کرنے لگی تو میرا تو کام چل گیا۔ میں نے یہ تھوڑی دیکھا ہوتا ہے کس نے آرڈر کیا ہے۔ میرا تو کام ہے۔“ وہ پتیلا اٹھانے لگی۔
”میں اٹھاتا ہوں۔“ فرخ کو شاید شرم آگئی تھی۔
”نہیں بھی، بوجھ اپنا اپنا۔ کچن میں لے جاؤں؟“
”ہاں.....“

وہ بھاری پتیلا اٹھا کر کچن میں لے آئی جہاں خدیجہ خالہ چائے بنا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔
زمین نے سلام کر کے پتیلا کاؤنٹر پر رکھا۔
”زمین! تم.....“

”آپ تو طے ہی نہیں آتیں، اس بہانے سوچا میں مل آتی ہوں۔“
”ہاں جس وہ گھٹنے کا درد بہت بڑھ گیا ہے۔“ وہ شرمندہ سی وضاحتیں دینے لگیں۔ زمین نے یقین کر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے بدگمانی سے منع کیا ہے اگر وہ کہہ رہی تھیں تو یقیناً یہی وجہ ہوگی۔
”تمہارا بل.....“ زمین نے ایک پرچی فرخ کی طرف بڑھائی کیونکہ آرڈر اسی نے دیا تھا۔ فرخ نے چور نظروں سے ماں کو دیکھا۔ انہوں نے اشارہ کیا تو پرچی لے کر اندر چلا گیا۔

”بیٹھو، چائے پیو۔ بس بن ہی گئی ہے۔ عالیہ اور آصفہ آئی ہوئی ہیں۔“

”چائے نہیں پیوں گی۔ مجھے ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔“

”گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ گزارا تو اچھا ہو رہا ہے نا۔“

”بہت اچھا ہو رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ وہ اب بھی روکھی سوکھی کھاتے، باقی خرچوں کے لیے پیسے بچاتے رہتے تھے۔ مگر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔

”پڑھائی کس کی.....؟“

”نہیں..... نہیں..... کالج میں داخلہ لوں گی۔ اب ساری زندگی بریانی تو نہیں پیوں گی۔“

فرخ پیسے لے کر آیا۔

”خالہ! یہ تو راستہ ہے، میری منزل نہیں۔“ اس نے پیسے پکڑے اور اپنے عنابی کرتے کی سائیڈ والی جیب میں ڈال لیے۔

”اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ زلٹ کے بعد فرخ بھی لاہور چلا جائے گا۔ وہیں یونیورسٹی میں داخلہ لے گا۔“

”اچھی بات ہے خالہ! کوئی اور کام ہو تو بتائیے گا۔“

”ضرور..... میں لگاؤں گی چکر۔“

”جی.....“ وہ اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

خدیجہ نے ایک نظر فرخ کو دیکھا۔ وہ نجانے کس سوچ میں تھا۔

”تمہیں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں.....“ وہ اپنے احساسات شمر نہیں کر سکا۔ اس نے زمین کو حقیر سمجھا تھا مگر زمین نے اپنے رویے سے ثابت کیا تھا کہ وہ خود کو حقیر نہیں سمجھتی۔

☆☆☆

دروازہ بچوں نے کھولا اور اس سے آگے زمین کا کام ختم ہو گیا کہ وہ خود ہی ریڑھی گھسیٹ کر اندر لاتے تھے۔ صحن میں پڑی ٹھڑیاں دیکھ کر وہ خوش ہو گئی۔

”کون آیا ہے؟“

”ماموں سہیل آئے ہیں۔“ کورس میں جواب آیا۔

”خبردار جو ماموں کی لائی چیزوں کو ہاتھ لگایا۔“

وہ انہیں تنبیہ کرتی اندر کی طرف بڑھی مگر دروازے میں ہی رک گئی۔ ماموں منہ پر صافہ رکھے زار زار رو رہے تھے۔ ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر شمیمہ اپنی سسکیاں دبا رہی تھی۔ کمرے کی آخری چارپائی پر انور حسین خاموش لیٹا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے بتایا ہی نہیں۔ ایک پیغام ہی بھجوا دیتیں شمیمہ!“

”آپ کیا کر لیتے..... ہم پر تو قیامت ٹوٹ گئی تھی۔ ایک کے بعد ایک مصیبت..... انور حسین کا دماغ ایسے ہی تو نہیں الٹ گیا۔“

زمین نے پاس بیٹھ کر ماموں کے کندھے دبانے شروع کیے تو انہوں نے اسے بازو کے گھیرے میں لے کر پیشانی چوم لی۔

”گزارا کیسے ہوتا ہے؟“

شمینہ نے بوکھلا کر زمین کو دیکھا۔

”ٹیوشن پڑھالیتی ہے زمین۔“

”گزارا ہو جاتا ہے؟“ سہیل نے حیرت سے زمین کو دیکھا۔

”جی.....“ شمینہ نے گردن جھکالی۔ زمین نے چپ سادھ لی۔ ماں نہیں بتانا چاہتی تھی۔

سہیل نے گہری سانس لے کر چہرے پر ہتے آنسو صاف کیے۔

”جاؤ۔ ماموں کے لیے کھانے کا بندوبست کرو۔“ شمینہ نے زمین کو اٹھایا۔

”انور حسین تو یہاں ہے، ریزہ می کون لے کر آیا ہے۔“

سہیل کی نظر محن میں پرواز کر گئی۔ جہاں سے بچے سامان اتارے تھے۔ شمینہ اور زمین نے ایک دوسرے کو

دیکھا۔

”آپی.....“ چائے لے کر آتی ثمرین کچھ کہنے لگی تھی کہ شمینہ نے ٹوک دیا۔

”دھیان سے، چائے نہ گرا دینا۔“ اور جلدی سے کپ پکڑ لیا۔

زمین اس کا بازو پکڑ کر باہر لے گئی۔

”محلے کے ایک لڑکے سے بات کی ہے۔ وہی شام کو حساب کر جاتا ہے۔“ جھوٹ بولنا بہت مشکل تھا۔ مگر

اپنا بھرم عزیز تھا یا بھائی کا خوف۔ وہ سچ نہ بتا سکی۔

”خالو منصور کے بیٹے کی شادی ہے۔ اسی کا بلا والا یا تھا۔ سوچا، خود جاتا ہوں، ساتھ لے جاؤں گا۔“

”جی، پتا چلا تھا۔“

”تیار کر لی.....“

”تیار تو.....“ شمینہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”اچھا..... اچھا تیاری تو وہاں بھی ہو جائے گی۔ آٹھ دس دن بھائی کے گھر رہ لینا۔“

”نہیں..... نہیں۔ تیاری تو ہے مگر ارادہ نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”انور حسین ٹھیک ہوتے تو بچوں کو ان کے پاس چھوڑ کر آ جاتی۔ اب اتنا میرے لے کر کہاں جاؤں گی۔“

”حد ہو گئی۔ بچے اپنے ننھیال میں رہنے نہیں جاتے۔ بس تم ساتھ جاؤ گی اور اپنے بھائی کے گھر ٹھہرو

گی۔“

سہیل نے بات ختم کر کے چائے کی پیالی اٹھالی۔

”امی! نہیں جاتے۔ بہت خرچا ہو جائے گا۔“

زمین اور شمینہ بچن میں سرگرمیوں میں گم تھیں۔

سہیل ماموں بچوں کو جمع کر کے کہانی سنارہے تھے۔

”میں نے تو بہت منع کیا۔ مگر وہ مان ہی نہیں رہے۔ کہتے ہیں، سارا خرچا خود کر لوں گا۔ حالانکہ میں نے

خرچے کا نام بھی نہیں لیا تھا۔“

”تو اب کیا کریں گے؟“

”جانا پڑے گا۔“ پھر کسی خیال کے تحت چونکی۔ ”نمو! تمہارے ماموں کو نہیں پتا چلنا چاہیے۔ وہ تو لڑکیوں

کا گھر سے نکلنا ہی پسند نہیں کرتے۔“

”ٹھیک ہے امی.....“ زمین ہر محاذ پر نہیں لڑ سکتی تھی۔

”بس کل تم کہیں نہ جانا۔ میں کہہ دوں گی، ہم شادی سے ایک دن پہلے آئیں گے۔“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے آرڈر دینا ہے۔ باجی کے جاننے والوں کا آرڈر ہے۔“
 ”تو پھر۔“

”ماموں کو مصروف کر دیجیے گا، میں ٹیوشن کے بہانے چلی جاؤں گی۔“
 ”چلو ٹھیک ہے۔“ ثمنینہ نے تذبذب سے سر ہلایا۔
 ”ہاں بھئی، وہ لڑکا کتنے بچے آتا ہے۔“ کہانی سناتے سناتے ماموں سہیل نے درمیان میں ہی پوچھا۔
 ”کون سا لڑکا؟“

سہیل کا خیال تھا وہ خود اس سے مل کر حساب کتاب دیکھے گا۔ انور حسین کی تو حالت ایسی ہے نجانے وہ کیا بیچتا اور کیا لاتا ہوگا۔ کہیں ڈنڈی نہ مار جاتا ہو۔
 ”وہی جو ریڑھی لے کر جاتا ہے۔ اور کیا بیچتا ہے؟“
 ”برمیانی.....“ حذیفہ نے چٹخارہ بھرا۔
 ”واہ..... صبح ملوں گا اس لڑکے سے۔“ انہوں نے تکیہ سیدھا کیا، گویا اب لیٹ جانے کا ارادہ تھا۔
 ”کون سا لڑکا؟“ سوال دوبارہ ہو گیا۔
 ”جو ریڑھی لے کر جاتا ہے۔“ وہ لیٹ گئے۔
 ”ریڑھی تو آئی لے کر جاتی ہیں۔“ قصہ ختم۔ بھانڈا منٹوں میں پھوٹ گیا۔
 ”نرمن؟“ وہ کرنٹ کھا کر سیدھے ہوئے۔

☆☆☆

سارا سامان تیار تھا۔ مگر ماموں نے قسم کھائی تھی۔ صحن سے نہیں اٹھیں گے۔ وقت تنگ ہو رہا تھا اور نرمن جلے پیر کی لمبی کی طرح اندر باہر پھر رہی تھی۔
 ”امی جی! کچھ کریں۔“ اس نے ماں کے سامنے دہائی دی۔
 خود تو ہر کوشش کر رہی تھی۔ اہتمام سے چائے کمرے میں لگائی، انہوں نے باہر منگوالی۔
 ”ماموں جی! اندر آ جائیں، یہاں تو گرمی ہے۔“ اس نے بہانے سے ثمرین کو بھیجا، ماموں نے اس طرح گھورا کہ وہ بنا جواب سنے بھاگ آئی۔
 ”وہ..... ہم تو ایک دن پہلے ہی آئیں گے۔ اتنے دن پہلے کیسے جائیں بچے اسکول جاتے ہیں اور.....“
 ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جیسا مناسب سمجھو، چلتا ہوں۔“
 ثمنینہ نے بوکھلا کر بھائی کو دیکھا۔
 ”اتنی جلدی..... میرا مطلب ہے ایک دن تو رک جاتے۔ نرمن کے ابو بھی آپ کے آنے سے بہت خوش ہو گئے ہیں۔“

اور یہ سچ بھی تھا۔ انور حسین ساری رات سہیل سے باتیں کرتا رہا تھا۔ نہ خود سویا نہ انہیں سونے دیا۔ بے ربط، لائینی باتیں، کہیں کا سرا کہیں جوڑتا، بس بولتا چلا گیا۔
 ثمنینہ کے روکنے پر بھی وہ نہیں رکے۔ ثمنینہ دل مسوس کر رہ گئی۔
 ”شکریہ امی! مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔“ نرمن اس کے گلے آگئی۔
 نرمن کو بھیج کر ثمنینہ روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ صفائی ستھرائی، برتن کپڑے، کام ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کچھ طبیعت اور پڑ مردہ ہو رہی تھی۔

سارے کام سمیٹ کر وہ صحن میں بچھی چار پائی پر لیٹ گئی۔ حالانکہ وہ اس طرح دن میں کبھی نہیں لیٹتی تھی۔
 ثمرین کے گلے میں درد تھا۔ وہ الاچی چبا کر کمرے میں لیٹ گئی۔ باقی بچے اسکول گئے تھے۔ اتنی گہری خاموشی
 کہ ثمینہ کو وحشت ہونے لگی، تب ہی دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔
 ثمینہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

☆☆☆

زمین خوشی خوشی واپس آئی۔ اسے بڑا آرڈر ملا تھا۔ اسکول میں ٹیچرز کی پارٹی تھی۔ وہ اڑتی ہوئی گھر واپس
 آئی۔ ریڑھی کا کونا بند دروازے سے ٹکرایا۔ یہ آواز سنتے ہی سب دروازہ کھولنے بھاگتے تھے۔ اور دروازہ کھل
 گیا۔ سامنے کھڑے ماموں کو دیکھ زمین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
 ”ماموں.....“

سہیل بڑے صحن کے درمیان جا کر کھڑے ہوئے۔ گھر کے باقی افراد خاموش مجرموں کی طرح سر جھکائے
 کونے کھدروں میں چھپے تھے۔
 زمین نے دروازہ بند کیا اور ڈرتے ڈرتے ماموں کو دیکھا۔ دانت پر دانت جمائے، وہ خود پر ضبط کر رہے
 تھے۔

”کیا ہوا، آج وہ لڑکا نہیں آیا۔“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔
 ”سوری ماموں، لیکن بہت مجبوری میں یہ کرنا پڑا۔“ زمین نے سر جھکا لیا۔
 ”میں نے نہیں بھیجا، خود جاتی ہے۔“ انور حسین نے جلدی سے اپنی صفائی دی۔
 ”ماموں! کوئی بات نہیں۔ میں نے کوئی ساری زندگی ریڑھی تھوڑی لگانی ہے۔ میں تو رکشہ چلاؤں گی اور
 پتا ہے میں نے سیکھ بھی لیا ہے۔“ اس نے جوش میں بتایا۔
 ”نمو.....“ ثمینہ آگے بڑھی۔

”جب نمو آپ کی کام نہیں کرتی تھیں تو ہم کئی دن بھوکے رہتے تھے۔“ ثمرین منمنائی۔
 ماموں آگے بڑھے۔ زمین کو لگا، اسے پھٹر ماریں گے مگر سہیل نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کے بعد
 جو بلک بلک کر روئے تو سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
 ”ماموں اس طرح مت کریں۔“

”میں مر گیا تھا، مجھے کیوں نہ بلایا۔“
 ”اللہ نہ کرے.....“ ثمینہ تڑپ کر بھائی سے لیٹ گئی۔
 ”ماموں! خود کو سنبھالیں۔ میں کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی۔ میری ذرا سی ہمت سے ہمارا گھر چل رہا ہے۔
 بچے پڑھ رہے ہیں۔“

سہیل نے زمین کو پیچھے ہٹا کر صاف سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ بولے تو لہجہ فیصلہ کن تھا۔
 ”سامان باندھو۔“ ثمینہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
 ”تم لوگ میرے ساتھ میرے گھر میں رہو گے۔“
 اندر آئی زمین دروازے میں ہی ساکت ہوئی۔

”لیکن بھیا.....“ ثمینہ نے کچھ کہنا چاہا، انہوں نے بری طرح جھڑک دیا۔
 ”میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں جو اپنی بھانجیوں کو سڑکوں پر رلنے دوں۔ بٹھا کر کھلا سکتا ہوں۔ بس
 رات کے رات سامان باندھو، ہم نے صبح کی ٹرین سے جانا ہے۔ انور حسین کہاں ہے، میں اسے بھی

”سمجھا دوں۔“

شمینہ نے مڑ کر زمین کو دیکھا۔

زمین نے پوری شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔

☆☆☆

زمین نے جھانک کر دیکھا، بچے سوچکے تھے۔ انور حسین خراٹے لے رہا تھا۔ ہر فکر سے آزاد نیند اس پر مہربان ہی رہتی۔ ماموں کروٹ پر کروٹ بدل رہے تھے۔ اور شمینہ کی چار پائی خالی تھی۔ زمین دے پاؤں چلتی ہوئی گھرے میں آگئی۔ آہٹ پر شمینہ نے مڑ کر دیکھا اور دوبارہ ٹرنک پر جھک گئی۔ جہاں ان سب کے نئے کپڑے رکھے تھے۔ زمین کا دل ڈوب گیا۔

”تو کیا امی نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

”امی! کیا کر رہی ہیں۔“

”تیاری۔“ جواب مختصر مگر ہلادینے والا تھا۔

”آپ نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

شمینہ خاموشی سے کپڑے الٹ پٹ کرتی رہی۔

”امی جی! اس طرح مت کریں۔ ہم اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں۔ ہمارا گھر ہے۔ میرا کام ہے۔ بچوں کے اسکول.....“ زمین حواس باختہ سی بولے گئی۔ شمینہ مڑی۔

”ان حالات میں اچھا نہیں ہم اپنے رشتے داروں کے پاس رہیں؟ رشتے دار بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں۔“

”مجھے سہارا ہی لینا ہوتا تو مراد.....“ آج کتنے دنوں کے بعد اس کے لبوں نے مراد کا نام چھوا تھا۔ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

”اب پچھتا رہی ہو.....“ شمینہ نے پوچھا۔

”نہیں.....“ زمین نے تیزی سے نفی میں گردن ہلائی۔

”لیکن یہاں سے جا کر ضرور پچھتاؤں گی۔ امی! کوئی کتنے دن ہمیں بٹھا کر کھلائے گا۔ ماموں کی اپنی فیملی ہے، ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ اور ہم کوئی ایک دو نہیں۔ پورے سات جی ہیں۔ ماموں بٹھا کر نہیں کھلا پائیں گے۔“

”نمو! وہ میرا بھائی ہے اور مت بھولو۔ میں تمہاری ماں ہوں، تم میری ماں نہیں ہو۔ اگر ہمیں کھلا رہی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس گھر کا ہر فیصلہ تم کرو گی۔“

شمینہ کے لہجے کی سختی..... زمین ہکا بکا رہ گئی۔

”امی۔“

”جو بھی تیاری کرنی ہے، کرو۔ میں تھک گئی ہوں نمو!“ وہ جھنجھلائی۔

”امی جی! آپ کا فیصلہ غلط ہے۔“

”دیکھا جائے گا۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ بلکے سے توقف کے بعد زمین بولی۔

”تو ٹھیک ہے، بیٹھی رہو یہیں۔“

ثمینہ نے کھٹ سے ٹنک بند کیا۔ اور کمرے سے نکل گئی۔
 زمین نے خود کو بے بس محسوس کیا۔
 بے حد بے بس۔

☆☆☆

ابھی مشرقی افق پر تاریکی کا راج ہی تھا کہ ثمینہ اٹھ کر تیار یوں میں لگ گئی۔ انور حسین کو بھی اٹھا کر بٹھا دیا۔
 ”اللہ اکبر۔“

مسجد سے مؤذن نے پکارا تو ماموں قرہی مسجد چلے گئے اور انور حسین نلکے کے پاس جا کر وضو کرنے لگا۔ وہ
 ایسا ہی تھا، نماز کی طرف دھیان جاتا تو بنا وقت کی پروا کیے پانچوں نمازیں ایک ساتھ ہی پڑھ لیتا تھا۔ زمین نے
 سراٹھا کر باپ کو دیکھا پھر گردن موڑ کر ماں کو۔ وہ بچوں کو جگا کر ان کے ہاتھ منہ دھلا رہی تھی۔ زمین نے اٹھ
 کر جلدی سے چپل پہنی اور وضو کروانے کے بہانے انور حسین کے پاس جا بیٹھی۔
 ”ابو۔“ وہ کلمہ پڑھنے لگا۔

”ابو جی! ہمیں یہ گھر چھوڑ کر نہیں جانا۔“

انور حسین نے حیرت سے زمین کو دیکھا۔ اور دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ ہاتھوں پر پانی ڈالتے زمین نے
 سرگرمیوں میں اپنی بات جاری رکھی۔
 ”امی ہم سب کو لے کر ماموں کے گھر جا رہی ہیں۔ ہم اپنا گھر، اپنا شہر چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ ہمیں یہیں
 رہنا ہے۔“

وہ سر ہلاتا وضو کرتا رہا۔

”امی نے کہا تو صاف منع کر دینا کہ ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔“ نجانے کس امید کے سہارے وہ باپ
 کا سہارا لے رہی تھی۔
 ”کہہ دوں گا.....“ وہ وضو کر کے کھڑا ہوا۔ آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر شہادت دی۔ نہ جانے کیوں زمین
 کے دل کو اطمینان ہوا۔

مگر جس وقت ناشتے کے بعد بچوں نے خوشی خوشی کپڑے پہننے شروع کیے۔ انور حسین سفید کرتا پہن کر
 سب سے پہلے تیار بیٹھا تھا۔

زمین نے حسرت سے اس گھر کے درود یوار کو دیکھا تو اسے رونا آ گیا۔

ہجرت ہمیشہ مجبوری کا سودا ہوتا ہے۔ ورنہ خوشی سے کون اپنا گھر چھوڑتا ہے۔

”آپی، ہم تو شادی پر جا رہے ہیں۔“ طلحہ اور حذیفہ نے اسے چپ کروانے کو گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
 ”آپ کیوں رو رہی ہیں۔“

”آج اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔“

”قسمت آپ کی سہیلی ہے۔ افشاں آپ کی طرح اس نے بھی آپ کو چھوڑ دیا۔“

”نہیں، اس نے مجھ سے میرا گھر چھین لیا ہے۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ثمینہ کے دل کو کچھ ہوا۔ مگر دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

”میرے بچے کے کھلونے کہاں ہیں؟“

سیکنہ دندنا تاتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ثریا نے الماری کی طرف دیکھا۔ ساری فالتو چیزیں ثریا نے اسی کمرے میں رکھی تھیں۔ اس کی منزل بھی یہی کمرہ ٹھہرا۔ سیکنہ نے الماری کھول کر باکس نکالا۔

”تم نے تو سوچا ہوگا، سیکنہ چلی گئی ہے۔ اب واپس کہاں آئے گی؟“

”میں نے یہی سوچا تھا۔“ ثریا کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”بشیر کی زندگی سے سیکنہ کو نکالنا اتنا بھی آسان نہیں۔ تم لاکھ کوشش کر لیتیں، وہ تب بھی مجھے طلاق نہ دیتا۔ میں اس کے بچے کی ماں ہوں۔“

”میرا دماغ نہ کھا، جا یہاں سے۔“ ثریا بے زار ہو گئی۔ سیکنہ کے لہجے کا غرور اسے زہر لگتا تھا۔

”یہاں مہمان بن کر رہنے نہیں آئی ہو۔ بھول گئی، بشیر نے کیا کہا تھا۔“

(بشیر نے کیا کہا تھا) ثریا نے ذہن پر زور دیا۔ بے عزتی کے احساس سے چہرہ پیلا پڑ گیا۔

”وہ یہاں تمہیں میری خدمت کے لیے لایا ہے۔“ سیکنہ نے دل کھول کر مزا لیا۔

”یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھ سے کچھ سن لے گی۔ تیری خدمت کرنی ہے میری جوتی۔“ ثریا تاؤ کھا کر

بولی۔

”رسی جل گئی، بل نہیں گیا۔ لگتا ہے مار بھول گئی ہو۔“

ثریا نے تلملا کر سیکنہ کو دیکھا۔

”باہر آ کر گھر کی صفائی ستھرائی کر لو۔ میں دوپہر کے لیے کھانا بنا رہی ہوں۔“

وہ حکم جاری کرنی چلی گئی۔

”اللہ کرے کوڑھ ہو کر مرے.....“ ثریا نے دانت پیسے۔ تب ہی اس کا موبائل بجا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ دوسری طرف بشیر تھا۔ اس کے لیے فکر مند۔

”دروازے میں نہیں کھڑی، کمرے میں بیٹھی تمہاری بیوی کے حکم سن رہی ہوں۔“ ثریا ترخ کر بولی۔ جواباً وہ

دل کھول کر ہنسا۔ حالانکہ ہنسنے والی کوئی بات نہیں تھی۔

”کمرے میں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ باہر نکل، کوئی گھر کا کام کاج دیکھ۔“

”کیوں؟ گھر کی مالکن ہے نا.....“

”تو بھی تو گھر کی مالکن ہی ہے۔ اب غصہ تھوک دے میری رانی، رات گئی بات گئی۔ آئندہ نہیں کروں گا۔

اب دیکھ ایک ذرا سی بات پر میرا پیار بھول گئی۔“

ہائے یہ سینے مرد، چار چوٹ کی مار، مار کر پھر پیار کے پھا ہے رکھیں گے اور عورت کو بہلا لیں گے۔

”یہ تیرا بھی گھر ہے۔ پورے حق کے ساتھ رہ۔ شاباش، باہر نکل۔ صفائی ستھرائی کر۔ کھانا بنا۔ شام کو تیرے

لیے تحفہ لے کر آؤں گا۔“

”مجھے نہیں چاہیے تمہارا تحفہ.....“ ثریا کے لہجے کی کڑواہٹ کم ہوئی۔ آواز ڈھیلی ہو گئی۔

”سیکنہ کو دے دوں۔“

”دے دو۔“ ساتھ ہی دل ڈوبا۔ کہیں سچ میں نہ دے دے۔

”یا گل.....“ اس نے ہنستے ہوئے کال کاٹ دی۔

ثریا گواہ اندر نئی انرجی محسوس ہوئی۔

”ایک غلطی میں اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا۔“

ثریا نے بال سمیٹے اور باہر آ گئی۔

سیکنہ بیٹھی مارنگ شود کیھنے کے ساتھ ساتھ سبزی بنا رہی تھی۔
 ثریا نے پورے مالکانہ حقوق کے ساتھ گھر کی صفائی ستھرائی شروع کی۔ سیکنہ زرب لب مسکرائی اور سبزی بنا کر
 کچن میں رکھ دی۔ جس وقت ثریا سالن بنا رہی تھی، سیکنہ تیار ہو کر بچے کو اسکول لینے چلی گئی۔
 بشیر نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا۔
 وہ واقعی یہاں اس کی خدمت کے لیے لائی گئی تھی۔

☆☆☆

نہا کرنے پکڑے پہنے، میک اپ کیا، آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر رونا آ گیا۔ کوئی رونق، کوئی چمک نہیں۔
 اس نے خود کو بہلا تو لیا تھا۔ بشیر کے دیے زخم بھر گئے تھے۔ مگر جو کچھ اس نے زبان سے کہا تھا۔ وہ بھولنے والا
 نہیں تھا۔

وہ بس بشیر کا من پسند کھلونا تھی۔ جسے بشیر نے حاصل کرنا تھا کر لیا۔ اب وہ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک
 کرتا۔ کون تھا اسے پوچھنے والا۔

”نہیں..... نہیں..... مجھے ایسے نہیں سوچنا چاہیے۔ شوہر تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ اس نے گھبرا کر خود کو تسلی
 دی اور لب اسٹک لگانے لگی۔

تب ہی دروازے پر نبل ہوئی۔

ثریا ڈر گئی۔

”اللہ جانے کون آیا ہو؟ نہیں..... نہیں..... میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔“ وہ برآمدے میں آکھڑی ہوئی۔

نبل دوبارہ ہوئی۔

”پتا نہیں کہاں دفع ہو گئی ہے۔ دوپہر سے شام ہو گئی، بچے کے بہانے نکلی ہے، ابھی تک نہیں آئی۔“

”کون ہے؟“

”بجلی کا بل لے لیں.....“

ثریا نے دروازہ کھولا۔ سامنے دکان والا کھڑا تھا جس نے بڑے جذب سے ماشاء اللہ زرب لب کہا تھا۔

”کیا ہے۔“ ثریا کو غصہ آ گیا۔

”بل.....“ اس نے جلدی سے بل سامنے کیا۔

ثریا نے جھپٹ کر اسی رفتار سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اپنا سامنہ لے کر چلا گیا۔ ثریا نے بل دروازے کے

پاس ہی پھینک دیا۔ جیسے کوئی درز میں سے پھینک گیا ہو۔

بشیر آدھے گھنٹے بعد آیا تھا۔

”سیکنہ کہاں ہے؟“

ثریا کو غصہ آ گیا۔ آتے ہی سیکنہ یاد آ گئی۔

”مجھے بتا کر گئی ہے؟ دوپہر کی نکلی ہے۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”چلو، اچھا ہے۔ تم جاؤ اس کے کمرے میں۔“

”میں کیوں جانے لگی؟“ وہ تنک بولی۔

”کیونکہ میں کہہ رہا ہوں۔“ بشیر نے اسے بازو سے پکڑ کر کمرے میں دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا۔

”یہ کیا باگل پن ہے۔“

باہر کچھ لوگوں کے بولنے اور کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ ثریا کھستی ہوئی ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔

آدھے گھنٹے بعد بشیر نے دروازہ کھولا۔

”آ جاؤ، میری جان۔“

وہ تجسس میں اٹھ کر اس کے ساتھ اپنے کمرے تک گئی۔ اس کے کمرے کی چار پائیاں برآمدے میں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ اور کمرے میں سیاہ سنہری پٹی والا بیڈ رکھا تھا۔

”آ..... یہ میرے لیے ہے۔“ ثریا کو خوشی سے جھکا لگا۔

”نہیں..... اس پر سیکنہ سوئے گی۔“

ثریا نے تڑپ کر دیکھا تو ہنس پڑا۔

”یا گل، تیرے لیے ہی ہے۔“

”گھنٹے کا آیا ہے؟“ وہ بھاگ کر بیڈ پر چڑھ گئی۔ ابھی سیکنہ کے کمرے میں اس کا بیڈ دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”میرے نصیب میں چار پائیاں ہی ہیں۔“

”تمہارے نصیب میں، میں ہوں۔ کوئی کمی نہیں رہنے دوں گا۔“

وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

”تم اچھے تو ہو مگر.....“

”اب معاف بھی کر دو۔“ بشیر نے ثریا کے کان پکڑے تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆☆

گلی کا موڑ مڑتے مراد رک گیا۔ یہاں سے جاتے ہوئے سوچ کر گیا تھا کہ لوٹ کر اس کی گلی میں نہیں آئے گا مگر واپسی کا سفر شروع ہوا تو قدم پھر سے اسی طرف اٹھ گئے۔ اسے زمین کی ضرورت تھی۔

وہ انصی کو گھر میں اکیلے چھوڑ کر آیا تھا اور وہ بہت گھبرا رہی تھی۔

”میں بس ابھی آتا ہوں، پانچ منٹ میں۔ تم نہا کر کپڑے بدل لو۔“ مراد اسے تسلی دے کر آ گیا۔

”جانتا ہوں تم نے جو کچھ بھی کہا، بہت غصے میں کہا تھا مگر تمہارا شکر گزار ہوں۔ وہ سب نہ کہتیں تو مراد شاید کبھی لوٹ کر نہ جاتا۔“ وہ گھر کے دروازے کے سامنے آ رکا۔

دستک کے لیے ہاتھ اٹھا مگر جامد ہو گیا۔

دروازے پر تالا لگا تھا۔

مکین جا چکے تھے۔

اس نے حیران ہو کر ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ افشاں نے کھولا۔

”مراد بھائی..... آپ.....“

”یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟“ مراد نے بند گھر کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ کو بتا کر نہیں گئے؟“

”نہیں..... میں تو گاؤں گیا ہوا تھا۔“

”وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ زمین کے ماموں آکر انہیں لے گئے۔“ مراد کے پیروں تلے سے زمین

نکل گئی۔

باقی آئندہ ماہ ابن شاء اللہ

قائتہ رابعہ

پستی چہرہ کا لہر

”دہنی میں کل فیصل آباد آرہی ہوں تو سوچا خوش کریں گے۔ میں نے سوچا پہلے بتا دوں۔ تمہاری تمہاری طرف بھی چکر لگالوں دو چار دن مل بیٹھیں گے، ماضی کو یاد کریں گے۔ اباماں کی روح کو قبر میں توادھر ادھر کی مصروفیات ہی ہزار قسم کی ہوتی ہیں۔“ نفیسہ نے چھوٹی بہن کو سلام دعا کے بغیر ہی بریکنگ



وہ کہتے کہتے رک گئیں۔ میں تو بس یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی ڈیڑھ پونے دو ماہ قبل تو آپ چکر لگا کے گئی ہیں۔ دو تین راتوں کا قیام تھا۔ کیا بھول گئی آپ؟ مگر چچی ہو رہیں۔ کچھ نہ بولیں اس بڑی بہن کا مزاج سخت، لہجہ کڑوا، نکتہ چینی والی عادت اور ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا ان کا شوق تھا۔ جب بھی آتیں۔ (اور وقتاً فوقتاً آتی ہی رہتی تھیں) سارے گھر والوں کو تنگی کا ناچ نچائے رکھتیں۔ چھوٹے تو چھوٹے بڑے بھی ان کے سامنے آنے سے ڈرتے۔

کان بہت تیز تھے۔ جتنا مرضی سرگوشی میں بات کر لو ان کو سنانی دے جانی۔ گیٹ سے کوئی آہستہ آہستہ اندر داخل ہو کے ادھر ادھر کے دروازوں سے گزر کے اپنے کمرے تک پہنچنا چاہتا تو حیرت سے کہتیں۔

”اے فیضان یہ چوروں کی چال چلنے کی ٹریننگ کہاں سے لی۔ کیا آہستگی سے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے جیسے مجھے خبر نہ ہوگی۔ ارے میری چار چار آنکھیں ہیں۔ دو آگے دو پیچھے سب نظر آ جاتا ہے۔ یہ تو بعد میں پتا چلا لاؤنج میں جس صوفے پر وہ براجمان رہتی تھیں اس کے بالکل سامنے کھڑکی کے شیشے سے پیچھے کا عکس صاف نظر آتا تھا۔

معاملہ اتنا رہتا تو بھی قابل برداشت تھا۔ وہ کسی کی تعریف سن سکتی تھیں، نہ کر سکتی تھیں سوائے اپنی تعریف کے اور یہ بسا اوقات اتنی بڑھ جاتی کہ سامع اکتا جاتا۔ جمائیاں لیتا۔ بس جب آتیں زچ کر کے جاتیں۔

☆☆☆

میاں ان کے پردیس میں مقیم تھے۔ بچے سب شادی شدہ، سال کے بارہ میں سے گیارہ ماہ وہ دوروں پر رہتیں۔ کسی کے بچہ ہوا ہے۔ سب سے پہلے مبارک باد دینے کے لیے جائیں گی اور سب سے بعد میں واپسی۔ کسی کی منگنی کی خبر ملتی تو مبارک باد کے لیے جاتیں اور گھر والے اسی خوف میں سانس روکے

نیوز سنائی۔ ”کل.....“ لینی پکلائیں۔ ”کل تو میں.....“ ”ہاں ہاں کہہ دو سگی ماں جانی کو کل میرا درس ہے۔ کل مجھے بچوں کے اسکول جانا ہے۔ میری طبیعت خراب ہے۔“ نفیسہ نے لے لے لیے۔ ”نہیں آپا! کل ضروری کام پڑ گیا ہے، آپ گھر میں اکیلی کیسے رہیں گی۔“ لینی کے منہ سے بس یہی کلمات برآمد ہوئے۔

”واہ واہ۔ خوب دل جلی کہی..... جہاں تم جاؤ گی ضروری کام سے بال بچوں سمیت، کیا میں نہیں جاسکتی ساتھ میں۔ وقت وقت کی بات ہے میں تو سب کام چھوڑ کر تمہیں گود میں لیے پھرتی تھی۔ تمہاری گنکھنی چوٹی کرتی تمہیں نہلاتی دھلاتی..... ارے کیا وقت آگیا؟ ان کی آواز بھر آ گئی۔ لہجہ پرسوز..... یقیناً نادیدہ آنسو بھی پونچھ رہی ہوں گی۔

لینی اس وقت کو کوس رہی تھیں جب بے دھیانی میں ”آپا“ کو ”آقا“ سمجھ کے فون اٹینڈ کر لیا۔ ”آقا“ انہوں نے موبائل پر اپنی ملازمہ کا کوڈ محفوظ کیا ہوا تھا۔ صحیح بات ہے ملازم ہی آقا بنے ہوئے ہیں۔ گزشتہ دو دن سے ملازمہ چھٹی پر تھی فون اس کا بند جا رہا تھا۔ ایسے ہی حواسوں پر ”آقا“ طاری تھا تو آیا اور آقا میں فرق ہی نہ لگا۔ ان کی خاموشی سے نفیسہ کے جلال کی لہریں لپک لپک کے موبائل فون سے باہر آرہی تھیں۔

”غضب خدہ کا۔ ایک ہم پاگل، اپنی اولاد جیسی بہن کی محبت میں پیسہ دھیلا خرچ کر کے وقت نکال کے آرہے ہیں اور بہن کی محبت کا یہ حال ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال لیں۔ سکتے طاری ہو گیا کہ نامراد بڑی بہن آکیوں رہی ہے۔ نہیں آتے بھی نہیں آتے۔ تم خوش رہو۔ یہ مہر و محبت کی رشتوں کی سب باتیں غلط جھوٹ، بکواس۔ ارے کون سے بہن بھائی اور کون سے رشتے؟“ ”نہیں نہیں آپ ضرور آئیے۔ میں تو بس.....“

رہتے کہ کہیں شادی کے بعد بھی واپس نہ جائیں۔
شاہی میں جاتیں تو دعوتیں کھانے میں برابر حصہ دار
ہوئیں۔ دولہا دلہن اپنے من سے تمامات پر گھوم پھر
کے بھی واپس آ جاتے..... گھر والے اسی ٹینشن میں
کہ کہیں خانہ آبادی کے انتظار میں تو نہیں رکے
ہوئیں۔ جن کی خانہ آبادی پر جاتیں تو واپسی کا راستہ
بھول جاتی۔

اللہ جانے میاں کو کیسے پتا چلا انہوں نے فون پر
خوب جھاڑ پلائی۔ ”اری بھاگوان کیا اس انتظار میں
ہو کہ میزبان دھکے دے کر نکالے یا بچہ اتنا بڑا ہو جائے
کہ ہاتھ جوڑ کے کہے۔ جاؤ بھئی ہماری جان
چھوڑو.....!“

لوگوں کے دو چار ماہ سکون سے گزرتے پھر وہی
چال بے ڈھنگی..... دونوں بہنوں بھابیوں، نندوں
کے بعد بھانجیوں بھتیجیوں کے ہاں بھی اب ہر غمی خوشی
پر جاتیں اور ڈیرہ ڈال کے بیٹھ جاتیں۔ اپنے اپنے
روز مرہ کے معمولات زندگی میں پھنسے عزیز رشتہ
داروں نے اب انہیں غمی خوشی کی خبر دینا ہی چھوڑ
دیا تھا۔ مقام شکر پہ تھا کہ انہیں سوشل میڈیا کا استعمال
صرف بٹن دبا کے فون سننے یا کرنے کی حد تک آتا تھا
وگرنہ پتا نہیں ان کی کون سی تصویر سامنے آتی یا ہر کسی کو
کئی کئی جعلی اکاؤنٹ بنانا پڑتے.....

قصہ مختصر اب لبتی نے ان کو آنے کی دعوت دے
دی تھی۔ بنی کا رشتہ دیکھنے کے لیے کہیں جانے کا پروگرام
تھا، اس کو مستقبل پر چھوڑا اور صلہ رحمی کے باب میں اپنا
حصہ ڈالنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ اگلے دن صبح ہی رکشہ
رکا اور آپا سمیع اپنی سات سالہ پوتی کے گھر میں موجود
تھیں۔ انوار کی وجہ سے سارا گھر سویا ہوا محل بنا ہوا تھا۔
دودھ نرمل بجائی پھر دروازہ پر مشق ستم کیا۔ اتفاق سے لبتی
کی آنکھ کھلی۔ وہ دروازہ پر پہنچیں تو آپا کے چہرہ پر غضب
وغصہ کی وہ تحریر تھی کہ جس کا سادہ سا مفہوم یہ تھا۔

”ناہنجار، بڑی بہن کے ساتھ یہ سلوک کرتے
ہیں؟“ اور لبتی ناہنجار آپا کے ساتھ ان کی پوتی کو بھی

دیکھ کر حیران پریشان کھڑی تھی یک نہ شد و شد۔
”ارے اندر کا کہو گی کہ باہر سے ہی رخصت
کر دو گی۔ بھک منگیاں سمجھ کے.....؟“
لبتی نے ہڑبڑا کے راستہ دیا، آپا کے ہاتھ سے
سامان والا بیگ پکڑا.....

”شاباش بھی شاباش، مجھ سے تو جو سلوک بھی
کرو میں تو عادی ہو، میری پوتی کے سر پر ہاتھ تو رکھ
دیتیں..... بے چاری نے سالانہ امتحان میں پہلی
پوزیشن لے لی، مجھ بد بخت کے منہ سے نکل گیا اپنے
بہن بھائیوں کے ہاں لے کر جاؤں گی۔ کچھ سیر تفریح
ہو جائے گی بے چاری کی..... نہ بابا نہ..... اب وہ
دور نہیں.....“ لاؤج میں ان کی مخصوص جگہ پر پہنچتے
پہنچتے ان کی پاٹ دار آواز سے سارا گھر جاگ چکا
تھا..... ان کی آمد کی خبر ابھی لبتی گھر والوں کو بتا نہیں سکی
تھی..... یوں اپنی آمد کی خبر انہوں نے خود ہی بریک
کی اور ایسے شان دار انداز میں کی کہ سارے کے
سارے یوں سکتے کی کیفیت میں تھے جیسے اپنے آپ
کو یقین دلارہے ہوں..... واقعی..... چیچ چیچ.....

دودن کا قیام پانچ دن تک طویل ہو گیا..... لبتی کے
میاں خوب بھنائے، دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا.....
”یار ابھی تو دو ماہ بھی مکمل نہیں ہوئے تھے۔“
مگر اپنی سگی بہن کے خلاف گھر والوں سے وہ سن سکتی
تھیں نہ کہہ سکتی ہیں۔ اس کا فائدہ وہ اٹھاتی تھیں۔
پانچویں دن پوتی کے لیے بہت سے لوگوں کی مثالیں
بیان کر کے۔ فرخندہ نے اسے سوٹ دیا ہے۔ نادرہ
بہت خوب صورت جرسی خرید کے لائی۔ فلاں نے دو
ہزار دیے فلاں نے پانچ ہزار.....

مالی حالات کی سچی کے باوجود لبتی کو ان کی پوتی کے
لیے سوٹ خریدنا پڑا۔ آپا کو بھی ایک کڑھائی والا دوپٹہ
دیا۔ بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو آپا کی نظروں سے
پسندیدگی کا شوقلیٹ حاصل کر کے ان کے سامان میں
منتقل ہو چکی تھیں۔ انہیں بیٹھے میں سویاں بہت پسند آتی
تھیں ان کے خیال میں ویسی سویاں ان کے نامراد شہر

چشتیاں میں نہیں ملتی تھیں۔ دودھ والی بالٹی..... بقول ان کے ”تم اور لے لینا یہ مجھے دے دو۔“ لبتی کا جوتا، جوان کے پاؤں میں بقول ان کے ایسے فٹ تھا جیسے فیکٹری والوں نے ناپ لے کر بنایا ہو۔

گاجر کا حلوہ..... ویسے تو نفیسہ کے ہاتھ میں قدرت نے بے انتہا ذائقہ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ کی بنی اشیاء کھانے کے بعد انگلیاں چانی نہیں، چبائی جاتی تھیں مگر ان کے ہاں دور دور تک ایسا خالص دودھ نہیں ملتا اور تو اور موتی گاجر میں بھی چشتیاں تک پہنچتے پہنچتے دہلی پتلی اور بے ذائقہ ہو جاتی تھیں۔ گاجر کا حلوہ بھی پانچ کلو والی کڑاہی میں بنوا کے لے گئیں۔ گاجر چھیل کے کش کرنے کا کام پوتی کی مدد سے کیا..... باقی دودھ گاجروں میں کفگیر چلانے کا کام کون سا مشکل ہوتا ہے اس لیے وہ لبتی نے ہی کیا۔ ویسے بھی خدا لگتی کہنی چاہیے۔ جوان جہاں لڑکیاں ہی کئی کئی گھنٹے کھڑے ہونے کا کام کر سکتی ہیں جوڑوں کے درد کے مریض نماز کے دو منٹ کے قیام کے لیے کھڑے ہو جائیں تو بڑی بات ہے.....“

خدا خدا کر کے ان کی تشریف آوری سے شروع ہو کے روانگی تک کے مراحل تمام ہوئے۔ ساز و سامان میں چھوٹے بڑے سائز کے تھیلے بیک سیٹ بڈریوٹرین وہ رخصت ہوئیں..... سب نے ان کے جانے کے بعد اپنا اپنا حلیہ درست کیا۔ اپنے پروگرام نئے سرے سے سیٹ کیے۔ رکی ہوئی سائیس بحال کیں یہ نہیں کہ وہ ڈکٹیٹر تھیں، ڈانٹ بھڑکار بہت کرتی تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے سب کے سروں پر تیل کی بالش کرتیں۔ ٹوٹے ہتھکڑے۔ محبت کے اظہار میں بچل ہرگز نہیں تھیں بس مداخلت بے جانے انہیں ہر نسل میں ہر دل عزیز نہ بنے دیا۔

انہیں دیکھ کے سب ادھر ادھر ہو جاتے۔ مصروفیات یاد آ جاتیں۔ جب بھی لبتی کی اپنی بہن مناشہ یا بھابیوں وغیرہ سے بات ہوتی آپا نفیسہ کا ذکر خیر ضرور ہوتا۔ ان کے گناہ جھڑوائے جاتے۔ اور اپنے گناہوں میں اضافہ کیا جاتا۔ یاد آنے پر توبہ استغفار بھی کیا جاتا مگر ہر ملاقات میں خواہ آسنے سامنے ہو یا فون پر آپا نفیسہ کا

موضوع ضرور زیر بحث آتا۔ پھر کسی اور ذکر میں دم خم نہ رہتا۔ پچھلے تین ماہ میں وہ دونوں بہنوں، دونوں بھابیوں اور اپنی بچی، بھانجی کے پاس دودھ دفعہ آچکی تھیں۔ اب اگلے دنوں میں لبتی کے بیٹے کا رشتہ طے ہو چکا تھا اور بیٹی کا رشتہ دیکھا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا آپا پھر بوریا بستر سمیت آ جائیں گی.....

بچے بیچ رہے تھے ہم اپنے فرینڈز کو نہیں بلا سکتے۔ ہم اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتے جب وہ آ جاتی ہیں۔ بڑی خالہ ہیں کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ خدا کے لیے انہیں کہیے کہ شادی کے روز تشریف لائیں۔

بہت سی تجاویز سامنے آئیں۔ بڑے مشورے ملے مگر بات پھر وہی کہ ملی کے گلے میں تھنی کون باندھے گا۔ نفیسہ آپا کو کن لفظوں میں اور کیسے منع کیا جائے کہ وہ ہر وقت زبان کو حرکت میں نہ رکھیں۔ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ ایک دم لبتی کی چھوٹی بیٹی عائشہ کے دماغ میں نا در خیال آیا۔

”دیکھیے امی، ابھی تک ہم کبھی بھی نفیسہ خالہ کے ہاں نہیں گئے۔ وہی بارہ مہینے کہیں نہ کہیں ضرور پائی جاتی ہیں ایسا کرتے ہیں ہم سب بہن بھائی، کزنز اور آپ سب مل کے چشتیاں جاتے ہیں۔ آج تک انہوں نے خد متیں کروائی ہیں۔ مہمان بن کے ہی جانا پسند رہا کبھی وہ میزبان تو نہیں بنی ناں ذرا ان کو بھی پتا چلے مہمان جمع ہوں تو کیسے بستروں کا بندوبست کیا جاتا ہے، کیسے ان کے ناشتے اور کھانوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ کیسے درجن بھر لوگوں کے لیے چائے پانی کا انتظام کرتے ہیں، بریانی کو دم دیتے ہوئے کس طرح گرمی سے دم گھٹتا ہے۔ سب مل کے جاتے ہیں کچھ آٹے ڈال کا بھاؤ انہیں بھی تو پتا چلے۔“

”تجویز تو خاصی معقول ہے۔“ لبتی مسکرائیں۔ چلیے جناب اگلے دن لبتی اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ چشتیاں روانہ ہو گئی..... نفیسہ آپا کے طریقے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جب ٹرین میں بیٹھ گئیں پھر اطلاع دی۔ سنگٹل نہیں آ رہے کا کہہ کے بات ادھوری رہ گئی.....

”امی ہم لوگوں نے اتنے زیادہ دن رہنا ہے ناں

بہو کے ہیں یا میرے؟ خواہ بچاری پر ظلم کروں.....
شام کے پانچ بج گئے۔ نفیسہ آیا اپنے تخت پر
براجمان رہیں۔ چن کا دروازہ بند تھا۔ کبھی سمیت سب
حیران کہ آپا ایسی تو نہیں یہ کیا ہوا۔

مغرب کی اذان کے ساتھ ہی دروازہ پر گھنٹی بجی، آپا
کا بیٹا کھانے پینے کے سامان سے لدا پھندا اندر داخل ہوا۔
دستر خوان بچا ہوا تھا۔ آپا نے بڑے سے تھیلے سے
ڈسپوزیبل کاغذی پیئیں، چمچے نکلوائے۔ مشہور ہوٹل کی بریانی،
قورمہ، تندوری روٹی، سلاد رائتہ، اور ٹھنڈی ٹھار کولڈرنگ،
ندیدوں کی طرح سب نے کھایا۔ دستر خوان پر رکھے ٹشورول
سے ہاتھ صاف کیے۔ برتن کوڑے دان میں ڈالے۔

”چلو جی رات کا کھانا تو چاند بابا نے کھلا دیا۔
اللہ اسے اجر دے۔ دل کا بھی اچھا ہے ہاتھ کا بھی
کھلا۔ بڑی آؤ بھگت کرتا ہے مہمانوں کی.....“ انہوں
نے بڑے صاحبزادے کی تعریف کی۔ پانی کا گلاس
خالی کر کے میز پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”لبنی برا نہ ماننا میری تو مجبوری ہے۔ میں نے
تو پہلے سے صادق آباد اپنی بیٹی کے ہاں جانے کے
لیے بنگلہ کروا رکھی ہے۔ آگے بھی نہیں کروا سکتی تو خیر
سے اس کے ہاں اسی ہفتہ میں خوش خبری متوقع ہے۔
مجھے تو اجازت دو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے جب تک
چاہو رہو۔ جو مرضی چاہو پکاؤ کھاؤ بچوں کو کھلاؤ، گھماؤ
پھراؤ، ادھر سے فارغ ہونی تو ان شاء اللہ ضرور تمہاری
طرف کا چکر لگاؤں گی بہت دن ہو گئے، لاہور فیصل
آباد کا بھی چکر نہیں لگا۔ بس زندگی کے میلے اور باغ
بہاریں ہیں۔ کوئی جھجک نہ رکھنا۔ بلا تکلف ہر چیز
استعمال کرنا۔ بس میری تو ممتا کا امتحان آگیا ناں
مجبوری ہے.....“ ان کے لہجہ میں تھوڑا سا سوز
آگیا..... یا شاید ان لوگوں کو محسوس ہوا۔ آپا ہر کھڑے
رکشہ پر بیٹھ کے یہ جاوہ جا..... لبنی اور بچے آنکھیں پھاڑ
کے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔
یہ کیا ہوا اور اب کیا کریں۔



نفیسہ خالہ کے ہاں کہ ان کو سواد آجائے۔“ بڑی بیٹی نے
کہا۔ چشتیاں کے قریب پہنچتے پہنچتے سب کے خیالات
الگ الگ تھے کچھ کا کہنا تھا خالہ خوش ہوں گی، کچھ کا کہنا
تھا کہ خفا ہوں گی۔ بہر حال استقبال بہت اچھا ہوا۔ ان
کے استقبال کے لیے پورا خاندان موجود تھا۔ گھر میں
داخل ہوتے ہی نفیسہ آپا تپاک سے ملیں سب کو سینے
سے لگایا۔ راستے کا حال احوال پوچھا۔ ناشتہ خوب اہتمام
سے بنایا ہوا تھا۔ پرائیوٹ آلہ کی بھیجا، چنے، نان، حلوہ ڈبل
روٹی اٹھائے آپا نے سب گھروالوں کو آگے لگایا ہوا تھا۔
لبنی اور بچے دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے
رہے خواہ وہ دل میں اتنی بدگمانیاں لاتے رہے.....
ناشتہ کے برتن سمٹوا کے آپا بے فکر ہو گئیں..... بھنے سو
کھے چنے بڑی سی پلیٹ میں دھرے ہوئے تھے۔ ہر دو
چار منٹ کے بعد آپا نعرہ لگاتیں۔

”کھاؤ بھئی..... کھاؤ بہت مفید ہوتے ہیں انسانی
وزن کو بڑھنے سے روکتے ہیں.....“ زمانے بھر کی
داستانیں سناتیں۔ خاندان سے اپنی مہر و محبت کے قصے
بیان کیے۔ سب کے لیے اپنے قربانیاں زور و شور سے
بتائیں۔ کس کس نے کس موقع پر ان کے ساتھ کتنا برا
سلوک روا رکھا۔ وہ بتایا۔ خاندان کی خود غرضیوں کے
قصے بیان کیے۔ بارہ سے ایک اور ایک سے دو بج گئے۔
آپا کی بہو تو میکے گئی ہوئی تھیں۔ (یا اللہ جانے بھیج دی گئی
تھیں) آپا کی باتوں کا دور ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔
”خالہ آپ کی بہو میکے گئی ہوں تو کیا کرتی ہیں
آپ مطلب آپ سے تو کو تنگ نہیں ہوتی۔“

آپا نے ناگ سے کبھی اڑائی..... ”زندگی۔
صرف بہو کے دم سے تو نہیں اللہ نے جب تک زندہ
رکھا ہے دیتا ہی رہے گا۔“

بھوک سب کو لگی تھی۔ ایک پڑوسن نمک لینے
آئیں تو اتنے مہمانوں کو دیکھ کے حیران ہوئیں۔
”اے بوا، جب آپ کے رشتہ دار آرہے تھے تو
دہن کو کاہے کو میکے بھیجا؟ گلی میں ملی تھی کہ اماں کہہ رہی
ہیں میکے کا چکر لگا آؤ۔ بہت دنوں سے نہیں گئیں تم.....“
آپا نے پھر ناگ سے کبھی اڑائی۔ اے یہ مہمان میری

عنبرین ابدان



گئی۔ آپ اتنے دنوں کے بعد آئی ہیں۔ آپ کو میری یاد نہیں آتی؟“ نوشاہہ نے خود ہی بات پلٹتے ہوئے کہا۔

”کیوں یاد نہیں آتی؟ تم میری اکلوتی بہن ہو۔ فاصلے اتنا زیادہ ہے کہ آنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں ہے کہ اتنا لمبا سفر کر کے آؤں۔“ تابندہ بیگم نے اپنی مجبوری بتائی۔

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ موٹی ٹریفک آدھے گھنٹے کا سفر بھی دو گھنٹے میں ختم کرواتی ہے۔“ نوشاہہ بیگم نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”امی! آپ ذرا عروہ کو پکڑ لیں، میں ہانڈی چڑھا لوں۔“ ایک طرف عروہ کو لٹکائے دوسری طرف بھنڈی والی ٹوکری اٹھائے ثانیہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”پہلی بات تو یہ میری بہن آئی ہوئی ہے۔ اپنی بہن سے باتیں کروں گی یا اس چھٹانک بھر کی بچی کو سنبھالوں گی۔ اور دوسری بات یہ تم بھنڈی کیوں بنا رہی ہو؟“ نوشاہہ بیگم نے بات کے اختتام پر تیوری چڑھا کر ثانیہ سے استفسار کیا۔

”میں مٹن بھی بنا رہی ہوں۔ صبح فرحان کہہ کر گئے تھے۔ میرے لیے بھنڈی بنانا اس لیے بنا رہی ہوں۔“ ثانیہ نے جلدی سے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے دو ہانڈی بنانے کی۔ بہت گرمی ہے۔ ایک ہی ہانڈی بناؤ۔“ تابندہ بیگم نے پیار سے کہا۔

”آپا! آپ کو کیا بتاؤں، میں ثانیہ سے کتنی تنگ ہوں۔ پیسے کو تو جیسے گورا کاغذ سمجھتی ہے۔ ذرا سی بچی ہے۔ اس کے خرچے ختم ہی نہیں ہوتے۔ کبھی ڈاپر چاہیے تو کبھی دودھ کا ڈبہ ختم ہے۔ اور خود تو ہے ہی سدا کی بیمار۔ کبھی کمر درد ہو جائے گا تو کبھی کوئی اور درد..... بے چارہ میرا فرحان، اتنی محنت سے کماتا ہے پر اس کی بیوی کو کون سمجھائے؟ میں تو ماں ہو اور انا بہن، ہر وقت کا جلنا ہی ہمارے نصیب میں رہ گیا ہے۔“ نوشاہہ بیگم نے اپنی بھڑاس نکالی۔

تابندہ بیگم دھیرے سے مسکرا کر رہ گئیں۔ ان کی مسکراہٹ نوشاہہ بیگم سے مخفی نہیں رہی تھی۔ نوشاہہ ایک دم چڑسی گئیں۔

”آپا! سچی بات تو یہ ہے۔ آپ ہمیشہ سے قسمت کی دھنی رہیں۔ سسرال اور شوہر کے معاملے میں بھی، اور اب اولاد کے معاملے میں بھی۔ سب سے بڑی بات بہو کے معاملے میں خوش قسمتی بھی آپ کے حصے میں آئی۔ اس عمر میں اور چاہیے۔ آپ جیسا خوش نصیب کون ہے؟ ایک میری پھوٹی قسمت، جو ثانیہ کو بہو بنالائی۔“ نوشاہہ بیگم نے اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

”نوشاہہ! بری بات ہے۔ اس طرح قسمت کو نہیں کوہتے۔“ تابندہ بیگم نے اپنے نرم لہجے میں بہن کو سرزنش کی۔ ”سب کچھ ٹھیک ہونے کی دعا کیا کرو اور پیار سے بہو کو سمجھاؤ کہ آج بچت کریں گے تو کل ہمارے ہی کام آئے گی۔“ تابندہ بیگم نے ناصحانہ انداز میں نوشاہہ سے کہا۔

”چھوڑیں آپا! میں بھی کن باتوں کو لے کر بیٹھ



”ارے کیوں ایک ہانڈی بنائے۔ آپ! آپ اتنے عرصے بعد آئی ہیں۔ اب میں آپ کی خاطر مدارات بھی نہ کروں۔ ثانیہ! ساتھ میں پلاؤ اور بیٹھا بھی بنا لو۔“ نوشاہہ بیگم نے حکم صادر کیا۔

”ارے نوشاہہ! پاگل ہو گئی ہو۔ میں کہاں اتنا کھاتی ہوں؟ کوئی تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹا! تم جیسے روز کھانا بناتی ہوں۔ ویسے ہی بنا لو۔“ تابندہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

”اچھا امی! میں سب بناتی ہوں۔ آپ اس کو پکڑ لیں۔“ ثانیہ نے عروہ کو پھر سے نوشاہہ بیگم کی طرف بڑھایا۔

”میں اس کو کیسے پکڑوں؟“ نوشاہہ نے عروہ کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

”ماما۔“ عروہ دادی کو غصے میں دیکھ کر ثانیہ سے لپٹ گئی۔

”تو پھر میں کیسے کھانا بناؤں؟“

اب کے ثانیہ نے ہاتھ میں پکڑی نوکری نیبل پر پٹنی اور ذرا تیز لہجے میں بولی۔

”اسے مجھے دے دو۔“ تابندہ بیگم نے اپنے ہاتھ ثانیہ کی طرف بڑھائے۔

”ارے نہیں آپا!“ ثانیہ ایک دم شرمندہ ہو گئی۔

”لاؤ مجھے دے دو، کوئی بات نہیں۔“ تابندہ بیگم نے اپنے ہاتھ پھر سے ثانیہ کی طرف بڑھائے۔

”کوئی بات نہیں آپا! میں عروہ کو کچن میں لے جاتی ہوں۔ آپ تھک جائیں گی۔“ ثانیہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”نہیں ٹھکتی۔ تم ایسا کرو کچھ کھلونے دے جاؤ۔ میرے پاس بیٹھی کھیلتی رہے گی۔“ تابندہ بیگم کے اصرار پر ثانیہ نے عروہ کو ان کی گود میں بٹھا دیا۔

پہلے تو عروہ تھوڑی سی روئی لیکن جب ثانیہ نے کھلونے لا کر سامنے رکھے تو وہ کھیل میں لگ گئی اور بہل گئی۔

ثانیہ نے طنزیہ نظروں سے اپنی ساس کی طرف

دیکھا اور نوکری اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

”دیکھا آپا! ہر وقت کام سے جان چھڑانے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔“ نوشاہہ بیگم نے شکایتی انداز میں تابندہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”غلط بات ہے نوشاہہ! کچن میں بہت گرمی ہے۔ بچی بیمار ہو جائے گی۔ اگر تم نہیں لے سکتیں تو انا سے کہو، بھابھی اگر کچن میں کام کر رہی ہے تو بیجی کو اپنے پاس بٹھالے۔ کوئی غیر نہیں ہے، اپنا خون ہے تمہارا۔“ تابندہ بیگم نے ذرا ناراضی سے کہا۔

”آپا! آپ بھی بس جانے دیجئے۔ آپ کی بہو ایسی نہیں ہے، اگر آپ کو ثانیہ جیسی بہو ملتی۔ تب میں آپ سے پوچھتی۔“ نوشاہہ بیگم نے کہا۔

”امی! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا۔“ انا جو کافی دیر سے ٹی وی کے آگے جی بیٹھی تھی۔ ڈرامہ ختم ہوتے ہی ان کی طرف پلٹی۔

”اچھا بابا کوئی اور بات نہیں ہے کیا یا آج بہو
ڈرے ہے۔“ تابندہ بیگم کے کہنے پر وہ سب ہنسنے
لگیں۔

”آپا! میں نے انا کے لیے گولڈ کا سیٹ بنوایا
ہے، وہ میں آپ کو دکھاتی ہوں۔“ نوشاہہ بیگم کہہ کر
اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔
انا عروہ کے ساتھ کھیلنے لگی گئی۔

☆☆☆

”آپا! آپ کتنے دن ہو گئے ہیں۔ ہمارے
گھر نہیں آئی ہیں۔ دن نہیں بلکہ مہینے۔“ انا کی
ناراضی بھری آواز فون پہ ابھری۔

”بیٹا! میں اتنی جلدی اتنا سفر کر کے نہیں
آ سکتی؟“ تابندہ بیگم نے رسانیت بھرے لہجے میں
کہا

”آپا! آپ سارا دن فارغ ہی تو ہوتی ہیں۔
آجائیں نا۔“ انا نے ضدی لہجے میں کہا۔

”اچھا میری جان! میں کوشش کروں گی۔ ذرا
اپنی ماں کو فون دیتا۔ مجھے کچھ ضروری بات کرنی
ہے۔“ تابندہ بیگم نے کہا۔

انا نے فرماں برداری سے سیل فون نوشاہہ بیگم
کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں بہنیں باتیں کرنے لگیں۔
انا بور ہو کر لاؤنج میں آ کر پھر فی وی کے سامنے بیٹھ
گئی۔ اور اپنا فیورٹ ڈرامہ دیکھنے لگی۔

☆☆☆

”آپا آپ تو نہیں آئیں۔ میں ہی آگئی ہوں
آپ سے ملنے۔“ انا نے ناراضی سے منہ بنا کر کہا۔ تو
تابندہ بیگم ہنس دی۔

”تم تو میرا بچہ، میری جان ہو۔“ تابندہ بیگم انا
کو دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئیں۔ ”اور میرا بیٹا کیسا
ہے؟“

اب کے تابندہ بیگم نے پاس کھڑے فرحان کو
گلے لگالیا تھا۔

”میں نے اتنی منتیں کی ہیں آپا! تب لے کر
آئے ہیں۔“ انا نے فرحان کی شکایت لگائی۔ فرحان

جھینپ سا گیا۔

”وہ آپا! آج کل آفس میں کام زیادہ ہے، اس
لیے نہیں لا رہا تھا۔“ فرحان نے شرمندہ ہوتے
ہوئے عذر پیش کیا

”چلو کوئی بات نہیں، بھائی لے تو آیا ہے نا۔“
تابندہ بیگم نے مسکرا کہتے ہوئے فرحان کی شرمندگی
دور کی۔

فرحان انا کو چھوڑ کر چلا گیا۔ تابندہ انا کو اپنے
کمرے میں لے آئیں۔

”میں نے آپ سے کتنا کہا تھا کہ آپ
آجائیں مگر آپ نہیں آئیں۔“ انا نے لاڈ سے ان
کے گلے میں بازو ڈال کر کہا۔

”چلو اسی بہانے تم آگئیں۔ پہلے بڑھائی کا
بہانہ کیے رکھتی تھیں۔ تابندہ بیگم نے انا کو گلے لگاتے
ہوئے کہا۔

دو دن تک خوب مزے رہے۔ بھابھی نے بھی
خوب کمپنی دی۔ ارضی بھائی نے اسے باہر ڈنر بھی
کروایا۔

”آپا! میں سوچ رہی تھی۔ آپ کے گھر آ کر
بور ہو جاؤں گی لیکن یہاں تو الٹا ہی ہو گیا۔ مزے ہی
مزے۔“ وہ سب ابھی باہر سے آئے تھے۔

انا کی خوشی اس کے چہرے اور لہجے سے عیاں
تھی۔ تابندہ بیگم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”اب تم ایسا کرو، سونے کی تیاری کرو۔ باقی
باتیں صبح کرنا۔“ انا کا باتیں کرنے کا موڈ دیکھ کر
تابندہ بیگم نے اسے ٹوکا۔

”ٹھیک ہے۔“ خلاف توقع انا فوراً مان گئی اور
تابندہ بیگم کے ساتھ لیٹ کر ان کے گرد بازو پھیلا
دیے۔

”آپا! ایک بات کہوں؟“ انا نے سر اٹھا کر
تابندہ بیگم کی طرف دیکھا۔ جو آنکھیں بند کر کے تسبیح
پڑھنے میں مصروف تھیں۔

”جی میری جان! کہو۔“ انہوں نے محبت سے
اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپا! آپ کے پاس بہت سکون ہے۔ بہت زیادہ۔“ انا نے تابندہ بیگم کے گرد زور سے بازو کتے ہوئے کہا۔ تابندہ بیگم اس کی بات پہ مسکرا دیں۔ ”ماؤں کے پاس سکون ہی ہوتا ہے۔“ تابندہ بیگم نے کہا اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔ انا جلد ہی نیند کی واوی میں اتر گئی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ غیر معمولی شور سے کھلی۔

”ہیں..... یہ کیا ہو رہا ہے؟“

وہ آنکھیں ملتی باہر آئی۔ لیکن باہر کا منظر دیکھ کر وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔

بھابھی..... پیاری بھابھی آیا پر برس رہی تھیں۔ چلا رہی تھیں۔ انا ایک دم اندر کی طرف ہوئی۔ انا کو آتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ منظر تو آنکھوں سے دور ہو گیا تھا مگر آواز ابھی بھی اس کے کانوں میں آرہی تھی۔

”بیٹا! مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ تابندہ بیگم کی کمزور آواز سن کر انا بے چین ہو گئی۔

”بس ڈرامے کروالو۔ جب تک میں مروں گی نہیں، یہ بڑھیا میری جان نہیں چھوڑنے والی۔“

بھابھی کی آواز پر انا کھڑکی میں کھڑی ہو کر لاؤنج میں دیکھنے لگی۔ عطیہ بھابھی ارضی بھائی کی طرف منہ کر چلا میں۔

”یہ بڑھیا میرا دماغ خراب کر دے گی۔ ارضی! میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر وہ زور زور سے رونے لگیں۔

تابندہ بیگم سر جھکائے کھڑی تھیں۔ انا کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ عطیہ بھابھی کے منہ پر پھڑ مار دے۔

اب ارضی بھائی، بھابھی کو پوچھیں گے۔ انا نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔ اسے حیرت تو تب ہوئی، جب ارضی بھائی نے قہر برساتی نظروں سے ماں کو دیکھا اور اپنی بیگم کو چپ کروانے لگے۔

تابندہ بیگم کمزور قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔

انا جلدی سے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ وہ ہمیں چاہتی تھی تابندہ بیگم کو پتا چلے کہ اس نے سب دیکھ لیا ہے۔ وہ انہیں اپنے سامنے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

جان بوجھ کر لیٹ اٹھی اور اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی باہر آئی۔

”آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

تابندہ بیگم کو ڈھونڈتی ہوئی کچن میں چلی آئی۔ جہاں وہ کھانا بنا رہی تھیں۔

”اٹھ گئی میری بیٹی! تم فریش ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے ناشتہ بناتی ہوں۔“ تابندہ بیگم نے اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں خود ناشتہ بنا لوں گی اور آپ یہ کھانا کیوں بنا رہی ہیں؟“ انا نے ہانڈی کی طرف اشارہ کیا۔

”بس میں فارغ تھی۔ سوچا کچھ کیا جائے، اسی لیے ہانڈی بنا رہی ہوں۔ تم اندر جاؤ، میں تمہارے لیے ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“ تابندہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

”آپ کو کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بنا لوں گی ناشتہ بھی اور یہ ہانڈی بھی۔ آپ اندر جائیں۔“ انا نے ان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہیں کمرے میں بھیج دیا۔

”میں کتنا اچھا سمجھتی تھی بھابھی اور ارضی بھائی کو مگر.....“ انا نے ہانڈی میں چمچہ چلاتے ہوئے سوچا۔

”بے چاری آپا!“ انا کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ تابندہ بیگم عصر کی نماز پڑھنے لگیں تو اس نے گھر فون ملا لیا۔

”آگئی تمہیں ماں کی یاد۔“ نوشابہ بیگم نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”جی آگئی۔“ انا نے دھیرے سے کہا۔

”اب تم گھر آ جاؤ، اس ثانیہ نے تو میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔“

”پلیز امی۔“ انا کے ذہن میں صبح کا واقعہ پھر سے تازہ ہو گیا۔ ”ہر وقت ثانیہ بھا بھی کو برامت کہا کریں۔ کم سے کم بھا بھی ایسا تو نہیں کرتیں جیسے عطیہ بھا بھی کرتی ہیں۔“ انا کے منہ سے نکل گیا۔ اس نے فوراً ہی اپنے لبوں کو دانتوں تلے دبایا۔

”کیا مطلب؟“ نوشابہ بیگم ٹھٹھکیں۔
”کچھ نہیں امی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کچھ تو ہے۔ بتاؤ، کیا ہوا؟“

”امی! کچھ نہیں۔“ انا نے اپنی زبان کو کوسا۔

”انا کم بتاتی ہو یا آپا سے پوچھوں۔ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟“ نوشابہ بیگم نے ضدی لہجے میں استفسار کیا۔ ناچار انا کو بتانا ہی پڑا۔

”واقعی۔“ نوشابہ بیگم کی استعجابیہ آواز ابھری۔

”اور کیا امی! آپا کی اتنی انسٹ ہو رہی تھی۔

میرے دماغ سے صبح کا واقعہ نکل ہی نہیں رہا ہے۔ اور ارتضیٰ بھائی.....“ انا نے بھرائی ہوئی آواز میں بات ادھوری چھوڑی۔

”انا بیٹا! کہاں ہو؟“ تابندہ بیگم کی آواز آئی۔

”اجھا، میں فون بند کر رہی ہو اور ہاں اس بات کا ذکر کسی سے مت کیجیے گا۔“ انا نے نوشابہ بیگم کہا اور جلدی سے فون بند کر کے میسج میں آئی۔ آپا اپنے چھوٹے بیٹے سے بات کر رہی تھیں جو کہ پچھلے دس سالوں سے امریکہ میں مقیم تھا۔

”یہ لو، مرتضیٰ ہے۔ میں نے بتایا انا آئی ہوئی ہے۔ تو تم سے بات کرنے کا کہہ رہا ہے۔“

تابندہ بیگم نے سیل فون انا کو دیتے ہوئے اسے بتایا تو انا نے مسکرا کر فون تھام لیا۔

بات کرنے کے بعد ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی تیزی سے کوندا۔ اس نے مرتضیٰ کا نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا۔

☆☆☆

انا نے غور کیا تو پتا چلا کتنے ہی کام آپا کرتی ہیں۔ کبھی ہانڈی بنا رہی ہیں تو کبھی سبزی بنا رہی ہیں۔ کبھی دودھ گرم کر دیا تو کبھی کسی بچے کے کپڑے

تبدیل کر دیے۔ لیکن پھر بھی عطیہ بھا بھی منہ بنائے رکھتیں۔

انا تابندہ بیگم کو کام کرنے سے منع کرتی۔
”آپ کی آرام کرنے کی عمر ہے، کام کرنے کی نہیں۔“ وہ منہ بنا کر کہتی تو تابندہ بیگم ہنس کر ٹال دیتیں۔

انا کا دل چار دن میں گھبرا گیا تھا۔ اس نے نوشابہ بیگم کو فون کر دیا تھا۔ وہ اگلے دن ہی آگئیں۔
”جاری ہو۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا ڈھیر سارے دن رہو گی۔“ تابندہ بیگم نے انا کو اپنے ساتھ لپٹایا۔
”اب میں آپ کو نوکروں کی طرح کام کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی اور آپ کی انسٹ ہوتے تو بالکل بھی نہیں دیکھ سکتی۔“ یہ بات انا نے اپنے دل میں کہی۔
”آپا! آپ کیوں برداشت کرتی ہیں عطیہ کی بد تمیزیاں۔“ حسب معمول نوشابہ بیگم زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔

”کیا مطلب؟“ تابندہ بیگم نے حیران ہو کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”امی!“ انا نے اشارے سے انہیں منع کرنا چاہا لیکن نوشابہ بیگم اس کی طرف دیکھ ہی کب رہی تھیں۔

”مطلب غیرہ رہنے دیں۔ ہم سب یہی سمجھتے ہیں کہ آپ سکون سے جی رہی ہیں۔ یہ عطیہ..... پورا خاندان اس کی تعریفیں کرتا ہے۔ اور تعریفیں کروانے میں سب سے زیادہ ہاتھ کس کا ہے۔ آپ کا۔ عطیہ تو انتہائی بد تمیز اور بد دماغ عورت ہے۔ اب تو میں ہر ایک کو پکڑ پکڑ کر اس کے کروت بتاؤں گی۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ میں آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گی۔“ نوشابہ بیگم نے ضدی لہجے میں تابندہ بیگم کا ہاتھ تھاما۔

”کیا ہو گیا ہے نوشابہ؟“

”جو ہو رہا ہے اور جو ہو گیا ہے، وہ کم نہیں ہے۔ آ یا انا کچھ ہو گیا ہے آپ نے کیوں نہیں بتایا۔“ نوشابہ بیگم نے شکوہ آمیز نظروں سے بہن کی جانب

دیکھا۔

”بتا کر کیا ہوتا۔“ تابندہ بیگم نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”اگر مجھے تماشا بنانا ہوتا تو میں چار سال پہلے ہی بنا دیتی۔ پر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اگر وہ غلط ہے۔ اپنی غلطیوں کا پھل پائے گی۔ یہ اصول ہے۔ میں کیوں اپنے حصے میں برائی لاؤں۔ اور دوسری بات مجھے نہیں پسند میرے گھر کی کہانی گھر گھر ڈسکس ہو۔ اپنا پلوا اٹھائیں گے خود ہی ننگے ہوں گے۔ نقصان کس کا ہوگا صرف اپنا تو میں اپنا نقصان کیوں کرتی؟ کیا سب کو بتا دینے سے مسئلہ حل ہو جاتا؟ عطیہ ٹھیک ہو جاتی۔ نہیں..... کبھی نہیں۔“ تابندہ بیگم نے ناصحانہ انداز میں نوشابہ بیگم سے دریافت کیا۔

”لیکن پھر بھی آپ!“ نوشابہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔ ”میرے چیخنے چلانے سے۔ سب کو بتانے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اسی لیے میں نے اس مسئلے کو اپنا مسئلہ ہی رہنے دیا۔ آج تک، اس بارے میں تم سے بھی بات نہیں کی۔ بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”لیکن“ نوشابہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔ ”ثانیہ بہت اچھی ہے۔ اسے تھوڑا سا گائیڈ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور تھوڑا تمہیں اپنا رویہ بدلنے کی۔ عطیہ کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ جو جان بوجھ کر یہ سب کرتا ہو۔ اسے کوئی سمجھا سکتا اور نہ ٹھیک کر سکتا ہے اور ارنٹنی اس کا ساتھ دیتا ہے۔

تم یہ بات کسی سے بھی مت کہنا۔ گھر کا معاملہ ہے، گھر میں ہی رہے تو ہی بہتر ہے۔ شکر ہے اس مالک کا جس حال میں بھی رکھا ہے۔ ہزاروں سے بہتر ہے۔ دکھ اور شکایت مجھے عطیہ سے نہیں، ارنٹنی سے ہے۔ باقی کوئی شکوہ شکایت نہیں، شاید میری ہی کوئی کوتاہی رہی ہوگی جس کی سزا مل رہی ہے۔“ تابندہ بیگم نے آنکھوں میں آئے آنسو دوپٹے کے پلو سے صاف کیے۔

”آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلیں۔“ انا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”میں جلدی آؤں گی۔“ تابندہ بیگم نے کہا۔

”نہیں آیا! آپ ابھی چلیں نا۔“ انا نے کہا۔

”یہ میرا گھر ہے بیٹا۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔ ہاں چند دن کے لیے رہنے آؤں گی۔ میں تمہارے لیے ایک سوٹ لائی تھی۔ دیکھو اور بتاؤ تمہیں کیسا لگا ہے؟ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“

تابندہ بیگم کہہ کر سوٹ لینے کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔

”مجھے تو آپا کی بے حد فکر ہو رہی ہے۔“ نوشابہ نے فکر مندی سے کہا۔

”امی! اس کا حل نکل آیا ہے۔“ انا نے ماں کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔

”وہ کیا؟“ نوشابہ بیگم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے مرتضیٰ بھائی کو فون کر کے سب بتا دیا ہے۔ اور عطیہ بھابھی کی ویڈیو بھی بنا کر مرتضیٰ بھائی کو واپس ایپ کر دی ہے۔ اب عطیہ بھابھی مکر سکتی ہیں نہ ہی ارنٹنی بھائی اور نہ ہی آپا، غلط فہمی ہوئی ہے کہہ کر انہیں بچا پائیں گی۔“ انا نے اپنا کارنامہ بتایا۔

”پتا ہے مرتضیٰ بھائی ٹھیک ایک ہفتے کے بعد یہاں ہوں گے۔ وہ کہہ رہے تھے اب آؤں گا تو امی کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ یا پھر خود ہی یہیں شفٹ ہو جاؤں گا۔“

”سچ بتاؤ؟“ نوشابہ بیگم نے خوشی سے انا کی طرف دیکھا اور ایک اطمینان کی سانس لی۔

”ہجی میں۔“ انا نے آنکھیں میچ کر کہا۔

”میری بچی تو بہت ہی سمجھ دار ہے۔“ نوشابہ بیگم نے انا کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ انہیں بیٹی پڑھیں اور پیار آیا۔ اور ساتھ میں ثانیہ پہ بھی۔

وہ جانتی تھیں وہ ثانیہ کے ساتھ خود بھی زیادتی کرتی تھیں۔ ایکشن کاری ایکشن تو ہوتا ہی ہے۔ جب ایکشن ہی نہیں ہوگا تو ری ایکشن بھی نہیں ہوگا۔ اس کا انہیں یقین تھا۔ ایک سرشاری نوشابہ بیگم کے رگ جاں میں اتر گئی۔

☆

مکمل ناول

لیجے گا۔“ سب سے بڑے بیٹے بنی نے ماں کو مفت مشورے سے نوازا۔

”منرل واٹر کے بچے، صرف تیری وجہ سے نرین کی خواری بھگتنی پڑ رہی ہے۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے بس کا سفر نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے بیٹے کو گھورا۔

”صرف مجھے الٹیاں تھوڑی لگتی ہیں، اس ٹومی کی بھی تو طبیعت خراب ہوئی ہے بس میں۔“ اس نے بہن کی طرف اشارہ کیا جو چپس کے خالی پیکٹ میں ہاتھ مار کر رکوئی نادیدہ ذرہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہاں، سارے نمونے میری قسمت میں ہی پیدا ہونے لکھے تھے۔ دیکھ رہی ہونا اجیہ! کس خواری سے میں ہمیشہ میکے سے سسرال اور سسرال سے میکے آتی ہوں۔“

بلا کی گرمی میں ٹرین کی اکانومی کلاس کا سفر تو پھر قابل برداشت تھا لیکن پیاس اب ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ عاصمہ باجی کا چھوٹا سا واٹر کولر تو سفر کے شروع میں ہی خالی ہو گیا تھا۔ بنی، سنی اور ٹومی تینوں بچوں نے ٹرین میں بیٹھتے ہی وہ بڑا سا شاپر کھول لیا جس میں ممائی نے لاڈلوں کو چپس، پاپڑ، نمکو اور جانے کیا الم غلم خرید کر دیا تھا۔ ایسی چیزیں کھانے کے بعد پیاس تو لگنی تھی حالانکہ عاصمہ باجی ہر بار پانی پینے پر بچوں کو ٹوکتی آتی تھیں۔

”ابھی سے پانی ختم کر دو گے تو باقی کے سفر میں کیا پیس گے۔ ساتھ کوئی مرد نہیں جو کسی اسٹیشن سے پانی بھر کر لے آئے۔“

”مما! منرل واٹر بیچنے والے آتے تو ہیں، خرید

راشد رخصت

محبت کی دھواں





یہ مجھ سے ہرگز برداشت نہیں۔ ہر تیسرے مہینے محترمہ نازل ہو جاتی ہیں۔ خاطر مدارت کا خرچہ الگ اور واپسی پر کنبے بھر کے کپڑے لے دیے جاتے ہیں۔ اب بھلا بتاؤ، کیا دانش کی کمائی پر اس کے بیوی بچوں کا کوئی بھی حق نہیں۔ وہ تو اللہ میری امی کو سلامت رکھے، جب بھی میکے جاؤں، منگی میں پیسے تھا کر بازار بھیج دیتی ہیں کہ اور نہیں تو اپنے اور بچوں کے موسم کی مناسبت سے دو، دو جوڑے ہی خریدوں۔“

ثروت بھابھی کے لہجے میں بھی میکے کا وہ ہی مان ہوتا جواب عاصمہ باجی کی باتوں سے جھلک رہا تھا اور کیا خبر ثروت بھابھی کی بھانج کو بھی شوہر اور سرال والوں سے کچھ اسی قسم کے گلے شکوے ہوتے ہوں۔ اجیہ کے ذہن کی رودور دور بھٹک جاتی۔

اگر آج اس شدت کی پیاس نہ لگ رہی ہوتی تو اجیہ کا بہت سا وقت اپنے ہی دھیان اور سوچوں میں گم ہو کر گزر سکتا تھا لیکن اس وقت ایک گلاس ٹھنڈے ٹھار پانی کی طلب دوسری تمام سوچوں پر حاوی ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد ایک جوس پیچنے والا وہاں آ نکلا تھا۔ بنٹی اور ٹومی نے جوس کی فرمائش کر دی۔ عاصمہ باجی نے پہلے تو بچوں کو گھرک دیا لیکن بچے باز آنے والے کنب تھے۔ مطالبہ مزید شدت پکڑ گیا۔ جوس والا بھی اطمینان سے وہیں کھڑا تھا۔ جانتا تھا جیت آخر بچوں کی ہوگی۔ آخر کار عاصمہ باجی کو بنوے کا منہ کھولنا پڑا تھا۔

”تم پیو گی اجیہ؟“ ازراہ مروت اس سے بھی پوچھا حالانکہ باجی اتنی بامروت تھیں تو نہیں۔ اجیہ نے تو انکار میں ہی گردن ہلانی تھی، سو ہلا دی۔ اصل رونا اسے تب آیا جب عاصمہ باجی نے دو کے بجائے تین جوس خریدے۔

”آج گرمی بھی تو خوب ہے۔“ بچوں کے جوس میں ان کی اسٹرا ڈالنے کے بعد تیسری اسٹرا ڈال کر انہوں نے اپنے لبوں سے لگالی۔

تیس چالیس روپے کے جوس کی کیا اوقات تھی۔ کیا تھا اگر عاصمہ باجی جوس کا پیکٹ اسے بھی

بس کا چار گھنٹے کا سفر ٹرین میں پانچ چھ گھنٹے میں بدل جاتا ہے۔ گرمی، سردی میں اکاٹومی کلاس کا سفر، ان بچوں کے ساتھ میں کتنی مشکل سے کرتی ہوں۔ اس کا نہ نوید کو اندازہ ہے، نہ اماں کو۔ اگر نوید چار پیسے فالتو خرچ کر کے اے سی والے ڈبے کی بکنگ کرادیں تو موسم کی شدت تو جھیلی نہ پڑے۔ اماں کی تو خیر گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ ان کی مہربانی جو واپسی کے کرائے کے پیسے تھا دیتی ہیں ورنہ تمہارے نوید بھائی تو میکے والی گاڑی میں سوار کروا کر یوں ہاتھ جھاڑ کر فارغ ہوتے ہیں کہ لو بھئی اب تم جانو اور تمہارا کام۔ اللہ اماں کا سایہ سلامت رکھے۔ ہفتہ دس دن کے لیے آتی ہوں پھر بھی موسم کے کپڑے لے دے کر رخصت کرنی ہیں۔ نوید کی تو اس ٹینشن سے بھی جان چھوٹ جاتی ہے۔ بیوی بچوں کے کپڑے بنا کر دینے کی ذمہ داری تک ان کے سر نہیں، پھر بھی مجال ہے جو میرے میکے والوں کی تعریف کے دو بول بول دیں۔ ہر چیز حق سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔“

عاصمہ باجی کے کہنے پر اجیہ کو دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔ یہ ہی ڈائلاگ ثروت بھابھی کے ہوتے تھے، جب وہ میکے سے لدی پھندی سرال لوٹتی تھیں۔ وہ سانس نندوں کو تو کچھ نہ جتا پاتیں۔ ان کے من میں کلبلائی سوچوں کا لفظی اظہار اجیہ کے سامنے ہی ممکن ہوتا۔

اجیہ ایک بہترین خاموش سامع تھی۔ اس بات میں کوئی دورائے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ثروت بھابھی کو لگتا کہ دانش بھائی کی تنخواہ کا بڑا حصہ ان کی اماں گھر کا خرچ چلانے کے نام پر ہتھیالیتی ہیں۔ گھر والوں کو زیادہ تر دال سبزی کھلا کر وہ جو پیسہ بچاتی تھیں، وہ ان کی بیٹیوں پر خرچ ہوتا تھا۔

”چلو، اگر اماں نادیاہ کے جہیز کے لیے جوڑ توڑ کر س تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کل کو اس کی شادی کا خرچہ بھی دانش نے ہی اٹھانا ہے۔ اچھا ہے، ان کی تنخواہ سے بچا بچا کر اماں نادیاہ کا جہیز جوڑ لیں لیکن عاصمہ اور اس کے بچوں پر بلا وجہ پیسے لٹائے جائیں۔“

بھرے انداز میں واضح کر دیا کہ وہ شوہر کو کھونے کے بعد بیٹی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتیں۔

اسلم ماموں نے بہن کی خواہش کا احترام کیا حالانکہ نگہت کی بڑی خواہش تھی کہ وہ نند کی دوسری شادی کر کے اس سے پیچھا چھڑوا لیں۔ ان کا چچا زاد رنڈوا بھائی بھی ناہید بیگم کا طلب گار بن کر آیا لیکن اسے اجیہ کا وجود گوارا نہ تھا۔ نگہت مامی نے شوہر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ رشتہ ہو لینے دیں۔ دو ذمہ داریوں میں سے ایک تو کم ہو۔ اجیہ کا کیا تھا، اب بھی تو یہاں پل رہی تھی بعد میں بھی پلتی رہے گی بلکہ ناہید شادی کے بعد شوہر کو راضی کر کے اپنے گھر میں اجیہ کی جگہ خود ہی بنوالے گی۔ نگہت مامی نے نند کی مرضی نہ ہونے کے باوجود اس رشتے پر زیادہ ہی زور دیا تو اسلم ماموں نے سخت الفاظ میں انہیں تنبیہ کر دی کہ وہ ان کوششوں سے باز رہیں۔ ناہید کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ مزید یہ کہ بہن، بھائی کا وجود ان پر بھاری نہیں۔ وہ ساری زندگی ان کی کفالت کرنے کو تیار ہیں۔

ماموں نے اپنے کہے کا مان رکھا۔ کم از کم ان کی زندگی تک اس گھر میں اجیہ یا اس کی ماں کو کوئی تنگی نہ ہوئی۔ انہوں نے جیسا اپنے بچوں کو کھلایا، پہنایا۔ ویسا ہی اجیہ کو بھی لا کر دیا۔ جو محبت اپنے بچوں پر لٹانی، وہ ہی اجیہ کے حصے میں آئی اور یہ سب نگہت مامی سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ انہیں ساری عمر یہ قلق ستا رہا کہ بہن اور بھائی کے پیچھے ان کی اور ان کے بچوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ حالانکہ ناہید بیگم بہت صلح جو فطرت کی مالک تھیں۔ انہوں نے بھانج کی راجدھانی میں بھی مداخلت کی کوشش نہ کی۔ بھائی کی محبت کا بھی کبھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا۔

اجیہ ماں کا پر تو تھی۔ جوں جوں اسی پر خوش ہو جانے والی، اس نے جان نچھاور کرنے والے ماموں سے کبھی کوئی ضد، فرمائش یا مطالبہ نہ کیا۔ اس سے تین برس بڑی نادیدہ تھی، وہ باپ کی لاڈلی بھی تھی اور ضدی بھی۔ ماموں لاڈلی کی ضد پوری کرنے کو جو

خرید دیتیں۔ اس بار رونا پیاس کی شدت پر نہیں بلکہ اپنی کم مائیگی پر آ رہا تھا۔ اس کے آنسو اس حد تک فرماں بردار تو تھے کہ گالوں پر پھیلنے کے بجائے آنکھوں کے کناروں پر ہی جذب ہو جاتے پھر بھی اجیہ نے کھڑکی کی طرف رخ کر کے باہر کے نظاروں میں گم ہونا چاہا۔

”یہ لودو چار گھنٹہ تم بھی پی لو۔“ عاصمہ باجی نے چند لمحوں بعد اسے مخاطب کیا۔ پیاس کی شدت پر انا حاوی ہوئی۔

”پانی کی پیاس ہے باجی! بیٹھے جوس کے بعد اور بڑھ جائے گی۔“ اس نے رسائیت سے انکار کر دیا۔

”مما! آپ سے ختم نہیں ہو رہا تو مجھے دے دیں۔“ بنٹی اپنے والے خالی ڈبے کا پٹا خاپھوڑ کر ماں سے مخاطب ہوا۔

”کم بخت، تیرا پیٹ ہے یا حرم گیٹ۔“ عاصمہ باجی نے اسے لتاڑا۔

ٹوٹی بھائی کی بے عزتی پر کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ بنٹی نے جواب میں اس کی پونی کھینچ لی۔ چند لمحوں میں ہی ٹرین کے ڈبے میں دونوں بچوں کا زوردار دنگل شروع ہو گیا تھا۔ عاصمہ باجی نے دونوں کی کمر پر دھمو کے جڑ کر انہیں الگ کر دیا۔

اجیہ اس ہنگامے سے بے نیاز پھر سے اپنی سوچوں میں گمن ہو گئی تھی۔ جانے زندگی اب کون سا ورق پلٹ کر سامنے آنے والی تھی۔ ماموں کا گھر جیسا بھی تھا، وہاں گھر والوں کی اپنائیت نہ ہونے کے باوجود گھر اپنا ہی لگتا تھا۔ اجیہ نے تو ہوش ہی اس گھر میں سنبھالا تھا۔

☆☆☆

وہ چار برس کی تھی جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا۔ بیوہ ماں اسے لے کر بھائی کے در پر آن پہنچی۔ اسلم ماموں نے بیوہ بہن اور بھائی کو اپنے شفقت بھرے سائے میں لے لیا۔ انہوں نے بہن کے عقد ثانی کی کوشش کی لیکن ناہید بیگم نے لجاجت

کچھ اسے دلاتے، ویسا ہی اجیہ کے لیے بھی آتا اور یہ بات مامی کی برداشت سے باہر تھی۔

ان کے تین بچے تھے، سب سے بڑے دانش بھائی جو گھریلو معاملات سے بے نیاز اپنے ہی یاروں دوستوں میں مشغول رہتے۔ پھر عاصمہ باجی اور سب سے چھوٹی نادیہ۔ بیٹیاں ماں کی سکھائی، پڑھائی کے زیر اثر بیوہ پھوپھی سے بھی خار کھاتیں اور اجیہ سے بھی چڑنی رہتیں۔ ماموں دہنگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی میں نگہت کھل کر اپنا عناد ظاہر نہ کر سکیں۔

پھر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ماموں زندگی کی بازی ہار گئے۔ تو اس گھر میں اجیہ اور ناہید بیگم پر زندگی کا سب روپ آشکار ہونے لگا۔ اب مامی کو کسی کا ڈرنہ تھا، وہ کھل کر اپنا عناد ظاہر کرنے لگیں۔ ناہید بیگم اور اجیہ سے برابری کے حقوق واپس لے کر اس گھر میں ان سے دوسرے درجے کے شہریوں جیسا برتاؤ ہونے لگا۔ ناہید بیگم اپنی ذات کے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتیاں تو خاموشی سے برداشت کرتی رہیں لیکن اجیہ کی حالت دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ ان کی ذہین، فطین اور خوب صورت بچی اس گھر کی ملازمہ بن کر رہ گئی تھی۔ دانش جس کی شادی کو ابھی کچھ عرصہ ہی ہوا تھا، اس کی بیوی بھی ساس نندوں کی دیکھا دیکھی اجیہ سے نخوت بھرا رویہ اختیار کرتی۔

سب سے بڑی عاصمہ تو بیاہ کر چلی گئی لیکن نادیہ جو اب تک اجیہ کی ذہانت اور خوب صورتی کی وجہ سے اپنی جلن دل میں رکھنے پر مجبور تھی، اب اسے کسی کا ڈرنہ رہا۔ وہ اجیہ کے ساتھ حد درجہ تحقیر بھرا سلوک کرنے لگی۔ ناروا حالات کے باوجود ایف ایس سی میں اجیہ نے جان توڑ محنت کر کے شان دار نمبر حاصل کر لیے تھے۔ اپنے شہر کے میڈیکل کالج کا تو میرٹ نہ بن پایا لیکن قریبی شہر کے میڈیکل کالج کی دوسری میرٹ لسٹ میں اس کا نام آ گیا تھا۔

ماں بیٹی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اجیہ کو اپنی کامیابی خوش گوار مستقبل کی ضمانت لگتی تھی۔ بس وہ

ایک بار۔ ڈاکٹر بن کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی تو ماں کے ساتھ اس گھر سے دور چلی جاتی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ میرٹ بننے کے باوجود اس کا ڈاکٹر بننے کا خوب آنکھوں سے نوح کر پھینک دیا جائے گا۔

نگہت مامی نے واضح الفاظ میں جنادیا کہ اگر وہ پڑھائی کی خاطر دوسرے شہر ہوٹل میں رہائش رکھنا چاہتی ہے تو اس گھر سے دونوں ماں بیٹی اپنا بوریا بستر سمیت کر ہی جائیں۔ ناہید نے بھابھ کی منست سماجت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مامی کا نخوت بھرا انکار اقرار میں نہ بدلا۔

”دوسرے شہر میں رہ کر لڑکوں کے ساتھ پڑھے گی تو جانے تمہاری بیٹی کیا گل کھلائے۔ نہ بابا! ہم عزت دار لوگ ہیں اور پھر یہ تو بتاؤ، اتنی مہنگی پڑھائی کا خرچہ کون اٹھائے گا۔ اب تو تمہارا بھائی بھی قبر میں جا سویا ہے، پھر کس برتے پر ایسا قدم اٹھا رہی ہو۔ جانتی بھی ہو، کتنی مہنگی پڑھائی ہے۔ ہوٹل کا خرچہ علیحدہ۔“

”پڑھائی کے خرچے کی فکر نہ کریں نگہت بھابھی! میرے پاس جو تھوڑا بہت زیور پڑا ہے، میں وہ بیچ کر اجیہ کی پڑھائی کا خرچہ اٹھا لوں گی۔“ اجیہ کی آنکھوں کی بھٹی جوت دیکھ کر ناہید کی منت میں اور شدت آ گئی۔

”زیور کی بات تو ایسے کر رہی ہو، جانے کتنا ڈھیر سونے کا موجود ہے۔ وہ جو چار، ساڑھے چار تو لے زیور تم نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے نا بی بی! وہ اپنی بچی کی شادی کے لیے سنبھال کر رکھو۔ میں نے خود اپنی بیٹی بیانی ہے۔ تمہاری بچی کی شادی کا خرچہ ہم نہ اٹھایا میں گے۔“

”اجیہ ڈاکٹر بن گئی تو اپنی شادی کا خرچہ خود اٹھالے گی بھابھی!“ اس بار ناہید پست آواز میں بولی تھیں۔

”بی بی! میرا سر تو کھاؤ نہیں، کہہ تو دیا، جانا ہے تو دونوں جاؤ۔ جان بخشو ہماری۔ ہاں پھر دوبارہ اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے کا مت سوچنا۔“ مامی کا کہا

حرف آخر تھا۔ ناہید خاموش ہو گئیں۔
ایسے خود سے لپٹا لپٹا کر، دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔

”بچی بے چاری بے سہارا رہ گئی۔ باپ پہلے نہ تھا، اب ماں بھی ساتھ چھوڑ گئی۔“ کوئی پڑوس کی عورت اس ترحم آمیز انداز میں مخاطب تھی۔

”کیوں ہونے لگی بے سہارا۔ ہم ہیں نا اس کے والی وارث۔“ نگہت مامی چمک کر بولیں اور پھر سے اجبیہ کو سینے سے چمنا لیا۔

اجبیہ نہیں جانتی تھی، مامی کا یہ رویہ خدا خوفی ہے یا دنیا دکھاوا۔ سچ تو یہ تھا کہ اب اسے کسی دلا سے، سلسلی یا ہمدردی سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ اللہ کی ذات سے صبر کی طالب ہوئی تھی اور اللہ نے رفتہ رفتہ اسے صبر سے نوازا بھی تھا۔ اس کی صابر، شاکر ماں رب کی رحمت کے سائے میں یقیناً بہت اچھے مقام پر تھی۔ وہ دنیاوی آلام سے چھٹکارا پا کر ابدی سکون پا چکی تھی۔ ماں کے سکون کا سوچ کے اجبیہ اپنے بے قرار اور وحشت زدہ دل کو پر سکون کرنے کی کوشش کرتی۔ کچھ عرصے تک گھر والوں نے بھی اس کے حال پر رحم کھایا تھا۔

☆☆☆

وہ سارا سارا دن ماں کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن پاک پڑھتی رہتی۔ کوئی اسے گھر کے کام کے لیے آواز نہ لگاتا لیکن انسان جبلت کا غلام ہے۔ نگہت مامی کی خدا خوفی یا دنیا دکھاوے کی میعاد بس ڈیڑھ، دو مہینے تک ہی تھی۔

فقط ثروت بھابھی تھیں جن کے طرز عمل میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ انہوں نے ہی شوہر سے کہہ کر اجبیہ کا آگے کالج میں داخلہ کروایا تھا۔ دانش بھائی نے ہی کتابیں وغیرہ خرید کر لادیں۔ یہ اور بات کہ مامی ان کے اس اقدام پر ہرگز خوش نہ تھیں اور بہت دیر تک بڑبڑاتی رہی تھیں۔

”پڑھائی میں لگے گی تو اماں! اس کا غم غلط ہو جائے گا۔ کیا جائے گا دس سال اور پڑھنے دیں پھر بٹھالینا۔ اس کو بھی نادیہ کی طرح گھر میں۔“

”آپ فکر مت کریں امی! میں لی ایس سی کر لوں گی، اس کے بعد ایم ایس سی۔ ڈاکٹر نہ سہی یچنگ لائن میں آ جاؤں گی۔“ اجبیہ کے کہنے پر ناہید نے غم آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا۔ حوصلہ انہیں بیٹی کو دینا چاہیے تھا، التا وہ انہیں سمجھا رہی تھی۔

”اللہ کی رحمت سے کبھی نا امید یا مایوس نہ ہونا میری بچی! نہ ہی اس دنیا میں صرف بے حس اور کٹھور لوگ بستے ہیں۔ اللہ کی رحمت بہت بڑی ہے۔ میری بیٹی ان شاء اللہ آنے والی زندگی بہت شادمانی میں گزارے گی۔ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔“ وہ بیٹی کا ہاتھ چوم کر کھوئے کھوئے انداز میں خود کلامی کر رہی تھیں۔

”کیا ہوا امی! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اجبیہ کو ماں کا انداز غیر معمولی لگا تھا۔

”میری بیٹی کے خواب ٹوٹے ہیں، بس تھوڑا سا اداس ہوں لیکن نہیں چاہتی کہ یہ اداسی تمہاری آنکھوں میں ڈیرا جمائے۔ خوش گمانی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا اجبیہ! اور مایوسی کو خود پر حاوی نہ ہونے دینا۔ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔“ وہ بیٹی کو سمجھا رہی تھیں۔

اجبیہ نے آنسو پونچھ کر ماں کے ہاتھ چومے اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ ماں کی یہ نصیحتیں اور دعائیں اس کی زندگی کی آخری دعائیں ہیں۔ خواب بیٹی کے ٹوٹے تھے، دل مان کا ٹوٹا اور ایسا ٹوٹا کہ اس نے دھڑکنا ہی چھوڑ دیا۔

وہ رات سوئیں تو سوتی کی سوتی رہ گئیں۔ نئے دن کا سورج طلوع ہوا تو اجبیہ کو پتا چلا، سر پر قیامت ٹوٹنا کسے کہتے ہیں۔ باپ کا رشتہ تو وہ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی کھو بیٹھی تھی، اس کے جینے کا آسرا ہی اس کی ماں تھی۔ ماں کے بچھڑنے کے بعد وہ جانے کیسے اور کیوں زندہ تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اپنے اور پرانے سب اشک بار ہو رہے تھے۔ نگہت مامی بھی

نادیہ پاؤں بچ کر چلی جاتی۔

☆☆☆

بی ایس سی کے فائنل پیپرز سے ذرا پہلے نادیہ کے لیے رشتہ آیا تھا۔ اسلم ماموں کے کسی قریبی دوست کی بہن اپنے بیٹے کے لیے رشتہ تلاشتی نگہت مامی کے ہاں آن پہنچی۔

سوئے اتفاق وہ اجیہ کی غیر موجودگی میں گھر آئیں۔ اجیہ اس وقت کالج گئی ہوئی تھی۔ نادیہ نے تمیز دار بی بی بن کر ثروت بھابی کے ہاتھ کے بنے کبابوں اور چٹا چاٹ سے ان کی تواضع کی۔ چہرے پر نہ نظیر آنے والے میک اپ کی تو وہ ویسے بھی ماہر ہو چکی تھی۔ سر پر سلیقے سے دوپٹا جمائے ایک سکھڑ اور سلیقہ مند لڑکی کے روپ میں وہ مہمان خواتین کو پسند آ گئی۔

اس پسندیدگی کا انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اظہار بھی کر دیا۔ نگہت مامی خوشی سے پھولے نہ سار ہی تھیں، جو اتنی اچھی جگہ بات بننے جا رہی تھی ورنہ اب تک نادیہ کے جو بھی رشتے آئے، وہ ایسی ویسی جگہوں سے ہی آئے تھے۔ جب مہمان خواتین کو لینے کے لیے ان کا بیٹا دروازے پر دستک دے رہا تھا، وہ ہی وقت اجیہ کا کالج سے واپسی کا تھا۔ ہاتھ میں کتابیں، چہرے پر تھکن، وہ ایک اجیہ کی کو دروازے پر دیکھ کر ٹھٹکی۔ قریب ہی گاڑی کھڑی تھی۔

”میری امی اور آپا اندر ہیں، دو بار بیل بجا چکا ہوں۔ کوئی دروازے پر نہیں آیا۔ آپ پلیمز اندر جا کر بتادیں، فرحان باہر آیا ہوا ہے۔“

نوجوان نے اسے شائستگی سے مخاطب کیا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ اسی لمحے نگہت نے دروازہ کھولا تھا۔ اجیہ خاموشی سے اندر چلی گئی، اب یقیناً مامی نے اس بندے کو خود ہی اٹینڈ کرنا تھا۔ اندر براجمان خواتین نے اس کے سلام کرنے پر اسے بغور دیکھا تھا۔ ثروت بھابی کے تعارف پر جب انہیں پتا چلا کہ وہ ناہید بیگم کی بیٹی ہے تو وہ بہت محبت سے ملیں۔ اسلم ماموں کے دوست کی بہن اس کی ماں

دانش نے ماں کو سمجھایا حالانکہ نادیہ کے گھر بیٹھنے میں سراسر اس کا اپنا کمال تھا۔ اس نے گر پڑ کر میٹرک پاس تو کر لیا تھا مگر دوبار کی کوشش کے باوجود جب سادہ مضامین میں بھی ایف اے پاس کرنے میں کامیاب نہ ہوئی تو اس نے پڑھائی کو دفع دور کہہ کر گھر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ اب وہ سارا سارا دن فلمیں دیکھتی یا آس پڑوس کی سہیلیوں کے گھر وقت گزاری کے لیے چلی جاتی۔

اجیہ کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے بھی وہ ہی ماں پر دباؤ ڈالتی تھی۔ اسے یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ اجیہ شکل کے ساتھ ساتھ تعلیم کے میدان میں بھی اس سے آگے نکل جائے۔ اپنی سانولی رنگت تو اس نے کریموں، پینچ اور مستقل فیشنل کے ذریعے چمکالی تھی، اجیہ جیسی ذہانت پیدا کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اس کی کوششوں کے باوجود اجیہ کا بی ایس سی میں داخلہ ہو گیا تھا۔

اجیہ ثروت بھابی کی ممنون و احسان مند تھی جن کے دل میں اللہ نے اس کے لیے رحم ڈال دیا تھا۔ اب اس نے ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر لی۔ نگہت مامی اس کی پڑھائی پر ایک دھیلا خرچ کرنے کو تیار نہ تھیں، اجیہ نے پاس پڑوس کے بچوں کو ٹیوشن پڑھائی شروع کر دی۔ برائے نام فیس میں اتنا اچھا ٹیوٹر کہاں سے ملتا۔ جلد ہی گھر بچوں سے بھر گیا۔ لیکن اب نادیہ سے شام کے دو گھنٹے بچوں کا شور برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔

”یہ گھر ہے یا چڑیا گھر۔ دو گھڑی کا سکون میسر نہیں۔ بچوں کی چیخ چیخ سے میرا سر پھٹنے کو ہو جاتا ہے۔ چھٹی کروان بچوں کی۔“ وہ اجیہ کے سر پر کھڑی ہو کر چلائی۔ اجیہ بے بسی سے اس کو دیکھ کر رہ جاتی۔ ”کل بچوں کا پیپر ہے نادیہ! ابھی سے چھٹی کیسے دے دوں۔ بس تھوڑی دیر اور برداشت کر لو۔ اب ان میں سے کسی کی آواز بھی نہیں نکلے گی۔ بچوں! خبردار جواب کسی نے شور کیا۔“ وہ نادیہ کی منت کے بعد بچوں کو بھی ڈپٹی۔

سے بھی بخوبی واقف تھیں۔

مناسب ہے تو اس کی ذمہ داری سے تو جان چھڑاؤ۔
اللہ ہماری نادیدہ کا نصیب بھی کھولے گا۔“ ثروت
بھابھی نے ساس کو صلاح دینی چاہی۔
”ارے جو لوگ میری بچی کو مسترد کر گئے، انہیں
تو میں دوبارہ اس گھر کی دہلیز نہ پار کرنے دوں۔“ وہ
نخوت سے بولیں۔ ثروت بھابھی نے ترحم بھری نظر
اجبیہ پر ڈالی، جو کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی مجرموں
کی طرح سر جھکائے مامی کی لعن طعن سن رہی تھی۔

☆☆☆

چند ماہ بعد اس کی زندگی میں ایک اور طوفان آیا
تھا۔ سمیع اللہ جس کے باپ کا محلے میں سب سے بڑا
جنرل اسٹور تھا اور وہ خود باپ کے کام میں ہاتھ بٹاتا
تھا۔ اس کا اجبیہ کے لیے رشتہ آنا گھر میں ایک
بھونچال کا سبب بن گیا۔

”میری نادیدہ بڑی ہے، مجھے پہلے اس کا سوچنا
ہے بھابھی! اجبیہ تو ویسے بھی ابھی پڑھ رہی ہے۔“
گنہت مامی نے سمیع اللہ کی ماں کی توجہ نادیدہ کی جانب
مبذول کروانا چاہی تھی۔

”آپ کا کہنا اپنی جگہ درست ہے گنہت بھابھی!
لیکن سمیع اللہ کی خواہش ہے، لڑکی پڑھی لکھی اور
باشعور ہو۔ بس میں اسی لیے اجبیہ کی طلب گار بن کر
آئی ہوں۔ اجبیہ ہماری آنکھوں کے سامنے پلی بڑھی،
کیسی سمجھ دار اور سنبھلی ہوئی بچی ہے پھر اس کی مرحومہ
ماں میری کتنی اچھی سہیلی تھی۔ بس یوں سمجھیں میں اس
کی نشانی کو اپنے سمیع کے سنگ رخصت کروا کے اپنے
گھر لے جانا چاہتی ہوں۔“

سمیع اللہ کی ماں کی ساری باتیں تو گنہت مامی
نے درخور اعتنائہ جانیں، ان کی سونی اسی بات پر انک
گئی کہ سمیع اللہ کو پڑھی لکھی لڑکی کا ساتھ درکار ہے۔
اس کی ماں کے گھر سے نکلتے ہی اجبیہ کی شامت آگئی
تھی۔

”یہ پڑھائی کے بہانے لڑکوں کو پھانسی ہے۔
کیسے منہ پھاڑ کر کہہ کر گئی ہے سمیع اللہ کی ماں کہ اس
کے بیٹے کو پڑھی لکھی لڑکی چاہیے۔ ارے یہ دنیا میں

ناہید بیگم کی ناگہانی وفات پر انہوں نے دلی
افسوس کا بھی اظہار کیا۔ ماں کے ذکر پر تواجیہ کے
آنسو خود بخود نکل آتے تھے۔ اس کے آنسو دیکھ کر
خاتون نے اسے ساتھ چمٹا کر مزید سلی دی۔ چند لمحوں
بعد گنہت مامی نے انہیں ان کے بیٹے کے آنے کی
اطلاع دی تو وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

”بہت شرمیلا بچہ ہے۔ بہتیرا کہا کہ اندر
آجائے مگر باہر ہی کھڑا ہے۔“ گنہت مامی نے مسکرا کر
خواتین کو مخاطب کیا۔

تین دن بعد خواتین کی دوبارہ آمد ہوئی تھی۔
پچھلی ملاقات میں تو انہوں نے نادیدہ کے لیے صرف
ڈھکے چھپے الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا لیکن
آج جب وہ باقاعدہ رشتہ مانگنے آئیں تو انہوں نے
اجبیہ کا نام لے کر رشتہ مانگا۔ گنہت مامی نے انہیں واضح
الفاظ میں باور کروا دیا کہ نادیدہ بڑی ہے۔ انہوں نے
پہلے نادیدہ کے بیاہ کا سوچنا ہے، مزید کہ اجبیہ کی
نہ احوال شادی کا ان کا کوئی ارادہ نہیں۔

”نادیدہ بھی بہت پیاری بچی ہے لیکن دراصل
فرحان کو اجبیہ ایک ہی جھلک میں اتنی پسند آئی کہ اس کا
اصرار ہے، اجبیہ سے رشتہ طے کیا جائے۔“

فرحان کی بہن نے ذرا جھجکتے ہوئے بھائی کی
پسندیدگی سے بھی آگاہ کر دیا تا کہ گنہت بیگم صورتحال
سمجھ کر نادیدہ کے بجائے اجبیہ کے لیے رشتہ قبول
کر لیں۔ اس بے چاری کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
کہ یہ بات اجبیہ کی زندگی میں کیسا طوفان لے آئے
گی۔ مگر بڑے تیوروں کے ساتھ مہمانوں کو رخصت
کرنے کے بعد گنہت بیگم اجبیہ پر چڑھ دوڑیں۔

”ایسے پچھن ہیں اس لڑکی کے۔ دروازے پر
کھڑے کھڑے جانے کیا آنکھ مڑا کیا کہ لمحوں میں
لڑکے کو پھانس لیا۔ اچھا بھلا میری نادیدہ کا نصیب کھل
رہا تھا، اس کی وجہ سے اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل
گیا۔“ غیض و غضب سے ان کا برا حال تھا۔

”اماں! شادی تو اجبیہ کی بھی کرنی ہے نا۔ رشتہ

آخری پڑھی لکھی لڑکی بنی ہے کیا، جو ہر کوئی اسی کا طلب گار بن کر آ رہا ہے۔ یتیم بستر، نہ کوئی والی وارث، ایسی لڑکیوں کو تو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ اس کے طلب گاروں کی فہرست ہی ختم نہیں ہو رہی۔“

نگہت مامی کا جلن اور حسد سے برا حال تھا۔ سمیع اللہ کی ماں کا اجبیہ کو پڑھا لکھا اور باشعور کہنا اور نادیدہ کورشتے کے لیے زیر غور ہی نہ لانے کا مطلب یہ ہی تھا کہ ان کی نادیدہ جاہل اور بے شعور ہے۔ لاڈلی کی یہ ناقدری ان کی برداشت سے باہر تھی۔

”بس اس نے جتنا پڑھنا تھا، پڑھ لیا۔ کل سے یہ گھر سے قدم باہر نہیں نکالے گی۔ ہم عزت دار لوگ ہیں، یہ تو ہر دوسرے دن اپنے پیچھے کسی کو لگا کر گھر لے آئے گی۔ آج سمیع اللہ اس کا طلب گار بن کر آیا، کل کوئی دوسرا آ جائے گا۔ سن لیا ناں اجبیہ! کل سے تمہارا کالج جانا بند۔“

وہ پھنکاری تھیں۔ اجبیہ نے حیرت اور بے بسی سے انہیں دیکھا۔ کتنی بے بنیاد باتیں اور الزام تھے یہ۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مامی کے تیور اتنے غضب ناک تھے کہ وہ کچھ بول ہی نہ پائی۔

”جس گھر میں میری ہو، وہاں پتھر تو آتے ہیں اماں! اگر اجبیہ کا کوئی رشتہ آ گیا ہے تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور۔ اور کہیں نہ کہیں تو اسے بھی بیاہنا ہے ناں۔ کر دو اس کی شادی۔ اچھا بھلا لڑکا ہے سمیع اللہ۔ محلے میں سب سے کھانا پیتا گھرانا ہے ان کا۔ ایسے رشتے بار بار نہیں آتے۔“ ثروت بھابھی نے اس کی حمایت میں زبان کھولی۔

”ہاں، وہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں، ایسے رشتے صرف اسی منحوس ماری کے کیوں آتے ہیں۔ میری نادیدہ میں کس چیز کی کمی ہے بھلا۔“ ان کا دلی قلق ان کی زبان پر آ گیا تھا۔

”محلے کی مائیں اندھی نہیں ہیں جو نادیدہ کے کرتوت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوں۔ اسے اوٹ پٹا فیشن کرنے محلے کے بیوٹی پارلر کے چکر لگانے اور انڈین فلمیں دیکھنے کے سوا کوئی تیسرا کام آتا ہے۔“

بھلا۔ گھر میں ہل کر پانی تک تو پیتی نہیں۔ فارغ بیٹھ بیٹھ کر وزن کتنا بڑھ گیا ہے۔ گھر داری کا کوئی سلیقہ نہیں۔ کوئی پاگل ہے جو اس کا طلب گار بن کر آئے گا۔“

ثروت بھابھی جو تنگ مزاج نند کے خروں اور کاہلی سے عاجز آئی ہوئی تھیں، آج دل کٹا کر کے سب کچھ بول ڈالا۔ ویسے بھی اب گھر کا واحد کفیل ان کا شوہر تھا۔ وہ کیوں ساس تندوں کے بے جا خمرے برداشت کرتیں۔ ثروت بھابھی کی باتوں نے گھر میں طبل جنگ بجا دیا تھا۔

اس شام گھر میں گھسان کارن پڑا تھا۔ اجبیہ خاموش تماشا کی تھی۔ وہ اس لڑائی کا فریق تک نہ تھی لیکن لڑائی کا حتمی نتیجہ اس کے کالج جانے پر پابندی کی صورت نکلا۔ مامی نے اسے فساد کی جزا فرار دیتے ہوئے حکم نامہ جاری کر دیا کہ آئندہ وہ گھر سے قدم باہر نہیں نکالے گی۔

دو چار دن گزرنے کے بعد جب اجبیہ کو لگا کہ معاملہ ٹھنڈا اور مامی کا غصہ کم ہو گیا ہے، اس نے صبح کے وقت مامی سے ڈرتے ڈرتے پھر کالج جانے کی اجازت چاہی۔ یہ اس کی خام خیالی تھی کہ مامی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ وہ تو اس قدر طیش میں آئیں کہ اس کی کتابیں تک پھاڑ ڈالیں۔

”اللہ کے لیے مامی! ایسا مت کریں۔ دو ماہ بعد میرے پرچے ہو جائیں گے، میں آگے پڑھنے کا نام نہیں لوں گی۔“

وہ اپنی کتابوں کو پرزہ پرزہ ہوتے دیکھ کر ان کے آگے گڑ گڑا رہی تھی۔ مامی نے ایک نہ سنی۔ ”اگر گھر سے باہر قدم نکالے گی تو اپنے کسی پار کے ساتھ ہی دفعتان ہو جانا۔ دوبارہ اس گھر کی دہلیز پار کرنے کی جرأت نہ کرنا۔“

اس گھٹیا اور بازاری زبان کے استعمال کے بعد اجبیہ نے ان کے آگے گڑ گڑانا بند کر دیا۔

اسے ہمیشہ سے ایسے لوگوں کی کہانیاں پڑھ کر حوصلہ ملتا تھا جو جدوجہد کے ذریعے اپنی زندگی کے

”بھئی، آپ نے اتنا جامع اور تفصیلی تعارف کروایا ہے، جیسے یہ خاتون ملک کی کوئی مشہور و معروف ہستی ہوں۔ میں یہ سمجھا کہ میں ہی ان کی شہرت سے لاعلم ہوں۔ اپنی لاعلمی کے اعتراف کے بجائے یہ ہی کہنا مناسب جانا کہ اچھا تو یہ ہیں اجیہ۔“
بندہ باتونی تھا۔ انی ذات کو گفتگو کا موضوع بننا دیکھ کر اجیہ کو کوفت ہوئی لیکن خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

”میری مرحومہ پھوپھو کی بیٹی ہے۔ اب کچھ عرصے کے لیے ہمارے ہاں ہی رہے گی اور تم یہ بتاؤ کہ تمہارے نوید بھائی ہمیں لینے کیوں نہیں آئے۔ اتنے دنوں بعد بیوی بچے گھر لوٹ رہے ہیں، پھر بھی اس بندے کو فرصت نہیں۔“ ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل کر پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے عاصمہ باجی نے شوہر کی غیر موجودگی کی بابت استفسار کیا تھا۔

”آج اتفاق سے ایک دوست کی گاڑی ہاتھ لگی تھی۔ آپ کے شوہر نام دار نے موقع غنیمت جانا، سو چائیکسی گے کرائے سے جان چھڑوا کر کرائے کی گاڑی اور مفت کے ڈرائیور سے فیض یاب ہو لیا جائے۔ ویسے تو یہ گاڑی بھی پانی سے تو چلتی نہیں اور اتنے اچھے نوید بھائی ہیں نہیں کہ مجھے پٹرول کے مد میں کچھ پیسے ہی عنایت کر دیتے۔ بس بندہ ناچیز مروت میں مارا جاتا ہے۔“

غالب کے کہنے پر عاصمہ باجی نے کھسپائے بغیر اسے زبردست گھوری سے نوازا تھا۔

بچے گاڑی میں بیٹھ کر خوب پر جوش ہو گئے۔
”آپ نے گاڑی لے لی جاچو! اب آپ ہمیں روز سیر کروایا کریں گے نا؟“ بیٹی اور سنی تصدیق چاہ رہے تھے۔

”ہماری ایسی قسمت کہاں پارٹنر؟“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”بابا لینے کیوں نہیں آئے؟“ ثومی نے منہ

بسورا۔

مزاج کے لوگوں سے واسطہ پڑے۔
عاصمہ باجی کے منہ سے ہمیشہ ان کی ساس کی برائیاں سنی تھیں۔ بقول ان کے وہ خاصی خراٹ اور چالاک قسم کی خاتون تھیں، اب پتا نہیں وہ اپنے گھر میں اجیہ کو قبول کرتی بھی ہیں یا نہیں۔
اجیہ اسی ادھیڑ بن میں تھی۔

عاصمہ باجی کے شوہر نوید بھائی اجیہ کو کافی معقول شخص لگتے تھے حالانکہ وہ سسرال بہت کم آتے تھے۔ بیوی کوٹرین میں میکے کے لیے سوار کر دیتے اور گھر واپسی پر بیوی بچوں کو اسٹیشن پر لینے آ جاتے لیکن آج جب ٹرین منزل مقصود پر پہنچی تو اسٹیشن پر نوید بھائی موجود نہ تھے۔ وہ کوئی اور تھا، بچوں نے ٹرین کی رفتار ہلکی ہوتے ہی کھڑکی میں سے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ ”غالب چاچو آئے ہوئے ہیں“ کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ٹرین رکی تو غالب نے ڈبے میں چڑھ کر فافٹ سایاں اتارا تھا۔

اجیہ جانتی تھی کہ عاصمہ باجی کا کوئی دیور نہیں ہے۔ ان کی دو بچا پھانسی ٹائپ کی نندیں خیر سے دور دراز کے شہروں میں مقیم تھیں۔ یہ یقیناً ان کے چچا سرکار کا بیٹا تھا۔ نوید بھائی کی بیوہ چچی ان کے اوپر والے پورشن میں رہتی تھیں۔ عاصمہ باجی کے منہ سے ان کا ذکر اجیہ نے کئی بار سن رکھا تھا۔ اس لیے اسے غالب کو پہچاننے میں دقت نہ ہوئی۔ غالب نے البتہ چھوٹے ہی عاصمہ باجی سے اس کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

”یہ جو خاتون آپ کے پیچھے چلتی آرہی ہیں، کیا یہ آپ کے ساتھ ہیں بھانجی! یا کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر آپ کے پیچھے چل پڑی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”ارے، یہ اجیہ ہے۔ میرے ساتھ آئی ہے۔“
عاصمہ باجی نے سرسری سا تعارف کروانا ہی ضروری سمجھا۔

”اچھا..... تو یہ ہیں اجیہ۔“ وہ جملہ کھینچ کر بولا۔
”کیا مطلب؟“ عاصمہ باجی نے اسے گھورا۔

”دیکھا، یہ ہوتی ہیں بیٹیاں۔ ان نالائقوں کو باپ کی پروا ہی نہیں۔ برائی گاڑی دیکھ کر ہی خوش ہو رہے ہیں۔“ اس نے ہتھیجوں کو گھورا۔

”ویسے نوید کیا کر رہے تھے۔ آئے کیوں نہیں؟“ شوہر کا نہ آنا عاصمہ کو بھی کھل رہا تھا۔

”بار بار یہ سوال پوچھ کر کیوں شرمندہ کرواتی ہیں عاصمہ بھابھی! میرا بے چارہ بھائی آپ کے بیڈ روم کی صفائی ستھرائی کر کے اس قابل بن رہا ہے کہ آپ کمرے میں داخل ہوتے ہی چیخ نہ ماریں۔ پندرہ بیس دن کا پھیلا واسمیٹنا آسان کام تھوڑی ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

”کیوں، وہ نسرین مرگئی کیا۔ کام پر نہیں آرہی۔“ عاصمہ نے ملازمہ کے بارے میں استفسار کیا۔

”نسرین تو نہیں مری، البتہ اس کی ساس مرگئی ہے۔ کہتی ہے گھر پر مہمانوں کا رش ہے، چند دن مزید چھٹی کرے گی۔“

”اس کم بخت کی تو میں اب پکی چھٹی ہی کر دوں گی۔“ عاصمہ نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

اجیہ گاڑی میں ہونے والی بات چیت سے بے نیاز کھڑکی سے باہر کے نظارے دیکھنے میں مشغول تھی۔ لیکن انداز میں کوئی اشتیاق یا محویت نہ تھی۔ وہ ہی سرد و ساٹ سا انداز جواب اس کی شخصیت کا خاصا بن چکا تھا۔ گاڑی کب منزل مقصود پر پہنچی، اسے پتا بھی نہ چلا۔ وہ اپنے خیالوں میں ہی کھوئی ہوئی تھی۔

”اجیہ آئی! چلیں، گھر آ گیا۔“ ثومی نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

”ویسے بھابھی! یہ خاتون پیدائشی ایسی ہیں یا یہ مرض بعد میں لاحق ہوا۔“ غالب بہت سنجیدگی بھری تشویش سے استفسار کر رہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ عاصمہ باجی نے اسے گھورا۔

”مطلب گوئی بہری ہیں تو اشاروں وغیرہ کی زبان سمجھ سکتی ہیں۔“

وہ اس کی مکمل خاموشی کی وجہ سے سنجیدگی سے

شرارتی سوال پوچھ بیٹھا تھا۔ اجیہ کی آنکھیں بحر آمیں۔ اس کی ذات اتنی ارزاں ہو گئی تھی کہ یوں پرائے لوگوں کے ہنسی ٹھنھول کا باعث بننے لگی۔

غالب سے اس کے چہرے کے تاثرات مخفی نہ رہ پائے۔ وہ تو ویسے ہی ہنسوز شخص تھا۔ کسی کی دل آزاری کا اس کا قطعی ارادہ نہ تھا۔ شاید یہ لڑکی ضرورت سے زیادہ ذورنج تھی۔

”معذرت چاہتا ہوں محترمہ! اگر آپ کو میرا مذاق برا لگا۔“ اس نے معذرت کرنے میں لمحہ نہ لگایا۔

اجیہ کو اس بار بھی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بولے۔ عاصمہ باجی کو البتہ اس کا اجیہ کو اہمیت دینا قطعی نہ بھایا تھا۔

”اب جلدی سے سامان ڈگی سے نکالو غالب!

فضول میں در کیوں کر رہے ہو۔“ وہ اسے گھر کتنی آگے بڑھ گئیں۔ اجیہ بھی کسی معمول کے انداز میں ان کے پیچھے چل پڑی۔

عاصمہ باجی نے اپنی باتوں سے اپنے سسرال کا جوہو آس کے دماغ میں بٹھار کھا تھا، وہاں ویسا کچھ نہ تھا۔ ان کی ساس اس سے بہت شفقت بھرے انداز میں پیش آئیں۔ نہ عاصمہ باجی سے اسے ساتھ لانے کا مقصد دریافت کیا، نہ اس کے قیام کی مدت کے بارے میں استفسار کیا۔ نوید بھائی بھی فوراً ہی گلاسوں میں ٹھنڈی سیخ کو لڈ ڈرنک لے آئے۔

”آج سے پہلے تو کبھی گھر واپسی پر ہمیں ٹھنڈی بوتل پلانے کی توفیق نہ ہوئی آپ کو۔“ عاصمہ باجی نے شوہر کی کوئیک سروس پر طنز کیا۔

”بھئی، اجیہ پہلی بار ہمارے گھر آئی ہے نا۔“ وہ پر شفقت انداز میں مسکرائے۔

”یہ مہمان بن کر نہیں آئی، اب اس نے بہت دن یہیں رکنا ہے۔“

عاصمہ باجی نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اجیہ کو ملنے والا پروٹوکول انہیں بھلا نہ لگ رہا تھا۔ وہ تو یہاں اسے گھر کے کاموں میں اپنی مدد کے لیے

لائی تھیں لیکن ان کی ساس ہی ان عزائم کے آڑے آ رہی تھیں۔

عاصمہ نے سچوچ رکھا تھا کہ گھر کا وہ چھوٹا کمرہ جو فالتو کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا ہے اور اسٹور روم کے طور پر کام آتا ہے۔ اجیہ سے اس کی صفائی کروا کر وہیں ایک کونے میں اس کا پلنگ بچھا دیں گی۔ اماں کو اس ارادے کا پتا چلا تو خوب خفا ہوئیں۔

”کمال کرتی ہو بہو! وہ کمرہ رہنے کے قابل ہے، اور تھکی باری بچی آتے کے ساتھ ہی اس کاٹھ کباڑ کی صفائی میں جت جائے۔ نوید سے کہو اس کا پلنگ میرے کمرے میں ڈال دے۔“ انہوں نے عاصمہ کو مخاطب کیا۔

”واہ اماں! اپنے سکے پوتے پوتیوں کو تو کبھی اپنے کمرے میں سنانے کی ہامی نہ بھری۔ اجیہ کے لیے فوراً کمرہ حاضر کر دیا۔“

عاصمہ تنک کر بولیں۔ یہ سوچے بغیر کہ اجیہ ان کے حوالے سے ہی اس گھر میں آئی ہے، اگر گھر والے ان کے میکے کے کسی فرد کو عزت دے رہے ہیں، تو یہ ان کی بھی عزت ہے لیکن ان سے اجیہ کو ملنے والی اہمیت برداشت نہ ہو رہی تھی۔

”میرے پوتے پوتیوں سے بڑھ کر مجھے کون پیارا ہے بہو! لیکن تم خود جانتی ہو، رات کو ہر دو گھنٹے بعد تو کوئی نہ کوئی واش روم جانے کے لیے اٹھ بیٹھتا ہے۔ میرے جوڑوں کے درد کا حال بھی تمہارے سامنے ہے۔ ایک بار لینے کے بعد اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ چلو، یہ بچی ماما تھ سوئے گی تو مجھے بھی کچھ آسرا ہو جائے گا۔“

اماں کا فیصلہ حتمی تھا۔ عاصمہ باجی کے جزبہ ہونے کے باوجود اجیہ کا ٹھکانا اماں کے کمرے میں بن گیا۔

☆☆☆

اگلے روز صفیہ چچی سے ملاقات ہوئی۔ وہ پرائمری اسکول میں پتھر تھیں۔ اسکول جانے سے پہلے حسب معمول جٹھانی کو اللہ حافظ کہنے آئیں۔ اجیہ کو

دیکھ کر نہ حیرت کا اظہار کیا نہ تجسس کا۔ نہ ہی یہ کریدا کہ وہ کتنے دنوں کے لیے آئی ہے۔ بس ایک پر خلوص سی مسکراہٹ کے ساتھ حال وحوال دریافت کیا۔ اب تک کی زندگی میں اجیہ کو ایسے بے ریا لوگوں سے کم ہی واسطہ بڑا تھا۔ اسے پہلی ہی نگاہ میں صفیہ چچی بہت اچھی لگی تھیں۔

”بھئی دوپہر کو تو مجھے اسکول واپسی پر دیر سویر ہو جاتی ہے لیکن آج شام کا کھانا سب میری طرف کھائیں گے۔ ٹھیک ہے بیٹا! تم ضرور آنا۔ تم پہلی بار آئی ہو، اسی لیے باقاعدہ کھانے پر بلارہی ہوں۔ پھر تو جب جی چاہے، اوپر میرے پاس آ جایا کرنا۔“

صفیہ چچی کو اجیہ کی زندگی کے دیگر مصائب کا علم تو نہ تھا، ہاں یہ ضرور پتا تھا کہ کچھ عرصے پہلے ہی وہ ماں جیسی نعمت سے محروم ہوئی ہے۔ اس معصوم سی بچی کی دل جوئی کے لیے انہوں نے اسے اپنائیت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ اسی لمحے عاصمہ باجی بھی اندر آئی تھیں، صفیہ نے شام کی دعوت کا پروگرام ان کے بھی گوش گزار کر دیا۔

”ارے رہنے دیں چچی! پہلے ہی اسکول سے تھکی باری آتی ہیں پھر شام کو ٹیوٹن کے بچے۔ کیوں رات کے کھانے کے تردد میں پڑتی ہیں۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو عاصمہ جھٹ دعوت قبول کر لیتیں لیکن انہیں اجیہ کو دی جانے والی اہمیت کھل رہی تھی۔

”میں نے کیا تردد کرنا ہے بیٹا! جو پکائے گا، غالب ہی پکائے گا۔ مجھ سے زیادہ تو میرے بیٹے کے ہاتھ میں ذائقہ ہے۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

اجیہ ان کی بات پر جی ہی جی میں حیران ہوئی تھی۔ یہ یقیناً عجیب و غریب کیملی تھی۔

عاصمہ باجی کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ پہلے دن ہی اجیہ کے سرگھر کے سارے کام ٹھوپ دیں۔ اتفاق سے کئی چٹیاں بڑا کر آج نسرین بھی چلی آئی۔ عاصمہ باجی نے اسے فی الفور نوکری سے فارغ کر دیا تھا۔ اجیہ جان گئی تھی کہ عاصمہ باجی اب اس گھر میں

جتنے تحفظات تھے، وہ بہت جلد اپنی موت آپ مر گئے۔ عاصمہ باجی کے علاوہ سب لوگوں کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ ہاں اسے غالب کی موجودگی سے ضرور الجھن ہوتی تھی۔ صفیہ چچی کا بیٹا جو ماں کے ساتھ اپنی تائی کا بھی لاڈ لاکھا، ساتھ اچھی خاصی ڈگری لے رہی ہے لیکن من پسند نوکری نہ ملنے پر فی الحال بے روزگاری کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ہاتھ میں بلا کا ذائقہ تھا، اوپر اپنے بچن کو تو اکثر رونق بخشتے ہی رکھتا تھا۔ بچوں کی فرمائش پر نیچے بھی کوکنگ کے جوہر دکھاتا رہتا۔

عاصمہ باجی ناک منہ تو چڑھاتیں لیکن ان کے لاڈلوں کی فرمائش پر جو برگر، زنگر برگر، کرپسی چکن وغیرہ غالب کم لاگت میں تیار کر کے ان کی مोज کروانا بازار سے وہ ہی چیزیں بہت مہنگی پڑتی تھیں۔ اجیہ البتہ اس کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے۔

نسرین کی چھٹی نہ ہونے کے باوجود گھر کے باقی ماندہ کام عاصمہ باجی اس کے سپرد کر چکی تھیں۔ خود ہی وی دیکھتیں یا فون پر ماں سے محو گفتگو رہتیں۔

صفیہ چچی بھی دن میں تھوڑی دیر کے لیے جٹھانی کے پاس ضرور آتی تھیں۔ دونوں دیورانی جٹھانی میں بہت محبت اور الفت کے جذبات پائے جاتے تھے۔

صفیہ چچی تو انہیں بھابھی کے بجائے آپا کہہ کر ہی مخاطب کرتیں اور بالکل بڑی بہنوں والا درجہ دیتی تھیں۔ وہ بہت باحوصلہ اور باہمت خاتون تھیں۔ اماں نے ہی اجیہ کو ان کی زندگی کی کہانی سنائی تھی۔ شادی کے بعد کے بعد دیگرے پانچ بچوں میں فقط غالب ہی زندگی لکھوا کر لایا تھا۔ باقی سب پیدائش کے کچھ دن بعد ہی اللہ کو پیار ہو گئے تھے۔ عین جوانی میں شوہر کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

صفیہ چچی ادھوری تعلیم مکمل کر کے ٹیچنگ لائن سے وابستہ ہو گئیں۔ دودکانوں کا کرایہ اور ان کی تنخواہ سے گھر کی گزر اوقات ہونے لگی۔ اکلوتے بیٹے کو اچھے تعلیمی اداروں سے تعلیم دلوائی لیکن ابھی تک وہ

اس کی حیثیت کا تعین کرنے والی ہیں۔ نسرین تو پھر تنخواہ دار ملازمہ تھی۔ اجیہ تو دو وقت کی روٹی کے بدلے مفت کی ملازمہ بننے والی تھی۔ اگر عزت نفس مجروح ہوئے بغیر گھر کے کام کرنے پڑتے تو اجیہ کو اس پر بھی اعتراض نہ تھا لیکن اماں کو جب عاصمہ باجی کے ارادے کا علم ہوا تو وہ فوراً میدان میں کودی تھیں۔ ”کیوں غریب کی روزی پر لات مار رہی ہے عاصمہ! برسوں پرانی ملازمہ ہے۔ وفادار اور قابل بھروسہ ہے اور کیا آج سے پہلے اس نے کبھی چھٹیاں نہیں کیں۔ پہلے تو کبھی نوکری سے نکالنے کی دھمکی تک نہ دی۔ آج کھڑے کھڑے نوکری سے ہی نکال دیا۔“

نسرین اپنا مقدمہ لے کر اماں جی کے پاس گئی تھی اور فوری کمک لے کر عاصمہ باجی کے پاس پٹی تھی۔

”پیسے درختوں پر نہیں لگتے اماں! یہ بہت ہڈ حرام ہوگئی ہے۔ اور ویسے بھی اب گھر کے کام کرنے والے ہم دو جی ہو گئے ہیں۔ اب نسرین کی ضرورت نہیں۔“ عاصمہ باجی کا انداز قطعاً تھا۔

”ارے واہ، ایسے ہی ضرورت نہیں۔ میرے کتنے کام تو یہ نسرین ہی کرتی ہے۔ کبھی سر میں تیل لگواتی ہوں اس سے، چوٹی گوندھتی ہے۔ ہاتھ پیر کی مالش کرتی ہے۔ کپڑوں کی الماری سیٹ کرتی ہے۔ تمہیں تو اتنی فرصت نہیں کہ بوڑھی ساس کے کمرے میں جھانک بھی لو اور پیسے درختوں پر نہیں اگتے تو میرے بیٹے کی جیب سے ہی جاتے ہیں نایا تم نے مکے سے ماہانہ بندھوا رکھا ہے۔“ اماں کڑک کر بولیں۔

اجیہ کو جی ہی جی میں ہنسی آئی۔ عاصمہ باجی کی حد تک ان کی ساس واقعی خاصی دہنگ تھیں۔ عاصمہ باجی بڑبڑاتی تو رہیں لیکن ساس کے فیصلے سے اختلاف کی گنجائش نہ تھی۔

☆☆☆

اس گھر میں آنے سے پہلے اجیہ کے دل میں

برسر روزگار نہ ہو پایا تھا۔ صفیہ چچی ہی گھر کی گاڑی چلا رہی تھیں۔

اماں جوڑوں کے درد کی وجہ سے خود میٹریاں چڑھ کر اوپر نہ جاسکتی تھیں۔ غالب ہوتا تو انہیں سہارا دیے کر لے جاتا۔ اب یہ ڈیوٹی اجیہ کی بھی لگ گئی تھی۔ شام کو کبھی صفیہ چچی نیچے نہ آ پائیں تو اماں اوپر چلی جاتیں۔

انہیں نیچے بند گھر میں ویسے بھی وحشت ہوتی۔ صفیہ چچی کے صحن سے تاروں بھرے آسمان کا نظارہ اجیہ کو بھی بھلا لگتا تھا۔ دونوں خواتین صحن میں باتوں میں مشغول ہو جاتیں اور اجیہ تاروں بھرے آسمان کو تنکٹی رہتی۔

”ویسے خاتون جس محویت سے آپ آسمان تنکٹی ہیں۔ لگتا ہے عنقریب کوئی نیا ستارہ یا سیارہ ضرور دریافت کر لیں گی۔“

غالب اسے مخاطب کرتا حالانکہ پہلے روز اجیہ کی آنسو بھری آنکھیں دیکھ کر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس لڑکی کو ہرگز نہ ستائے گا لیکن چڑے کی زبان پھسلے بغیر کب رہ سکتی تھی۔

اجیہ البتہ روز اول والی روش پر قائم تھی، اس کی کسی بھی بات کے جواب میں فقط خاموشی۔

”کوئٹہ سے میمونہ کے فون پر فون آرہے ہیں آپا! ہر بار غالب کی نوکری کے بارے میں استفسار کرتی ہے۔ میں اسے کب تک امید کا جھوٹا دامن تھماؤں۔ یہ لڑکا اس معاملے کو سنجیدگی سے لیتا تک نہیں۔“

صفیہ نے بیٹے کو شاکی انداز میں دیکھتے ہوئے اماں سے دکھڑا رویا۔ اس خاندانی گفتگو کے بیچ اجیہ کو اپنی موجودگی غیر ضروری لگی۔

”میں نیچے چلی جاؤں اماں! تھوڑی دیر میں آ کر آپ کو لے جاؤں گی۔“ اس نے انہیں مخاطب کیا۔

”کہا کرو گی نیچے جا کر۔ عاصمہ، نوید بازار گئے ہیں۔ اکیلے گھر میں تمہیں ویسے ہی ڈر لگتا ہے۔“ وہ

اس کی عادتوں سے بخوبی واقف ہو چکی تھیں۔
اجیہ چپ ہو گئی۔ صفیہ چچی نے سلسلہ کلام دوبارہ وہیں سے جوزا۔ انہوں نے کوئٹہ میں مقیم اپنی بہن کے گھر غالب کا رشتہ طے کر رکھا تھا اور اب وہ لوگ اس کی مستقل بے روزگاری پر پریشان تھے۔

”دیکھیں تائی اماں! آپ کے سامنے میں ہر تیسرے دن اپنی سی وی لے کر کہیں نہ کہیں انٹرویو دینے جاتا ہوں۔ ابھی تک نوکری نہیں ملی تو میرا کیا قصور اور جہاں تک ان لوگوں کے ناامید ہونے کا تعلق ہے تو اتنی بارامی سے کہا ہے، اپنی بھانجی کا مجھ سے ڈائریکٹ رابطہ کروادیں۔ اسے جھوٹی پکی امیدیں دلانا، مستقبل کے سبز باغ دکھانا وہ سب میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ پھر اپنے گھر والوں کو وہ خود سمجھا لے گی۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ میں نے موصوفہ کو سات آٹھ برس سے دیکھا تک نہیں۔ فون پر بات کرنے کی وہ روادار نہیں۔ اب میں خوابوں میں اس سے ہم کلام ہو کر تو اسے پتا نہیں سکتا۔“ غالب نے اپنی مجبوری بیان کی۔

”اسے پٹانے سے بہتر ہے، تم نوکری ڈھونڈ لو۔ نوکری اپنے معیار کی نہیں مل رہی تو اپنا معیار کچھ نیچے کر لو میرے چندا۔“ تائی نے لاڈلے کو پچکارا۔

”آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے اپنے معیار سے نیچے نوکری ڈھونڈنے میں کوئی عار ہے۔ یہ بات سمجھتے نہیں کہ اس سے میری اور میری ڈگری کی مارکیٹ ویلو گر گئی ہے۔ جہاں اتنا انتظار کر لیا، وہاں تھوڑا سا مزید۔ انتظار اور کر لیں امی! اور یہ ہی بات خالہ کو بھی سمجھا دیں۔ جب بھی ان کا فون آتا ہے، گھر میں ٹینشن پھیل جاتی ہے۔“

غالب اب کچھ خفا ہو کر وہاں سے واک آؤٹ کر گیا۔ دونوں خواتین ٹھنڈا سا نس بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

صفیہ چچی شام کو چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں۔ ان ہی بچوں میں سے ایک کی ماں اپنی میٹرک

میں زیر تعلیم بیٹیوں کے لیے ٹیوشن کی بات کرنے آئی تھیں۔ صفیہ نے ان سے سہولت سے معذرت کرنا چاہی۔

”آپ کو پتا ہے بھابھی! میں تو زیادہ سے زیادہ چھٹی ساتویں کے بچوں کو پڑھاتی ہوں پھر آپ کی بچیوں کے سائنس بجیکٹ ہیں۔ فزکس کیمسٹری پڑھانا تو ویسے بھی میرے بس کی بات نہیں۔“ صفیہ چچی کے انکار پر عورت کا چہرہ بجھ گیا۔

”ان کے ابو بچوں کو اکیڈمی بھیجنے کے حق میں نہیں۔ آس پاس کوئی فی میل ٹیچر چھی نہیں۔ اب مشکل میں پڑ گئی ہوں، بچیوں کو کہاں بھیجوں۔“

عورت بہت مایوس ہو کر بیٹھی تھی۔ اتفاق سے اجیہ موقع پر موجود تھی۔ اس نے بہت جھجکتے ہوئے صفیہ چچی سے اس بارے میں بات کی۔

”نوس دسویں کے بچوں کو میں بھی پڑھا سکتی ہوں چچی! بلکہ اگر کوئی ایف اے یا ایف ایس سی کا اسٹوڈنٹ ہو تو مجھے اسے پڑھانے میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مسئلہ صرف عاصمہ باجی کی اجازت کا ہے۔“

”آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ ایف اے ایف ایس سی کے اسٹوڈنٹس تک کو پڑھا سکتی ہیں جبکہ عاصمہ بھابھی بتاتی ہیں کہ آپ کی اپنی تعلیم قابلیت صرف ایف اے ہے۔ میٹرک تک کے لیول کے بچوں کو پتھرس فزکس پڑھانا اتنا آسان نہیں ہے، خاتون آپ جانے کس گمان میں ہیں۔“

غالب ادھر آ نکلا تھا اور اسے جتائے بغیر نہ رہ پایا۔ اس نے بات معمول کے انداز میں کی تھی لیکن اجیہ کو یہ طعنے کی صورت لگی۔

”اگر آپ میرے ظاہری حلیے، معمولی کپڑے جوتوں اور ہر وقت گھڑیں رہنے کی وجہ سے مجھے بالکل ان پڑھ قسم کی لڑکی سمجھتے ہیں، تو یہ آپ کی بھول ہے۔ ایف ایس سی میں میرے نمبروں کی بنیاد پر میڈیکل کانج کا میرٹ بن گیا تھا۔ بس گھریلو حالات نے اجازت نہ دی اور بی ایس سی کے پیپرز سے کچھ عرصہ

پہلے میں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔“ آج پہلی بار وہ غالب کی کسی بات کے جواب میں بولی تھی۔ یہ اور بات کہ وہ اذیت ناک وقت یاد کر کے آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ کیا بننا چاہتی تھی اور حالات کی ستم ظریفی نے کیا بنا دیا تھا۔

”میڈیکل کانج کا میرٹ۔ واؤ! میزنگ آپ تو چھپی رستم نکلیں بھی۔“ غالب اس کی ڈڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ چکا تھا۔ جانے اس لڑکی کی اداس آنکھیں دیکھنا اسے خاصا مشکل کیوں لگتا تھا۔ اس نے ہلکا پھلکا انداز اختیار کر کے اسے سراہا تھا جبکہ صفیہ چچی تو اس کی ٹیوشن پڑھانے والی تجویز پر فوراً متفق ہو گئی تھیں۔

”عاصمہ کی تو فکر ہی نہ کرو۔ بلکہ اس بارے میں عاصمہ سے بات بھی نہ کرو۔ میں خود اس سے کہوں گی کہ مجھے ٹیوشن کے بچوں کے لیے ایک ہیلپر ٹیچر کی ضرورت ہے، اگر وہ پھر بھی نہ مانی تو آپا بیگم تو ہیں نا، تم خواہ مخواہ میں عاصمہ سے اتنا مت ڈرا کرو بیٹا۔“

صفیہ چچی کو بھی اتنے دنوں میں خوب اندازہ ہو گیا تھا کہ عاصمہ اپنی سگی پھوپھی زاد بہن سے کیا سلوک روار کھے ہوئے ہے۔ اس بچی کے رکھ رکھاؤ اور متانت نے انہیں ہمیشہ ہی متاثر کیا تھا۔ اس کی ادھوری باتوں کے باوجود نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ حالات کے جبر کا شکار ہو کر اپنے تاب ناک مستقبل سے کنارہ کش ہوئی ہے۔

آج انہیں اس کی آنکھوں میں جو امنگ نظر آئی تھی، وہ اس امنگ کو ختم نہ ہونے دینا چاہتی تھیں۔ جانے انہوں نے عاصمہ باجی سے کیا بات کی تھی بہر کیف اسے ٹیوشن پڑھانے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ اوپر صفیہ چچی کے پورشن میں ان ہی کے ساتھ ٹیوشن پڑھانے لگی تھی۔ دو بچیوں سے شروع ہونے والا سلسلہ جلد ہی چھ، سات بچیوں تک پھیل گیا تھا۔

یہاں ٹیوشن فیس کا ریٹ خاصا معقول تھا، جب بچیوں کی پہلی فیس اس کے ہاتھ میں آئی تو اس نے

رب کا بے پایاں شکر ادا کیا تھا۔

”اب یہ پیسے عاصمہ کے ہاتھ میں تھمانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری فطرت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ یہ عاصمہ سے زیادہ میرے بیٹے کا گھر ہے، تو انخواہ احسان مندی کے جذبات میں گھر کر بھی یہ پیسے اپنی بہن کو تھما دو۔“

اماں نے اسے پیشگی تنبیہ کی تھی۔ اس نے اس شفیق سی بوڑھی خاتون کو محبت سے دیکھا۔ چند ہی دنوں میں ان سے کیسا دل کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ وہ بنا کہے اس کے دل کی بات جان جاتی تھیں۔

”عاصمہ تو تمہیں ساتھ بازار لے کر جانے کی روادار نہ ہوگی۔ میں صفیہ سے کہوں گی، اس کے ساتھ بازار جا کر اپنے لیے ڈھنگ کے دو جوڑے اور اپنی ضرورت کی دوسری چیزیں لے آؤ۔ میں نے پہلے بھی تمہیں کتنی بار پیسے دینے کی کوشش کی لیکن وہ تمہاری خوددار طبیعت کو گوارا نہ تھا۔ اب اپنے پیسوں کو اپنی مرضی سے خرچ کرو۔“

انہوں نے اسے مسکرا کر نصیحت کی۔ اجیہ نے بھی مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

صفیہ چچی اسے اپنے ساتھ بازار لے گئی تھیں۔ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہوں نے ایک جوڑا اپنی طرف سے بھی دلوادیا تھا۔

”پہنا اوڑھا کرو بیٹا! تمہاری عمر کی بچیوں کو تو سجنے سنورنے کا اتنا شوق ہوتا ہے۔“

انہوں نے اسے محبت بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

☆☆☆

عاصمہ باجی سے اس کی یہ سرگرمیاں برداشت نہ ہو رہی تھیں۔

”امی سچ کہتی تھیں، تم شکل سے جتنی معصوم لگتی ہو، اندر سے اتنی ہی کھنی ہو۔ کیسے اماں اور چچی کو اپنے قابو میں کر لیا لیکن بی بی! کسی بھول میں نہ رہنا۔

نادیہ کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ جیسے ہی خیر خیریت سے اس کی شادی ہوتی ہے، تم واپس وہیں

چلی جاؤ گی، جہاں سے میں تمہیں لے کر آئی تھی۔ کتنے ٹھوڑے سے دنوں میں تم نے کیسے پر پرزے نکال لیے ہیں۔“ عاصمہ باجی کی زبان زہرا گل رہی تھی۔

آج اجیہ نے صفیہ چچی کے ساتھ خریدار کیا کاسی رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اسے سلائی نہیں آئی تھی، صفیہ چچی نے ہی بہت ڈیزائننگ کر کے یہ جوڑا سیا تھا۔

چند ماہ میں ہی اجیہ کی کملائی ہوئی رنگت پھر سے دکنے لگی تھی۔ عاصمہ کو اس کا یہ ہی نکھرا نکھرا روپ برداشت نہ ہو رہا تھا۔

اجیہ جو اماں کے لیے چائے بنانے کچن میں موجود تھی۔ عاصمہ باجی کی آمد اور پھر ان کے بگڑے تیور دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

”ایک بات اور بی بی! یہ جو تم ٹیوشن پڑھانے کے بہانے بھاگ بھاگ کر صفیہ چچی کے پورٹن میں جاتی ہو تو اس گمان میں نہ رہنا کہ غالب کو پھالس لو گی۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو اس کی بات بہت عرصہ پہلے اس کی خالہ کی بیٹی سے طے ہو چکی ہے۔ اس لیے کم از کم غالب پر تو ڈورے ڈالنے کی ضرورت نہیں۔“

عاصمہ باجی تنفر سے بول رہی تھیں۔ کاش انہیں علم ہو جاتا کہ ان کے پیچھے غالب بھی آن کھڑا ہوا ہے۔ اجیہ اسے دیکھ چکی تھی اور اب اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ زمین بھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ عاصمہ باجی نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نگہت مامی کی ہی بیٹی ہیں۔ کس قدر گھٹیا زبان استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اجیہ کی ذات پر کیچڑ اچھالی تھی۔ غالب واپس پلٹنے کے بجائے کچن میں داخل ہوا تھا۔

”میں کوئی لحاف یا رضائی نہیں ہوں عاصمہ بھابھی! جو ان محترمہ کو مجھ پر ڈورے ڈالنے کی ضرورت پڑے گی۔“ اس کی آمد اتنی اچانک تھی کہ عاصمہ باجی بری طرح شپٹائی تھیں۔

”اور ویسے بھی یہ آپ کی کزن ہیں، ان کے متعلق آپ کو اتنا تو علم ہونا چاہیے کہ یہ ایک انتہائی

”دستر خوان لگ رہا ہے، غالب سے کہو نیچے آ کر کھالو۔ دو دن ہو گئے ہیں، نہ میں اوپر گئی نہ اس نے نیچے آ کر شکل دکھائی۔ پتا نہیں کیا مصروفیت ڈھونڈ لی اس نے۔“

اماں کو لاڈلے کی دودن کی جدائی بھی کھل رہی تھی۔ ٹومی کے بلاوے کے ذرا دیر بعد وہ نیچے آ گیا۔ اجیہ نے دستر خوان پر کھانا چن دیا۔

نہاری مزے کی نہیں بنی تھی، اسے خدشہ تھا غالب مین میکھ ضرور نکالے گا۔ ہوا بھی یہ ہی، اس نے کھانا تو چپ کر کے کھالیا لیکن پھر کہے بغیر نہ رہ پایا۔ ”اگر یہ واقعی نہاری بھی تو اس سے بد مزہ نہاری میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں کھائی۔“

”اچھی بھلی بنی ہے، فضول کے خرے مت دکھاؤ۔“ اجیہ کی بے چاری سی شکل دیکھ کر اماں نے غالب کو گھر کا۔

”تائی اماں! تنقید کا مقصد فقط کسی کی دل آزاری نہیں ہوتا۔ انسان تنقید سے ہی سیکھتا ہے نا۔ یاد کریں پہلے جب میں کوئنگ کے تجربات کرتا تھا تو سب گھر والے میرے بنائے کھانوں میں کتنی مین میکھ نکالتے تھے اور اب سب میرے ہاتھ کے بنے کھانے کیسے چٹخارے لے کر کھاتے ہیں۔“ اس کا تقاضا آخر آ میز لہجہ اجیہ سے برداشت نہ ہوا۔

”آپ کے پاس کھانا بنانے میں تجربے کرنے کی سہولت موجود تھی۔ میں جس گھر سے آئی ہوں، وہاں بھی میری حیثیت فقط مددگار کی ہوتی تھی۔ کھانا پکانے کی نہ وہاں اجازت تھی، نہ یہاں عاصمہ باجی کچھ پکانے دیتی ہیں۔ آج انہیں مجبوری بھی سوانہوں نے آدھی پونی ترکیب بتا کر یہ ذمہ داری مجھے سوپی۔ پہلی بار میں کوئی بھی اتنا ایکسپریٹ نہیں ہوتا۔“

غالب کی تنقید اسے چھپی ہی اتنی تھی کہ عادت کے خلاف خاصے چڑے ہوئے انداز میں اسے جواب دے ڈالا۔ غالب کا مقصد پورا ہوا، وہ اسے کچھ بولنے پر ہی اکسانا چاہتا تھا۔

”گڈ، انسان کو اپنے حق میں بولنے کا ہنر آتا

پر وقار اور سلجھی ہوئی شخصیت کی مالک ہیں۔ یہ کسی پر ڈورے تو کیا چھوٹی موٹی ڈوری بھی ڈالنے کے قابل نہیں۔ بولنے سے پہلے کچھ تو سوچ لیا کریں۔ یہ ہی سوچ لیتیں کہ اگر آپ کی گفتگو کا خلاصہ تائی اماں تک پہنچ جاتا تو وہ آپ کو کیا کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ سو بی کیئر فل نیکسٹ ٹائم بھابھی جان! اور ہاں، مجھے ذرا سا زیرہ چاہیے۔ امی نے کڑھی میں بگھار لگانا ہے۔“ وہ سب کچھ بول بال کر ذرا سے زیرے کے بجائے زیرے کا پورا ڈبا اٹھا کر چلتا بنا تھا۔

عاصمہ باجی نے بھی اجیہ پر تنفر بھری نگاہ ڈالی اور چپ چاپ پلٹ گئیں۔ اجیہ کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر گال پر پھسلے تھے۔ عاصمہ باجی کی زہر آلود باتیں اپنی جگہ مگر غالب کے کہے دو فقرے ہی اسے معتر کرنے کے لیے کافی تھے۔ وہ جو اس کا کچھ نہ تھا، کیسے دو ٹوک اور دبنگ انداز میں اس کے کردار کی گواہی دے کر فوراً واپس پلٹ گیا تھا۔

آج سے پہلے وہ فقط اسے ایک لا ابالی سالک لگا لگا کرتا تھا لیکن اب پل بھر میں ہی اس کے متعلق اس کی رائے بدل گئی۔

لیکن اس دن کے بعد اس نے غالب سے مزید کتنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر گز نہ چاہتی تھی کہ عاصمہ باجی کو اس کے کردار پر مزید کچھ اچھا لانے کا موقع ملے۔ اس کا گریز سمجھتے ہوئے غالب نے بھی نیچے آنا کم کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس روز عاصمہ باجی شاپنگ مشن پر نکلی تھیں۔ ان ہی کی ہدایت پر اجیہ نے نہاری بنائی، جب ٹومی اس کے پاس غالب کا پیغام لے کر آئی۔

”چاچو کہہ رہے ہیں، بہت بھوک لگی ہے۔ صفیہ دادی اسکول سے دیر سے آئیں گی۔ چاچو کا خود کچھ پکانے کا موڈ نہیں۔ دو روٹی اور تھوڑا سا سالن اوپر بھجوادیں۔“

ٹومی نے رٹو تو تے کی طرح فر فر پیغام پہنچا دیا۔

پر رکھ دیا۔ اماں اسے گھور کر رہ گئیں۔ وہ مسکرا کر ان کے کندھے دبائے لگا۔

☆☆☆

صفیہ چچی کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ انہوں نے اسکول سے بھی دو چار چھٹیاں لے لی تھیں۔ عاصمہ باجی سرسری ان کا حال پوچھ کر آ گئی تھیں۔ اجیہ اوپر والے پورشن میں صرف ٹیوشن پڑھانے کے وقت جاتی تھی یا جب اماں کو سہارا دے کر اوپر لے جانا ہوتا۔ اب وہ باوجود خواہش کے ان کی تیمارداری کے لیے اوپر نہ جا پارہی تھی۔ عاصمہ باجی کے تیوروں اور ان کی زبان سے وہ مستقل خائف رہتی تھی۔ ایسے میں اماں نے ہی بظاہر اسے ڈپٹا لیکر سنا یا عاصمہ کو تھا۔

”ایسی بھی کیا مصروفیت اور بے مروتی اجیہ! جو تم اوپر صفیہ کا حال تک پوچھنے کی فرصت نہ نکال پارہی ہو۔ غالب بے چارہ مرد ذات، چلو اسے کھانا پکانا تو آتا ہے لیکن گھر کے اور بھی سو کام ہوتے ہیں۔ صفائی ستھرائی، برتن، کپڑے دھونا..... مجھے پتا ہے صفیہ کو بے تربیتی سے کتنی الجھن ہوتی ہے۔ وہ اس بیماری میں بھی گھر کے کسی کام دھندے میں لگی ہوگی۔ جاؤ، اس کا حال پوچھو اور گھر کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔“ اماں نے اجیہ کو مخاطب کیا۔ وہ جو ابھی عاصمہ باجی کے دھلے کپڑوں کا گٹھڑا ستری کرنے کو کمر کس رہی تھی، اماں کے کہنے پر ہچکچا کر عاصمہ باجی کی جانب دیکھا۔

”جاؤ بھی، مجھے کیا دیکھ رہی ہو۔ جب شاہی فرمان نازل ہو گیا تو ہم میں سرتابی کی مجال کہاں۔“ جو بھی تھا، وہ ساس سے دبتی تھیں۔ یہ گھر ساس کے نام تھا اور سب سے بڑھ کر نوید بھائی جو باقی ہر معاملے میں تو بیوی کے بے دام غلام تھے لیکن جب موازنہ بیوی اور ماں کا ہوتا تو ان کا سارا وزن ماں کے پلڑے میں ہوتا۔ وجہ نا انصافی نہیں بلکہ بیوی کی فطرت سے آگاہی تھی اور ویسے اماں عاصمہ باجی کے کسی کام میں مداخلت کرتی بھی نہ تھیں۔

چاہیے۔ اچھی کوشش ہے۔“ اس نے اسے مسکرا کر سراہا۔ اجیہ اب مزید کچھ بولے بنا برتن سمٹنے لگی۔ ”بہت صابر بنی ہے۔ خود پر جیتی ظلم کی داستان سناتی نہیں لیکن میں عاصمہ کو بھی جانتی ہوں اور اپنی سمجھن سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ بچی کس اجڑے پجڑے حال میں یہاں آئی تھی۔ اب ذرا سی چہرے پر رونق آئی ہے تو عاصمہ کو یہ بھی برداشت نہیں۔ ایسے نخوت انداز میں بات کرتی ہے اجیہ سے، جیسے یہ اس کی زر خرید غلام ہو۔ کوئی خدا خونی ہی نہیں ہماری بہو کو۔“

اجیہ کے کمرے سے نکلنے کے بعد اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”مان لیں تائی اماں! بہو کے انتخاب میں آپ سنگین غلطی کی مرکتب ٹھہری ہیں۔“ غالب نے عاصمہ بھابھی کے لیے ان کی انتخاب کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

”کیا کریں بچے! ہم تو اس کے مرحوم باپ کی شرافت اور کردار کو دیکھ کر رشتہ مانگنے گئے تھے۔ کیا خبر تھی اسلم مرحوم کی بیوی کا کیا مزاج ہے اور بیٹیاں بھی ماں کا پرتو ہیں۔ مجھے اتنے برسوں میں بہو کی ذات سے کوئی سکھ نہیں پہنچا۔ اس بچی نے کچھ عرصے میں ہی مجھے اپنا اتنا عادی بنالیا ہے کہ سوچتی ہوں اس کے جانے کے بعد میرا دل کیسے لگے گا۔“ وہ واقعی اجیہ سے بہت محبت کرنے لگی تھیں۔

”عین یہ ہی خیالات میری والدہ محترمہ کے بھی ہیں۔“ غالب ہنسا۔

”اچھا، تو یہ بتا کہ نوکری کا کیا بنا۔ میمونہ نے تیری ماں کو فون کر کر کے عاجز کر رکھا ہے۔“ اماں کو خیال آیا تو اس سے پوچھ بیٹھیں اور یہ موضوع غالب کی دھتکی رگ تھا۔

”آپ کی اور ماں کی دعاؤں میں دم ہی نہیں ورنہ جو ڈگری میرے پاس ہے، اب تک تو میں بڑا افسر لگ چکا ہوتا۔“ اس نے گویا سارا الزام ماں اور تائی کے کندھوں

عاصمہ گھر کے سیاہ سفید کی مالک تھیں۔ کبھی کبھار ساس کی دو چار باتیں منہ بنا کر سن ہی لیتیں، اب بھی ساس کے کہنے پر انہوں نے اجیہ کو اوپر جانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

اوپر صفیہ چچی کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ غالب ان کے لیے کھجڑی بنا رہا تھا۔ گھر کا حلیہ بھی خاصا ابتر ہو رہا تھا ورنہ صفیہ چچی نفاست میں اپنی مثال آپ تھیں، غالب اتنا ہی لالہ بابلی لیکن عام دنوں میں وہ بیٹے کا پھیلا واساتھ کے ساتھ سمیٹتی رہتی تھیں۔ آج ان میں اٹھنے تک کی ہمت نہ تھی، ان کے منع کرنے کے باوجود اجیہ نے گھر کا پھیلا واسمیتا تھا۔

غالب کھجڑی بنا کر لایا تو اجیہ کو کھجڑی کی ہیئت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ چٹ پٹے کھانے بنانے کا ایکسپرٹ معمولی سی کھجڑی ٹھیک سے نہ بنا پایا تھا۔ پانی میں دال اور چاول الگ الگ تیر رہے تھے۔

”آپ نے ہی کہا تھا امی! کہ پتلی سی موٹگی کی دال کی کھجڑی بنانا۔ یہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پتلی ہو گئی۔“

اجیہ کی مسکراہٹ اس سے مخفی نہ رہ پائی تھی۔ اسے کچھ کہنے کے بجائے جھنجھلا کر ماں کو ہی مخاطب کیا۔

”اجیہ، تو ٹھیک ہے نا۔ میں نے تم سے کچھ کہا۔ میں کھالوں کی یہ کھجڑی ہی۔“

صفیہ چچی مامتا سے لبریز خاتون تھیں۔ بیٹے پر محبت بھری نگاہ ڈال کر جواب دیا۔ اجیہ کو اس لمحے شدت سے اپنی مرحوم ماں یاد آئی تھی۔

”بس ذرا سی کھالیں، میں آپ کے لیے سوپ بنا کر لاتا ہوں۔“ وہ کھجڑی کے معیار سے خود غیر مطمئن تھا، سو دو بارہ کچن میں گھس گیا۔

”ہر لحاظ سے ہیرا ہے میرا بیٹا! بس ایک معاملے پر اڑا ہوا ہے، اپنے معیار سے کم نوکری پر سمجھوتا نہیں کر رہا اور من پسند نوکری مل کر نہیں دے رہی۔ اب میری بہن اپنی بیٹی کو کب تک اس کے انتظار میں بٹھائے۔“

جوینشن آج کل صفیہ چچی کو سب سے زیادہ ستا رہی تھی، سامع میسر آتے ہی لفظوں کو زبان مل گئی۔ برسوں پہلے دونوں بہنوں نے زبانی کلامی بچوں کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ اب وہ لوگ غالب کے کیریئر کی وجہ سے پریشان ہوئے بیٹھے تھے اور یہ پریشانی مستقل صفیہ چچی کو منتقل کر رہے تھے۔ اجیہ کو تو لگتا تھا، ان کی طبیعت بھی جوینشن کی وجہ سے خراب ہوئی ہے۔

”دو دکانیں کرائے پر چڑھا رکھی ہیں۔ غالب سے کہتی ہوں، جب تک نوکری نہیں ملتی، ایک دکان خالی کروا کر جنرل اسٹور کھول کر ہی بیٹھ جائے لیکن یہ لڑکا میری ایک نہیں سنتا۔“

”ان کے ہاتھ میں جتنا ذائقہ ہے صفیہ چچی! تو بجائے جنرل اسٹور کے اگر یہ شامی کباب، برگرنائپ کا کوئی فوڈ پوائنٹ کھول لیں تو وہ بھی خوب چلے گا۔“ اجیہ کے دماغ میں جو تجویز آئی، صفیہ چچی کے گوش گزار کر دی۔

”واہ، کیا آئیڈیا ہے۔ آپ تو کیریئر کا ونسلنگ کا کام شروع کر دیں خاتون۔ خوب نام کمائیں گی۔“ وہ جانے بوتل کے جن کی طرح ایک دم سے کیسے حاضر ہو جاتا تھا اور کان بھی تو کتنے تیز تھے اس کے۔

اجیہ تو بول کر پچھتائی۔

”اگر آپ کچن سے نکل آئے ہیں تو میں کچن کا پھیلا واسمیٹ کر برتن دھو ڈالوں۔“ وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتی اٹھتی ہوئی بولی۔

”بہت نوازش ہوگی۔ برتن دھونے سے میری ویسے بھی جان جاتی ہے۔“ وہ ممنون ہوا۔

اجیہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس روز کی جانے والی سیرسری سی بات یہ رنگ دکھائے گی۔ نا اب نے واقعی برگرنائپ کھولنے کی تیاری پکڑ لی۔

”آپ کا مشورہ دل کو لگا، اسی پر عمل پیرا ہو رہا ہوں۔ نقصان ہوا تو سراسر آپ قصور وار ٹھہرائی جائیں گی۔“

”لیس، میں نے تو ویسے ہی بات برائے بات کی تھی۔ آپ اپنی عقل سے فیصلہ کریں۔“ اجیہ تو اس

کی بات سن کر بری طرح بوکھلا گئی تھی۔
گھر والوں نے البتہ اس کے اس اقدام کی
خوب حوصلہ افزائی کی تھی۔
”محنت میں کیا عاریار! اپنا بزنس اپنا ہوتا ہے۔
اللہ کا روبرو میں برکت ڈالے۔“ نوید بھائی نے اس
کی پیٹھ پھینکی۔

”کب سے ماں ہڈیاں گھسا رہی ہے، اچھا
ہے چار میسے نما کر ماں کے ہاتھ پر رکھو گے۔ اس بے
چاری کو کچھی سکون کا سانس ملے۔“ اماں کی نیک
تمنائیں اس کے ساتھ تھیں۔

غالب کے ساتھ اس کے ایک دوست نے بھی
سرمایہ کاری کی تھی۔ غالب کا خیال تھا، لوگ ٹپ ٹاپ
دیکھ کر جگہ کا رخ کرتے ہیں۔ ذائقہ کے معترف
ہونے کی باری بعد میں آتی ہے۔ سو اس نے سیٹ
اپ پر بھی خاص توجہ دی تھی۔ بچے الگ پر جوش تھے۔
”غالب چاچو! ہم روز آپ کے پاس برگر
کھانے آیا کریں گے۔“ وہ خوشی سے اچھلتے۔ فقط
اجیہ بھی جو جی ہی جی میں پریشان ہو رہی تھی۔ اگر
خدا نخواستہ غالب اور اس کے دوست کا سرمایہ ڈوب
جاتا تو وہ کتنی پشیمانی میں مبتلا ہوتی۔

یہ سرسری سا آئیڈیا اس کا ہی تھا نا۔ پتا نہیں
کیوں غالب کے من کو یہ آئیڈیا اس قدر بھایا کہ فوراً
ہی اسے عملی جامہ پہنانے کی ٹھان لی۔

☆☆☆

ان ہی دنوں نادیہ کی بات پکی ہونے کی اطلاع
ملی۔ عاصمہ باجی خوشی سے پھولے نہ سمار ہی تھیں۔
ان کی ماں نے بیٹی کے لیے من پسند رشتہ ڈھونڈ ہی لیا
تھا۔ لڑکا کچھ عرصے پہلے ہی ان کے علاقے میں دیگر
دو چھڑے لڑکوں کے ساتھ کرائے کا مکان لے کر
شفٹ ہوا تھا۔ قریب کی فیکٹری میں سپروائزر تھا۔
تنخواہ ٹھیک ٹھاک تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لڑکا
چھڑا اچھا نٹ تھا۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ رشتے
کی ایک خالہ ہی سرپرست تھیں جو رشتہ لے کر آئی
تھیں۔

نگہت مامی نے اس رشتے کو فوری سند قبولیت
بخش دی۔ یہ نادیہ کا بھی اصرار تھا، فرزند علی سے پیار
کی پیشگامی اس نے ماں کو لاعلم رکھ کر نہ بڑھائی تھیں۔
مامی جب اس کے لیے خود رشتہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک
گئیں تو انہوں نے بیٹی کے کھلم کھلا معاشقے پر
آنکھیں بند کر لیں۔

دانش بھائی کی غیرت جوش کھاتی تھی لیکن ماں
کے آگے وہ بول نہ سکے تھے۔ بالآخر یہ معاشقہ بخیر و
بخوبی انجام کو پہنچا اور فرزند علی کا نادیہ کے لیے باضابطہ
رشتہ آ گیا۔ اس نے تو جہیز تک لینے سے منع کر دیا
تھا۔ وہ فقط نادیہ کا طلب گار تھا اور مامی اس کی اس اعلا
ظرفی کے گن گاتے نہ تھکتیں۔

عاصمہ ماں بہن کی زبانی الف سے بے تک
ساری تفصیل سے آگاہ تھیں لیکن سسرال میں یہ ہی
ظاہر کیا کہ ایک محلے میں رہنے کے باوجود فرزند اور
نادیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں اور وہ
رشتوں سے محروم لڑکا نگہت کی اپنائیت سے متاثر ہو کر
اسے اپنی ماں کا درجہ دے بیٹھا اور اب اس کی فرزندگی
میں آنا چاہ رہا ہے۔

”چلو، اچھا ہوا۔ بچی کی بات بنی۔ کتنی پریشان
تھی تمہاری ماں۔“ اماں نے سرسری انداز میں کہا
لیکن عاصمہ باجی چڑ گئیں۔

”نادیہ کی کون سا عمرنگی جا رہی تھی، بس امی کی
یہ خواہش تھی اپنی زندگی میں ہی اس کے فرض سے
سبک دوش ہو جائیں۔ اجیہ سے تو دو برس چھوٹی ہے
ہماری نادیہ!“ انہوں نے فرائے سے جھوٹ بولا۔
اماں زیر لب مسکرائیں مگر ٹوکنا غیر ضروری خیال کیا۔
”اب مجھے تو کئی دن کے لیے میسے جانا ہوگا۔
ظاہر ہے شادی کی تیاریاں کروانی ہیں۔ بچوں کو
اسکول سے اتنی چھٹیاں ملیں گی نہیں۔ یہاں اجیہ ہے
نا، گھر اور بچے سنبھال لے گی۔ شادی سے دو دن پہلے
نوید بچوں کو بھی لے آئیں گے۔“

عاصمہ باجی نے پورا پروگرام گوش گزار کر دیا۔
اس پروگرام میں شادی سے دو دن پہلے بھی اجیہ کو

کردی تھی۔ اس بار جواز غالب کی بے روزگاری نہیں بلکہ اس کا ذریعہ معاش بنا تھا۔ غالب کا فوڈ پوائنٹ چند ہی دنوں میں خوب چل نکلا تھا لیکن خالہ کے شوہر بڑے سرکاری افسر تھے۔ انہیں یہ گوارا نہ ہوا کہ ان کا ہونے والا داماد برگر، بن کباب بیچ کر روزی روٹی کمائے۔

صفیہ چچی کو بہن بہنوں کے فیصلے پر شدید دھچکا لگا تھا۔ ان کی اداسی دیکھ کر اجیہ جی ہی جی میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کے ایک سرسری سے مشورے کو سنجیدگی سے لے کر ہی غالب نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اللہ نے کام میں برکت ڈالی تو گھر بھر کے ساتھ جی ہی جی میں اجیہ بھی خوش تھی۔ کیا خبر تھی، یہ مشورہ اس بے چارے کی نسبت ٹوٹنے کا ہی سبب بن جائے گا۔

”میری متلنی ٹوٹنے کی بالواسطہ ذمہ دار آپ بھی ہیں خاتون! اب بتائیے ہر جانے کے طور پر آپ سے کیا طلب کروں؟“ جو بات اس کے دل میں تھی، وہ ایک روز غالب کے لبوں سے سن کر وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔

”میں نے تو نگہت چچی سے بات برائے بات کی تھی۔ آپ کو کس نے کہا تھا کہ اس مشورے کو عملی جامہ پہنائیں۔ جو ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“ اجیہ نے ہکلاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

”نقصان کی تلافی تو بہتر صورت آپ کو ہی کرنی پڑے گی۔“

وہ اسے دھمکا کر چلا گیا۔ اجیہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اللہ جانے وہ کیسی تلافی کا ذکر کر رہا تھا۔ ویسے تو اسے دیکھ کر لگتا نہ تھا کہ اسے اس متلنی کے ٹوٹنے کا خاص افسوس ہے۔ آج کل تو ضرورت سے زیادہ ہنسوز ہو رہا تھا۔ ماں کو بھی اس صدمے سے اس نے خود ہی نکالا۔

”ٹوٹنے کی چیز تھی، ٹوٹ گئی۔ یار امی! اگر شادی ہو جانی اور ہمارے دو چار بچے ہو جاتے پھر تو آپ کا فکر مند ہونا بنتا تھا اور آپ کے ان کلف لگے

ساتھ لے جانے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اجیہ کو خود وہاں جانے کی کوئی تمننا نہ تھی لیکن اپنی ذات کی بے مائیگی پر اس کا دل ضرور بھرا آیا۔

”نادیہ کی شادی نمٹ جائے پھر اجیہ کو وہاں چھوڑ آؤں گی، ظاہر ہے پھر وہاں امی کا خیال رکھنے کے لیے بھی تو کسی کا ہونا ضروری ہے۔ ثروت بھابھی سے تو ہمیں کبھی کوئی فیض پہنچا ہی نہیں نہ ہی آئندہ امید ہے اور اب تو ان کے تیسرا بچہ ہونے والا ہے۔ ایسی حالت میں تو وہ بالکل ہی مومو بن جاتی ہیں۔ کسی کام کو ہاتھ کہاں لگا میں گی۔ سب کچھ مجھے ہی دیکھنا ہوگا۔“

عاصمہ خود ہی خود بول رہی تھیں۔ میکے جا کر کام کرنے کی ٹینشن ابھی سے سر پر سوار تھی لیکن ماں کی ہدایت تھی کہ اجیہ کا منحوس وجود نادیہ کی شادی کے بعد ہی وہاں گوارا ہوگا پھر یہاں کی ذمہ داری بھی تو اجیہ کے سپرد کر کے ہی عاصمہ نے میکے کی راہ لینی تھی، سو ہدایات کا پلندہ اجیہ کو تھما کر وہ میکے چلی گئیں۔

نادیہ کی بدسلوکیوں کے باوجود اجیہ کو اس سے دلی پر خاش نہ تھی۔ اس کی شادی کا سن کر ایک طرح سے اجیہ کو خوشی ہی ہوئی تھی لیکن یہ تصور کہ نادیہ کی شادی کے بعد اسے پھر سے نگہت مامی کے پاس جا کر رہنا پڑے گا، اس کے لیے سوہان روح تھا۔

اس گھر کے مہربان کینوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے بعد مامی کے تیور، ان کی زبان، ان کا سلوک وہ کیسے سہ پائے گی۔ اس سے تو اچھا تھا وہ عاصمہ باجی کے ساتھ یہاں آتی ہی نا۔

یہاں آ کر پتا چلا تھا کہ زندگی فقط شب و روز کی گنتی پوری کر کے زندگی کے اختتام کے انتظار کا نام نہیں بلکہ زندگی جینے کے لیے ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ رخ دیکھنے کے بعد وہاں واپس پلٹنا کتنا مشکل کام تھا۔

☆☆☆

اور پھر ایک اور مشکل نازل ہو گئی۔ غالب کی کونینہ والی خالہ نے غالب سے اپنی بیٹی کی نسبت ختم

بہنوئی کے ساتھ میرا گزارا ویسے بھی مشکل سے ہی ہوتا تھا۔ نہ میری اور شازمہ کی کوئی جذباتی وابستگی تھی۔ ہٹلر خالو نے بھی مجھے اس سے بات تک کرنے کا موقع تو دیا نہیں۔ اب جہاں اس کا نصیب ہوگا، شادی ہو جائے گی اور جہاں میری چاہت ہوگی، وہاں میرا نصیب جڑ جائے گا، ان شاء اللہ۔“

اس نے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ ماں کو مخاطب کیا۔ صفیہ چچی نے اس کے جملے پر غور کیا، اس کی آنکھوں کی چمک ملاحظہ کی پھر اسے کان سے پکڑ کر اپنے قریب کھینچا۔

ماں بیٹے کی راز و نیاز کی گفتگو اختتام کو پہنچی تو اب وہ ہی چمک صفیہ چچی کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

”آپا کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے آ غالب! نیچے تو ڈھنگ سے بات بھی نہ ہو پائے گی۔“ ان کے اتار لے پن پر غالب ہنسا۔

”دھیرج ماں..... دھیرج! آپ کی آپا کو اوپر لانے کے بجائے میں شام کو آپ کے ساتھ خود نیچے چل پڑوں گا۔ اجیہ تو اس وقت ویسے بھی نیچے پڑھانے اور آئی ہوئی ہے۔ آپ کھل کر بات کر لیجیے گا۔ کون سا گھر میں عاصمہ بھانجی ہیں۔“ اس نے ماں کو مخاطب کیا۔

صفیہ چچی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

اور جب یہ بات اجیہ پر کھلی تھی تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ ”اصول کے مطابق رشتہ مانگنے تو ہمیں تمہاری مامی کے پاس ہی جانا پڑے گا لیکن صفیہ کی خواہش ہے، پہلے تم سے تمہاری مرضی پوچھ لی جائے۔ تم پر کوئی جبر نہیں میری بچی! سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ بس یہ ذہن میں رکھنا کہ یہ میری، صفیہ کی اور سب سے بڑھ کر غالب کی خواہش ہے۔“ اماں نے اسے محبت بھرے انداز میں مخاطب کیا۔

اجیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے بے ساختہ نفی میں گردن ہلا دی۔ ستم ظریفی سے اس کے

پہلے دو رشتے بھی ان ہی الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ آئے تھے۔ فرحان کی ماں نے بھی بیٹے کی پسندیدگی کا ذکر کر کے رشتہ ڈالا تھا۔ سمیع اللہ کی ماں کے کہنے کا مطلب بھی یہ ہی نکلتا تھا اور اب غالب۔ عاصمہ باجی کا کہا، درست ثابت ہو جاتا اس نے اس گھر میں آ کر غالب پر ڈورے ڈال کر اسے پھنسا ہی لیا۔

جب فرحان سے فقط دروازے پر ایک منٹ کے ٹا کرے کی بنیاد پر اس کی ذات اس الزام کی زد میں آئی تھی کہ اس نے منٹوں ہی منٹوں میں لڑکے سے آنکھ منکا کر کے اسے پھنسا لیا اور وہ سمیع اللہ جس کی دکان کے آگے سے گزر کر وہ کالج جایا کرتی اور اس کے رشتے کی پاداش میں نگہت مامی نے اسے کالج سے ہی اٹھا لیا تو اس گھر میں تو وہ کتنے مہینوں سے رہ رہی تھی۔ وہ کس کس کو۔ ایتنی بے گناہی کا یقین دلائے گی کہ غالب سے اس کا کوئی افیر نہیں چلا ہے۔ اتنے بہت سے مہینوں میں وہ تو فقط چند بار ہی اس سے ہم کلام ہوئی ہے۔ لیکن عاصمہ باجی اس رشتے کو بنیاد بنا کر کیسے کیسے الزام نہ جڑ دیں گی اس کی ذات پر اور وہ نگہت مامی ان کی غلیظ زبان، ریک الزام اجیہ میں ہرگز ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی ذات پر مزید کچڑا چھالے جانے کو برداشت کرے۔

اس نے اماں سے کہہ دیا کہ اس قصے کو دوبارہ مت چھیڑیں اور عاصمہ باجی کی واپسی پر بھی انہیں اس بات کی بھنگ نہ لگنے دیں کہ صفیہ چچی نے ایسی کسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

”دنیا والوں کے ڈر سے کفرانِ نعمت کی مرتکب مت ہو میری بچی! تیری زندگی میں جتنی محرومیاں ہیں غالب سب کا مداوا کر دے گا۔“

ایماں اس کے خدشات جان کر اس کا مطمع نظر تو سمجھ گئی تھیں لیکن پھر بھی اس کا فیصلہ بدلوانے کی اپنی سی کوشش ضرور کی۔

”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں اماں کہ یہ فیصلہ میرے لیے کتنا مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ مجھے غالب سے کوئی سروکار نہیں لیکن جو محبت، شفقت اور اپنائیت

مجھے آپ سے، صفیہ چچی سے ملی ہے میں ان محبتوں سے منہ نہیں موڑنا چاہتی۔ میرا بس چلے میں سدا آپ کی شفقت کی چھاؤں میں زندگی گزار دوں لیکن میں اپنی ذات پر مزید ریک الزام برداشت نہیں کر سکتی۔“

اجیہ رو پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

اماں کے منہ سے یہ سن کر کہ اس رشتے میں غالب کی بھی خواہش ہے اجیہ کا دل ایک نئے انداز سے دھڑکنے لگا تھا حالانکہ پہلے جن دو رشتوں کے آنے پر اسے مامی کے گھٹیا الزام سہنے پڑے تھے ان رشتوں میں بھی لڑکوں کی جانب سے پسندیدگی کے اظہار کا ذکر کیا گیا تھا لیکن اجیہ نے اس بات پر دوبارہ غور تک کرنے کی زحمت نہ کی تھی لیکن اماں کا یہ کہنا کہ یہ غالب کی بھی خواہش ہے اجیہ کا دل و دماغ بس اسی ایک فقرے میں اٹک گیا تھا۔ رشتے کے لیے اس کی ناں توہاں میں بدلنے والی نہیں تھی لیکن جانے کیوں دل اسی ایک فقرے کی تکرار میں الجھا۔

عاصمہ باجی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب بھی اس سے جواب طلبی کرنے آن پہنچا تھا۔ بچے اسکول سے آنے والے تھے، اماں اپنے کمرے میں ظہر کی نماز ادا کر رہی تھیں اور اجیہ جلدی جلدی بچوں کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی جب غالب تنکھے تیوروں کے ساتھ کچن میں داخل ہوا۔

کچھ دیر تک وہ خاموشی سے اجیہ کو تکتا رہا تھا۔

اجیہ ہانڈی بھون رہی تھی اس کی نگاہوں سے خائف ہو کر ہانڈی کی جانب ہی توجہ مبذول رہی۔ غالب نے آگے بڑھ کر برنری آف کر دیا۔

”آپ کو کچھ چاہیے۔“ اس کچن میں غالب کچھ چھوٹی موٹی چیز مانگنے ہی آتا تھا سوا جیہ نے نگاہیں جھکائے جھکائے استفسار کیا۔

”آپ کا جواب چاہیے۔“ وہ لب بھج کر بولا تھا۔

”جواب میں اماں کو دے چکی ہوں۔“ اجیہ نے اس کی بات سمجھ میں نہ آنے کا ڈرامہ کرنے کے

بجائے سیدھا اور سپاٹ جواب دیا تھا۔

”مانا خاتون! آپ کو غالب احمد نامی بندے سے کوئی سروکار نہیں لیکن آپ نے یہ تو تسلیم کیا کہ میری امی اور میری تائی اماں جیسی خواتین کی شفقت بھری چھاؤں میں رہنا آپ کی تمنا ہے تو اس تمنا کو لا حاصل کیوں رہنے دے رہی ہیں۔“ اماں نے غالباً اسے اجیہ کا جواب حرف بہ حرف پہنچا دیا تھا جب ہی وہ خفگی بھرے انداز میں استفسار کر رہا تھا۔

”ایک بار آپ کے سامنے ہی عاصمہ باجی مجھے آپ پر ڈورے نہ ڈالنے کا مشورہ دے چکی ہیں۔ میں اس الزام کو حقیقت کا روپ نہیں دینا چاہتی۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں انکار کی وجہ بتائی۔

”عاصمہ بھابھی جیسی خاتون کی باتوں کو بنیاد بنا کر آپ اپنے ساتھ تو زیادتی کر رہی ہیں لیکن مجھے کس نقصان سے دوچار کر رہی ہیں اس کا آپ کو اندازہ تک نہیں۔“ وہ زخمی لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

”آپ نے اول روز سے اپنی ذات کے گرد جو حد بندی قائم کر رکھی تھی میں نے اس حد بندی کا احترام کرتے ہوئے آپ سے اپنے رلی جذبات کا اظہار کرنے کی جرات بھی نہیں کی بلکہ سیدھے سبھاؤ امی اور تائی اماں کو اپنا حال دن سنا کر انہیں اپنا وکیل بنایا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ فقط عاصمہ بھابھی کے ڈر سے آپ نے میرے پروپوزل پر غور تک کرنے کی زحمت گوراندہ کی اور فوراً انکار کر ڈالا۔“

”آپ میرے ماضی سے واقف نہیں۔ مجھے ایسی باتوں پر مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے جن کا نہ کوئی سر پیر تھا نہ کوئی بنیاد۔ ایک شخص سے میرا محض ایک ڈیڑھ منٹ کا دروازے پر ٹکراؤ ہوا تھا اس کا میرے لیے رشتہ آ گیا۔

میری مامی نے اس رشتے کو بنیاد بنا کر میری ذات پر خوب کچڑا چھالا تھا۔ آپ کے ساتھ تو اس گھر میں دن رات کا سامنا ہے۔ عاصمہ باجی تو دنیا کو یہ ہی کہانی سنائیں گی تاکہ میں نے ادا میں دکھا کر لڑکا پھنسا لیا۔“

”اوہ میرے خدا پھر وہ ہی عاصمہ بھابھی، آپ کا ضمیر صاف ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ اماں اور امی

آپ کے کردار کے گواہ ہیں۔ فارگاڈ سیک دنیا والوں کی بے بنیاد باتوں سے خائف ہو کر یوں جلد بازی میں فیصلہ مت کریں۔ کم از کم سوچنے کا ٹائم ہی لے لیں۔“ وہ منت پر اتر آیا۔ یہ وہ غالب نہ تھا جو ہر وقت

ہنسنے ہنسانے کے موڈ میں رہتا تھا۔ وہ بہت امیدوار لجاجت بھرے انداز میں اسے تک رہا تھا۔ اجیہ کو لگا کہ اگر آج اس نے اس کی امید نہ توڑی تو آئندہ بھی یہی ہمت نہ کر پائے گی۔ وہ اپنے دل کی سرگرمیوں سے پہلے خائف تھی۔ اپنی ذات پر مزید کوئی الزام برداشت کرنے کا یار نہ تھا۔ جب ہی دل کو ڈپٹ کر سپاٹ سے انداز میں غالب کو مخاطب کیا۔

”مجھے سوچنے کے لیے وقت نہیں چاہیے۔ میرا جواب اٹل ہے۔“

غالب لب بھینچے خفگی، غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے تکتا رہا لیکن پھر بنا کچھ کہے پلٹ گیا تھا۔

☆☆☆

نادیہ کی شادی بخیر و خوبی منٹ گئی تھی۔ عاصمہ! جی سسرال لوٹ آئی تھیں۔

”بس اب تم بھی تیاری پکڑو اجیہ! دانش بھائی سے کہہ آئی ہوں انہیں جیسے ہی فرصت ملے گی تمہیں لینے آجائیں گے۔ اپنی ٹیوشن کا سلسلہ بھی سمیٹو، بہت عیش کر لیے تم نے یہاں۔“

ان کے کہنے پر اجیہ نے دھیرے سے گردن ہلا دی۔ اس کا جانا طے شدہ امر تھا پھر بھی جانے کیوں جانے کے خیال سے ہی دل میں سناٹا سا پھیل جاتا تھا۔

پھر ایک دن اماں عصر کی نماز کا وضو کر کے واش روم سے نکلتیں تو سلیپ ہو کر گر پڑیں۔ ہڈی فریچر ہونے سے بچ گئی لیکن چوٹ کافی آئی تھی۔ عاصمہ کو ساس کی خدمت کا یار نہ تھا چند دن کے لیے اجیہ کا قیام مزید بڑھ گیا۔ اس نے جی جان سے اماں کی خدمت کی۔ پتا نہیں زندگی دوبارہ اس مہربان صفت عورت سے ملنے کا موقع بھی دیتی۔ یا نہیں۔ عاصمہ باجی کی نندیں ماں کا حال پوچھنے کو فون کرتیں تو اجیہ کی

خدمت گزاری پر اس کی بھی ممنون ہوتیں۔ ”ہمیں تو اماں نے پاکستان کے دوسرے سرے پر بیاہ دیا۔ چاہیں بھی تو جلد چکر نہیں لگا سکتے۔ خدا تمہیں خوش رکھے تم نے اماں کی بہت خدمت کی۔“

اجیہ ان کی باتوں پر شرمندہ ہو جاتی عاصمہ یا جی نے ہمیشہ اسے سسرال والوں کی رنج کر برائیاں کی تھیں لیکن یہ لوگ کتنے پیارے اور کتنے مخلص لوگ تھے۔

”میری تو یہی خواہش تھی کہ تم سدا ہمارے پاس رہو لیکن تم نے فقط میری اسی خواہش کا پاس نہ رکھا۔“ اماں بھی اسے گلے سے لگا کر آب دیدہ ہو جاتیں۔

مامی کا فون آ گیا تھا۔ ہفتہ دس دن بعد دانش بھائی اسے لینے آنے والے تھے۔ ثروت بھابھی کے گھر ننھا مہمان آنے والا تھا۔ ان کے آخری مہینے چل رہے تھے۔ نگہت مامی کی گھر کے کاموں سے ویسے ہی جان جاتی تھی۔ نادیہ قریب بیاہی تھی لیکن وہ تو شادی سے پہلے بھی کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی شادی کے بعد تو صرف مہمان خصوصی بن کر میکے آتی اب نگہت مامی کا اجیہ کو بلائے بنا گزارا نہ تھا۔

☆☆☆

اور پھر غالب کو بھی من پسند نوکری مل ہی گئی۔ اجیہ کے انکار کے بعد اس نے دوبارہ بھی اس کا راستہ روک کر اس بارے میں کوئی سوال نہ کیا تھا۔ فقط تب آتا جب اپنی تائی اماں کو سہارا دے کر اوپر لے جانا مقصود ہوتا۔ اجیہ نے ٹیوشن والی بچیوں کا مہینہ ختم ہونے کے بعد آگے پڑھانے سے معذرت کر لی تھی۔ بچیاں افسردہ تھیں اور ان کی مائیں اتنی اچھی ٹیوٹر ہاتھ سے نکلنے پر پریشان لیکن اسے اب واپسی کے لیے رخت سفر باندھنا ہی تھا۔

آفس جوائننگ کے پہلے دن غالب اماں سے دعائیں لینے نیچے آیا۔ آج سے پہلے اجیہ نے ٹراؤزر، شرٹ میں ہی ملبوس دیکھا تھا آج آفس جاتے ہوئے نارمل ڈریسنگ میں وہ بہت وجیہ لگ رہا تھا۔ اجیہ نے ایک چورنگہ اس پر ڈال کر ہٹائی۔ دل ہی دل میں سوچا ضرور کہ اماں کو اس کی نظر اتار کر آفس بھیجنا چاہیے۔ عاصمہ

”دعا کرنا اجیہ! اس بار اللہ مجھے بیٹے سے نواز دے۔“ ہسپتال جانے سے پہلے انہوں نے اجیہ سے بطور خاص دعا کے لیے کہا تھا۔

☆☆☆

اجیہ نے دل سے ان کے لیے اولاد زینہ کی دعا مانگی تھی۔ اللہ نے اولاد زینہ سے تو نواز دیا تھا لیکن ڈیوری کے وقت کوئی ایسی پیچیدگی ہوئی کہ ثروت بھابھی جان کی بازی ہار گئیں۔ یہ ایک ناقابل یقین سانحہ تھا۔ محلے کا یہ ہسپتال جہاں کسی تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کا انتظام تو نہ تھا لیکن جس مڈوائف نے یہ کلینک نما ہسپتال قائم کر رکھا تھا۔

وہ خود کو ڈاکٹر صاحبہ ہی کہلاتی تھی اور بلا مبالغہ محلے کا ہر بچہ اسی کے ہاتھوں دنیا میں آیا تھا۔ گھت مامی نے ہسپتال میں خاصا ہنگامہ مچایا لیکن بہر کیف انہیں حقیقت تسلیم کرنی پڑی، ان کی بہو انہیں پوتے کا تحفہ دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

ثروت بھابھی کے جنازے پر مامی اور ان کی بیٹیاں پچھاڑیں مار مار کر روئیں۔ اجیہ کی آنکھوں سے بھی مسلسل آنسو رواں تھے اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ ایک جیتا جاگتا شخص یوں اچانک بھی منوں مٹی بتلے جاسوتا ہے۔ ثروت بھابھی کے میکے والوں کا بھی غم سے برا حال تھا۔ دانش بھائی الگ ہوش و حواس سے بے گانہ تھا، وہ ننھا وجود جس نے ابھی دنیا میں آنکھ کھولی تھی اسے علم ہی نہ تھا کہ وہ پیدا ہوتے ہی کیا چیز کھو بیٹھا ہے۔

اجیہ نے ثروت بھابھی کی دونوں ڈری سہمی بچیوں کو حوصلہ دلا سادے کران کا دھیان بنایا تو ننھے وجود کو بھی اپنے سینے سے چٹائے رکھا۔ ان بچوں کی شکل دیکھ کر اسے ثروت بھابھی کا خیال آتا اور وہ بہت مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرتی۔ مامی ہر آئے گئے سے مل کر رونے میں تو پیش پیش تھیں لیکن ماں کی مامتا سے محروم بچوں کا انہیں کوئی خیال نہ تھا۔

بچے اب اجیہ ہی کی ذمہ داری بن گئے تھے حالانکہ عاصمہ باجی بھی میکے میں موجود تھیں اور نادیا بھی سارا دن میکے میں ہی گزارتی لیکن بھتیجیوں اور ننھے بھتیجے کا

باجی بھی اسے بہت توصیفی نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ ”خیر سے بڑے افسر لگ گئے ہو۔ اب تو برگر، شامی کباب والا بزنس چھوڑ دو گے نا غالب۔“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں بھابھی، اس کام کا مشورہ کسی خیر خواہ نے دیا تھا یہ کام ترک کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ کام تو زیادہ سلمان دیکھے گا۔ ہیلپر لڑکے ہوں گے لیکن میری پارٹنرشپ قائم رہے گی۔“

اس نے اپنے دوست کا تذکرہ کیا۔ عاصمہ باجی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اماں نے غالباً اجیہ کے دل کی بات جان لی تھی تب ہی غالب کو پاس بلا کر زیر لب پڑھ کر دم کیا۔

اجیہ بلا مقصد سائیڈ میبل پر رکھی اماں کی دوائیوں کی ترتیب الٹی پلٹی رہی۔ غالب نے اس پر فقط ایک اچستی نگاہ ڈالی تھی پھر اماں سے دعائیں لے کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

گھت مامی کے ہاں واپس لوٹ کر وہ ہی پہلے والی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ گھر کے کاموں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، مامی کے بلا وجہ کے تیکھے تیور اور سب سے بیزار کنذبات ہر تیسرے دن نادیا کی اپنے میاں کے ساتھ آدھی۔

فرزند خاصا دل پھینک شخص تھا، اجیہ سے بلا وجہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا۔ نادیا کا شوہر پر تو بس نہ چلتا البتہ اجیہ کو نگاہوں ہی نگاہوں میں کچا چبا جاتی۔ ثروت بھابھی پورے دنوں سے تھیں اجیہ خود ہی انہیں کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔

اپنی شادی کے بعد شروع کے دنوں ساس نندوں کی دیکھا دیکھی ثروت بھابھی نے بھی ان ماں بیٹی سے کوئی خاص اچھا سلوک روا نہ رکھا تھا لیکن ناہید بیگم کی اچانک موت نے انہیں یکسر بدل دیا تھا۔ وہ اس گھر میں اجیہ کی واحد خیر خواہ تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں اب انہیں بیٹے کی شدت سے آرزو تھی۔ گھت مامی بھی بیٹا نہ ہونے پر انہیں خاصے طعنے دیتی تھیں۔

بات ہی نہ چھوڑی تھی۔ ثروت کا غم بھول کر سب نادیدہ کے مسئلے میں الجھ گئے ثروت کے بچوں سے گویا کسی کو سروکار ہی نہ تھا۔ اجیہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ان معصوموں کا بساط سے بڑھ کر خیال رکھ رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی یہ خیال رکھنا کیا رنگ لائے گا۔

☆☆☆

”میں تو کہتی ہوں اماں! اجیہ کا دلش بھائی سے نکاح پڑھوادو، دلش بھائی بے چارے کیسے بولائے بولائے پھرتے ہیں۔ بچے بھی اجیہ سے خوب مانوس ہیں۔ اجیہ کی ذمہ داری سے بھی جان چھوٹ جائے گی اور بھائی کا دوبارہ گھر بس جائے گا ورنہ خود سوچو، اجیہ کی کہیں اور شادی کر دی تو گھر اور بچے کون سنبھالے گا۔ تمہاری بڈیوں میں تو دم ہے نہیں۔ میں اپنے گھر بار کی اور نادیدہ کو بھی آخر اپنے گھر جانا ہی پڑے گا۔ کس مشکل سے تو اس کی شادی ہوئی ہے طلاق کا شپہ لگ گیا تو کہاں سے دوسرا رشتہ ڈھونڈو گی۔“

مامی کی دست راست عاصمہ باجی نے ہمیشہ کی طرح چٹکی بجاتے ہی ماں کے ہر مسئلے کا حل نکالا تھا۔ کیسا صائب مشورہ دیا تھا اس نے، مامی کے دل کو یہ تجویز بہت بھائی پہلے پہل تو انہوں نے اٹھتے بیٹھتے اجیہ کو دعاؤں سے نوازنا شروع کیا جو بن ماں کے بچوں کا اتنی اچھی طرح خیال رکھ رہی ہے۔

”تو خود ماں سے محروم ہے بچی۔ تجھ سے زیادہ ان معصوموں کا دکھ کون سمجھ سکتا ہے۔“ وہ اجیہ کو گلوگیر انداز میں مخاطب کرتیں۔ اجیہ کی اپنی آنکھیں یہ سن کر بھر آئیں۔

وہ کسی یتیم یا صلے کی تمنا کیے بغیر ان بچوں کا خیال رکھ رہی تھی اس کا خیال رکھنا کیا رنگ دکھائے گا یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اور جب مامی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر رندھی ہوئی آواز میں اسے بتایا کہ وہ ان بچوں کی وجہ سے اس کا دلش بھائی سے نکاح پڑھوانے والی ہیں تو اجیہ ٹکڑ ٹکڑ کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

مامی اس سچ پر بھی سوچ سکتی ہیں یہ بات اس کے خواب خیال میں چھپی نہ تھی۔ دلش بھائی اس سے

خیال رکھنا انہوں نے اجیہ ہی کی ڈیوٹی جان رکھی تھی ہاں ثروت بھابی کی ماں بہنیں آتیں تو اپنی بیٹی کی نشانی سینے سے چھنائے رکھتیں۔ اجیہ کو لگتا یہ غم صرف ثروت بھابی کے میکے والوں اور دلش بھائی کا جبکہ نقصان صرف اور صرف بچوں کا ہے۔

☆☆☆

نگہت مامی کے گھرانے پر ٹوٹنے والی یہ واحد قیامت نہ تھی ایک روز نادیدہ کے گھر فرزند کی پہلی بیوی اور اس کے گھر والوں نے دھاوا بول دیا۔ فرزند علی پہلے سے شادی شدہ تھا۔ گاؤں میں اس کی بیوی اور دو بچے تھے اس نے خود کو چھڑا چھانٹ ٹاٹ کر کے اپنی فیکٹری میں کام کرنے والی ایک عورت کو پیسے دے کر فرضی خالہ بنا کر یہ رشتہ کروایا تھا۔ اب اللہ جانے گاؤں میں اس کی دوسری شادی کی بخبری کس نے کر دی جو وہ لوگ اس کا بھانڈا پھوڑنے شہر پہنچ گئے۔ فرزند علی کے اس دھوکے پر نادیدہ کو تو غش پر غش آ رہے تھے۔ نگہت مامی نے بھی داماد کا گریبان پکڑ کر اسے اس دھوکہ دہی پر بے بھاد کی سنائی۔

”بس کرو امی جان! میں نے تمہاری بیٹی کو ورغلا کر شادی نہیں کی بلکہ مجھے ورغلانے والی تو یہ خود تھی۔ میں نے تو پھر نکاح کا جائز بندھن جوڑا یہ تو میرے اشارے پر ہر حد پار کرنے پر تیار تھی۔ قصور وار مجھ سے زیادہ تمہاری بیٹی ہے۔“ فرزند علی نے ساس کے ہاتھ سے اپنا گریبان چھڑوایا۔

”میں مرد ہوں، چار شادیاں بھی کر سکتا ہوں اور خیر سے اتنا کماتا ہوں کہ شہر اور گاؤں میں دو بیویاں انورڈ بھی کر سکتا ہوں۔ شاہدہ کو میں سمجھا لوں گا۔ وہ گاؤں میں ہی رہے گی اگر نادیدہ بسنا چاہے تو میرے گھر کے دروازے کھلے ہیں لیکن اب بات کھل ہی گئی ہے تو یہ بتادوں کہ میں گاؤں بھی باقاعدگی سے جاؤں گا۔ شاہدہ میرے دو بچوں کی ماں ہے آخر اس کا بھی حق ہے مجھ پر اگر نادیدہ علیحدہ ہونا چاہے تو طلاق کا کاغذ بھوادوں گا۔ فیصلہ آپ لوگ خود کر لو۔“ اس نے تو نگہت مامی کے بولنے کے لیے کوئی

عمر میں بہت بڑے تھے وہ تو مر کر بھی تصور نہ کر سکتی تھی کہ انہیں شوہر کے روپ میں قبول کر لے۔ ان کے بچوں سے محبت اور انسیت اپنی جگہ لیکن وہ خود میں یہ قربانی دینے کی ہمت نہ پا رہی تھی۔

سگی دادی اور پھوپھیاں اپنے خون سے اتنی لائق برت سکتی ہیں تو اس سے یہ توقع کیوں لگا بیٹھیں کہ وہ ہنسی خوشی قربانی کا بکرا بن جائے گی۔

اس نے عاصمہ باجی کو واضح الفاظ میں بتا دیا کہ وہ دانش بھائی سے شادی کے لیے تیار نہیں ہے۔

”دانش بھائی سے اچھا رشتہ تمہیں کہاں سے ملے گا بے وقوف لڑکی۔ نادیہ کے حشر سے سبق سیکھو۔

غیروں میں بیباہ تو کیسا دھوکا ہو گیا ہمارے ساتھ، ہم سب تو تمہارے دیکھے بھالے ہیں اور یہ گھر تمہارا پناہ۔

راج کروگی دانش بھائی سے شادی کے بعد۔ خود سوچو اماں سو بیمار یوں کی پوتلی آج ہیں کل نہیں، ہم دونوں بہنیں اپنے اپنے گھروں کی۔ اس گھر کے سیاہ سفید کی مالک بالآخر تم ہی ہوگی۔“

عاصمہ باجی نے اس ”بے وقوف“ لڑکی کو سمجھانا چاہا تھا اس بے وقوف لڑکی کا انکار پھر بھی اقرار میں نہ بدلاتو عاصمہ باجی نے اپنا لہجہ بدل ڈالا۔

”پرسوں ثروت بھابھی کے چالیسویں کا ختم ہے میں جانے سے پہلے یہ قصہ نمٹانا چاہتی ہوں، نکاح تو تمہارا دانش بھائی سے ہی ہوگا ورنہ اماں کو تو تم جانتی ہی ہو۔ جو بات ابھی پیار محبت سے کہہ رہی ہیں وہ زور زبردستی سے بھی منوالیں گی۔“ عاصمہ باجی کی بات سن کر اجیہ کی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کی اب تک کی زندگی بہت کٹھنائیوں سے عبارت تھی لیکن اب زندگی جو امتحان لینے والی تھی وہ اس مرحلے سے نمٹنے کی خود میں سکت نہ پاتی تھی۔

سوچ سوچ کر جب دماغ شل ہو گیا تو اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے سے پہلے اپنی ذات کے حوالے سے پہلی بار کوئی کوشش کرنے کی ٹھانی۔

عاصمہ باجی کا موبائل چپکے سے اٹھا کر چھت

پر جاتے۔ اس کا دل کیسے دھڑک دھڑک کے پسلیوں سے باہر آ رہا تھا یہ وہ ہی جانتی تھی۔ اس کڑے وقت میں اسے اماں کی مدد لینے کا ہی خیال آیا تھا صرف وہ ہی تھیں جو عاصمہ باجی کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے دباؤ ڈال سکتی تھیں اس نے دھڑکتے دل سے اماں کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

”جی عاصمہ بھابھی! تانی اماں واش روم میں ہیں جیسے ہی آتی ہیں میں آپ کی بات کرواتا ہوں۔“

دوسری طرف غالب تھا۔ اجیہ کے دل نے ایک دھڑکن مٹا دی۔

”میں اجیہ بول رہی ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ دوسری طرف ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔

”جی فرمائیے اگر اماں سے کام ہے تو آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ کچھ دیر بعد کال کر لیجیے گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

”نہیں پلیز کال مت کاٹیے گا۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”میرے پاس فون کی سہولت نہیں ہے میں عاصمہ باجی کے فون سے چھپ کر اماں کو کال کرنے

اور پرچھت رہ آئی ہوں۔ آپ پلیز اماں کو میرا پیغام پہنچا دیجیے کہ گھر والے میرا نکاح زبردستی دانش بھائی سے کرنے والے ہیں اگر اماں عاصمہ بھابھی پر دباؤ ڈال کر یہ نکاح رکوائیں تو.....“

اس سے آگے کا جملہ مکمل نہ ہو پایا تھا بے بسی کے احساس سے آنسو ٹپکنے لگے تھے دوسری طرف سے غالب نے کچھ دیر تو اس کے بولنے کا انتظار کیا پھر کچھ کہے بنا کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔

اجیہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی دوپٹے میں موبائل چھپائے واپس نیچے آ گئی تھی۔ اپنی اس احمقانہ کوشش ایک اذیت بھری ہسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگی تھی۔

بھلا اس گھر کے مکینوں پر اماں کا کیا حکم چلنا تھا۔ وہ عاصمہ باجی کی ساس تھیں تو عاصمہ باجی اپنے گھر کی حد تک تو ان کی بات ماننے کی پابند تھیں یہاں

اپنے میکے کے معاملے میں وہ اماں کو دخل در معقولات کی اجازت کیوں کر دیتیں لیکن رب تو تھا ناں جو شہ رگ سے زیادہ قریب تھا۔ اس نے آخر اللہ کی رضا پر سارا معاملہ چھوڑ دیا۔ عجیب خالی الذہنی کی کیفیت تھی لیکن دل کسی حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلا طلوع ہونے والا دن سب کے لیے بہت حیران کن دن ثابت ہوا تھا۔ دو چار دنوں سے دانش بھائی کے بچے اپنے ننھیال گئے ہوئے تھے۔ دانش بھائی بھی کبھی تو گھر آتے اور بھی بچوں کے پاس سرال میں ہی رات گزارتے۔ آج وہ آئے تو اکیلے ہی تھے بچے یقیناً ننھیال ہی چھوڑ آئے تھے۔

”بچوں کو لے آنا دانش! کب تک ان لوگوں کے ہاں چھوڑ کر آتا رہے گا۔“ نگہت مامی نے بیٹے کو مخاطب کیا۔

”یہاں کون سنہالے گا بچے اماں! نہ تمہیں فرصت نہ تمہاری بیٹیوں کو۔“ وہ عجیب سخ انداز میں بولے۔

”اجیہ ہے نا، خوب سنہال لیتی ہے بچوں کو اور بس کل چالیسواں ہو جائے تو میں اجیہ سے تیرا نکاح پڑھوا دوں۔ تیری زندگی بھی سکون میں آجائے گی اور بچوں کی بھی۔“ مامی اس فیصلے پر پہنچ کر از حد مطمئن تھیں۔ یہ بات وہ پہلے بھی بیٹے کے گوش گزار کر چکی تھیں جب تو وہ خاموش رہا تھا۔ مامی نے اس خاموشی کو ہی اس کی رضامندی جانا تھا۔ ظاہر ہے اس عمر میں اسے اجیہ سی حسین اور کم عمر بیوی اور کہاں سے ملتی لیکن آج دانش ماں کی بات سن کر پہلے کی طرح خاموش نہ رہا۔

”اجیہ نے جس محبت سے میرے بچوں کا ان مشکل دنوں میں خیال رکھا میں اس کا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گا لیکن خدا کے لیے اماں کسی کی اچھائی کو اس کے گلے کا طوق مت بناؤ، اس بچی پر تم نے پہلے ہی جتنے ظلم روا رکھے ہیں۔ ان ہی پر خدا سے جھجھش کرو ورنہ تو غنیمت ہے۔ اب اس بے زبان پر مزید ظلم مت توڑو۔“

”کون سے ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں بھی میں نے اس بے چاری پر، تیرے فائدے کو ایک بات سوچی اور تو ماں کا شکر گزار ہونے کے بجائے اول فول بک رہا ہے۔“ مامی تو آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔

”اجیہ اور میری عمر کا فرق دیکھیں۔ کل تک جس بچی کو میں نے گودوں کھلایا ہے۔ میں اسے بیوی کا روپ کیسے دے سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے آدھی عمر کی بھی نہیں ہے اور ویسے بھی میں نے طلعت سے نکاح کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

دانش بھائی نے گویا ماں کی سماعتوں پر بم پھوڑا تھا۔ طلعت، مرحومہ ثروت کی بڑی بہن تھیں۔ بانجھ پن کی پاداش میں طلاق ٹھپہ لگائے برسوں سے ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی تھیں۔ زبان کی تیزی میں ثروت کو بھی مات دیتی تھیں۔

”تیرا دماغ تو صحیح ہے دانش! تیرے لیے وہ تیز طرار بڑی عمر کی مطلقہ ہی رہ گئی ہے ارے وہ تو ثروت سے بھی چار سال بڑی ہے۔“ اماں نے بیٹے کی کم عقلی کا ماتم کیا۔

”ثروت سے چار سال بڑی ہے نا، میری اور اس کی عمر میں تو کوئی خاص فرق نہیں اور کیا ہوا وہ مطلقہ ہے۔ میں بھی تو کنواں نہیں پھر وہ بچوں کی سگی خالہ ہے۔ بے اولادی کے کرب سے گزر چکی ہے۔ اگر دنیا میں کوئی میرے بچوں کو ماں جیسا پیار دے سکتا ہے تو وہ طلعت ہی ہے اگر منانا چھوٹا نہ ہوتا تو ہو سکتا ہے میں یہ نکاح چند مہینے آگے بڑھا دیتا لیکن اس ننھی جان کو تو نہیں پتا۔ کہ ابھی اس کی ماں کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اسے ماں کی آغوش کی فوری ضرورت ہے۔ میں کل ہی طلعت کو نکاح پڑھوا کر گھر لا رہا ہوں۔ بچوں کی مجبوری سمجھتے ہوئے میرے سرال والے بھی فوری نکاح پر ارضی ہو گئے ہیں۔“ دانش بھائی نے قطععی اور حتمی انداز میں ماں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

”ارے انہوں نے تو راضی ہوتا ہی تھا ان کی اس بڑھی ہوئی بیٹی کو اتنا اچھا برا اور کہاں سے ملنا تھا۔ مجھے سمجھ سے اس حماقت کی توقع نہیں تھی دانش۔“ مامی کا صدمے سے برا حال تھا۔

اماں، صفیہ چچی اور غالب کی یہاں آمد بغیر کسی پیشگی اطلاع کے اور اتنی اچانک تھی کہ عاصمہ باجی سمیت سب حیران رہ گئے۔ ثروت بھابھی کے انتقال پر اماں نوید بھائی کے ساتھ ایک دن کے لیے ضرور آتی تھیں لیکن اگلی صبح ہی واپس بھی چلی گئی تھیں۔ اب گھر میں کسی کو ان لوگوں کی آمد کا مقصد سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ نگہت ماما بیٹی کے سرالیوں سے جتنا مرضی چڑتی تھی، بھر کیف داماد کی ماں کو پروٹو کول تو دینا پڑتا ہی تھا۔ اجیہ کو مہمانوں کی خاطر تواضع کا کام سونپ دیا گیا تھا۔

ماما کے تیوروں سے خائف اجیہ نے تو اماں اور چچی سے چٹ کر آنسو بہانے سے بھی اجتناب کیا تھا۔ وہ دونوں بھی اجیہ سے سرسری سے انداز میں ہی ملی تھیں۔ اجیہ اتنے عرصے بعد ملنے پر اس سرد مہر سے انداز کی توقع کر ہی نہ پا رہی تھی سو حیران ہونے کے ساتھ اداس ہو گئی۔

شام تک مہمانوں کے آنے کا مقصد واضح ہو گیا تھا۔ صفیہ چچی نے غالب کے لیے اجیہ کا ہاتھ طلب کیا تھا۔

”بھئی نگہت! میں تو صاف اور سچی بات کرنے کی عادی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب سے ہمارا بچہ اچھے عہدے پر براجمان ہوا ہے تو آفس میں ساتھ کام کرنے والی ایک لڑکی میں بہت دل چسپی لینے لگا ہے اب تم تو جانتی ہو کہ غالب صفیہ کا کیسا منتوں مرادوں سے پالا بچہ ہے۔ صفیہ کو ڈر ہے کہ وہ تیز طرار لڑکی غالب کو پوری طرح اپنے قابو میں نہ کر لے ہمیں تو کوئی سیدھی سادی اور گھریلو لڑکی چاہیے۔ صفیہ کو اس لحاظ سے اجیہ بہت بھلی لگتی ہے کہتی ہے بہو ایسی ہو جو خدمت بھی کرے اور گھر بھی سنبھالے۔ صفیہ نے یہ ہی مناسب جانا کہ اس سے پہلے غالب اس لڑکی کے پیار میں پاگل ہو کر ماں کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے اسے کسی کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ بس اسی لیے تمہارے پاس دست والے کو آئے ہیں۔“

دانش بھائی ماں کے واویلے کو نظر انداز کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ برآمدے میں آرن اسٹینڈ کے پاس کپڑوں کا ڈھیر استری کرتی اجیہ کی سامنتوں سے ماں بیٹے کی گفتگو کا کوئی حرف ان سنانہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پٹ پٹ آنسو گر رہے تھے۔ دانش بھائی اس کے قریب سے گزرے تو لمحے بھر کو رکے پھر دھیرے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”ناہید پھوپھو کے انتقال کے بعد ثروت اکثر مجھے ٹوکتی تھی کہ اجیہ کا خیال رکھا کرو ورنہ قیامت کے دن اسے ابا اور پھوپھی کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ میں نے بھی اس کی نصیحت پر کان نہ دھیرے ہمیشہ گھر کے معاملات سے لاتعلقی رہا لیکن بہر حال اتنا خود غرض اور بے حس نہیں بن سکتا تھا تم ساری پریشانیاں ذہن سے جھٹک دو گڑیا!

میرے بچوں کا اتنے دن خیال رکھنے کا شکریہ اور ہو سکے تو اپنی ثروت بھابھی کی دعائے مغفرت کے ساتھ ساتھ میرے بچوں کے حق میں بھی دعا کرنا۔ وہ ماں کھو چکے ہیں اور تمہارا حال دیکھ میں یہ سوچ کر کانپ اٹھا کہ اگر خدا نخواستہ باپ کا سایہ بھی قائم نہ رہے تو زندگی اتنی کٹھن اور دشوار بھی ہو سکتی ہے۔ اماں کا دل تو جانے کب موم ہو لیکن میں تم سے معافی کا طلب گار ہوں۔ میں نے ابا کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا اور گھر کا سربراہ ہونے کا حق ادا نہیں کیا۔“

دانش بھائی تھکے تھکے انداز میں کہتے ہوئے اس کا سر تھپتھا کر آگے بڑھ گئے۔ اجیہ نے جاتے سے ان کی پشت کو عقیدت سے دیکھا۔ وہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے اسلم ماموں کے بیٹے ہونے کا حق ادا نہ کیا۔ آج انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے نگہت ماما جیسی خاتون کی آغوش میں پرورش پائی بھی ہے تو بہر حال ان کی رگوں میں اسلم ماموں کا ہی خون دوڑ رہا تھا۔

اس نے بہت دل سے دانش بھائی کی پرسکون زندگی، ان کے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے رب سے دعا کی تھی اور جہاں تک ثروت بھابھی کا تعلق تھا انہوں نے تو ہمیشہ ہی اجیہ کی دعاؤں کا جواب دیا تھا۔

اماں نے اپنے مخصوص دنگ انداز میں سارا قصہ سمدھن کو کہہ سنایا۔ اماں کی آواز اجیہ کی سماعتوں سے مخفی نہ رہ پائی تھی۔ ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

تو یہ حقیقت بھی غالب صاحب آپ کی چاہت کی۔ جب منگنی ٹوٹی اور کوئی باقاعدہ نوکری نہیں تھی تب اجیہ کے لیے چاہت کے اظہار کے ساتھ رشتہ مانگا اور جب تک اجیہ وہاں بھی تو غالب کی بے رخی میں بھی کیسا زخمی پن جھلکتا تھا جیسے اجیہ اس کا دل توڑ کر گناہ عظیم کی مرتکب ہوئی ہو اور اتنی جلدی کسی دوسری لڑکی کی زلف کے اسیر بھی ہو گئے۔ باعزت کیریئر کی شروعات کے بعد اسے اجیہ جیسی معمولی لڑکی یاد بھی کہاں رہی ہوگی، اب وہ یقیناً ماں کی محبت اور تانی کے دباؤ کی وجہ سے یہاں چلا آیا تھا۔

اجیہ اس کی زندگی میں زبردستی شامل نہ ہونا چاہتی تھی لیکن یہاں کوئی اجیہ کی رائے لینے کا روادار نہ تھا۔ اماں نے صاف کہہ دیا کہ انہیں جہیز وغیرہ کی کوئی طلب نہیں ہے۔ وہ اجیہ کو فوری نکاح کر کے ساتھ رخصتی کے متمنی تھے۔

”مجھے جوڑوں کا درد لے بیٹھا ہے۔ صفیہ کی خود طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ صفیہ کو جہیز کے بجائے فوری طور پر خدمت کرنے والی بہو چاہیے اور ویسے بھی باقاعدہ شادی کا کوئی موقع ہے بھی نہیں۔ ابھی تو تمہارے خاندان پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔ اجیہ کو سادگی سے نکاح کر کے ہمارے ساتھ رخصت کر دو۔ ولیمہ ہم خود دھوم دھام سے کر لیں گے۔“

اماں کے کہنے پر نگہت مامی نے ہنکارا بھرا۔ سچ تو یہ تھا کہ دانش کے فیصلے کے بعد یہ لڑکی ان پر بوجھ ہی تھی۔ اس کی کہیں بھی شادی کرتے تو دنیا دکھاوے کو کچھ دے دلا کر ہی رخصت کرنا پڑتا۔ اجیہ کی مرحومہ ماں کا زیور وہ خاموشی سے نادیہ کو چڑھا چکی تھیں۔ دو کپڑوں میں کون لڑکی کو رخصت کروا کر لے جاتا۔ انہوں نے سر سے بلا اتارنا ہی مناسب جانا اور اماں کو نکاح کے لیے رضا مندی دے دی۔

صفیہ چچی اور اماں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ پہاڑ جیسا مرحلہ اتنی آسانی سے سر ہو جائے گا ان کے گمان میں بھی نہ تھا۔

☆☆☆

اگلے دن دانش، طلعت سے نکاح کر کے گھر لے آیا تو سادگی سے اجیہ اور غالب کے نکاح کی رسم بھی ادا کر دی گئی تھی۔

عاصمہ اس نکاح پر کچھ غیر مطمئن تھیں۔ اجیہ نے اب اس گھر میں غالب کی بیوی کی حیثیت سے رہنا تھا بھلے سے پورشن اور پرتا لیکن اس کی حیثیت تو پہلے والی نہ ہوتی اسے رشتے کی دیورانی کے روپ میں بھی قبول کرنا عاصمہ کے لیے آسان نہ تھا لیکن سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ عاصمہ کو اپنی دماغی صلاحیتیں استعمال کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

غالب کی آمد کے بعد غالب کو بیٹھک میں ٹھہرایا گیا تھا۔ نگہت مامی نے تو نکاح سے پہلے اسے دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہ کی۔

نکاح کے بعد جب نگہت اور نادیہ نے اجیہ کے شوہر کو دیکھا تو حیرت سے ساکت رہ گئیں۔ وہ لمبا چوڑا خوابوں سا شخص اس ”بے چاری“ نظر آنے والی اجیہ کے نصیب میں لکھا تھا۔

”کیسا زور آور تھا اس کا نصیب“ نادیہ نے فرزند علی پر ایک بیزار کن نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا تھا۔ خاصا رو دھو کر اسے شوہر کے گھر واپس جانا پڑا تھا۔ یہ سمجھوتہ اس کے مقدر میں لکھا تھا اور مقدر سے بھلا کون لڑ سکتا ہے۔ وہ اجیہ اور اپنے مقدر کا موازنہ کرتی ہمیشہ کی طرح شدید ترین بے اطمینانی کا شکار ہوئی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ بے اطمینانی حسد کرنے والوں کے مقدر میں ہمیشہ کے لیے درج ہوتی ہے۔

نکاح کے بعد جس والہانہ انداز میں صفیہ چچی اور اماں نے اجیہ کو ساتھ لپٹایا تھا تو اس کا من شانت ہو گیا۔ بھلے سے غالب کی چاہت اسے نصیب ہوتی ہے یا نہیں، ان دونوں مہربان عورتوں کی شفقت بھری چھاؤں میں زندگی گزارنا اس کے لیے بہت سہل ہو گا۔

دانش بھائی کے اصرار کے باوجود مہمانوں نے اپنی امانت کے ساتھ فوراً واپسی کی ٹھانی۔

”وہاں گھر پر نوید بھی تو اکیلا ہے نا، وہ تو خود سے انڈا تک نہیں تل سکتا۔ عاصمہ کا جب تک جی چاہے یہاں رہ لے گی ہمیں تو بس اب واپسی کی اجازت دیں۔ جب ویسے کی تاریخ طے کر لیں گے تب آپ سب لوگ آئے گا۔“

صفیہ چچی نے اپنی بہو کو ساتھ لپٹا کر واپسی کی اجازت چاہی، وہاں کون سا کوئی نہیں روکنے کو مہراجار ہاتھا سو جھوٹی مسکراہٹیں چہرے پر سجا کر انہیں رخصت کر دیا۔

”پتا نہیں غالب آج بھی کسی دوست کی گاڑی مانگ لایا تھا یا یہ اس کی اپنی گاڑی تھی۔“ اجیہ کچھلی نشست پر بیٹھنے لگی تو اماں نے اسے ٹوکا۔

”اگلی سیٹ پر بیٹھو بیٹا۔ ہم دو بڑھیوں کو تو سفر میں بچوں کی طرح فوراً نیند آ جاتی ہے اور غالب اگلی نشست پر بیٹھ کے سونے کی اجازت نہیں دیتا کہتا ہے یوں ڈرائیور کو بھی نیند آ جاتی ہے سو آگے تو تم ہی بیٹھو گی۔“

اماں کے ٹوکے پر وہ چپ چاپ اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

کچھ عرصے میں ہی غالب میں کتنی تبدیلی آ گئی تھی۔ کہیں سے نہ لگ رہا تھا یہ پہلے والا غالب ہے یہ تو کوئی اور ہی سنجیدہ اور بردبار سا شخص تھا۔ گاڑی میں صرف اماں اور چچی تھیں جو مختلف موضوعات پر اظہار خیال کر رہی تھیں پھر اماں کا کہا جیج ثابت ہوا کچھ سفر گزرنے کے بعد ہی دونوں خواتین پر نیند طاری ہونے لگی۔

اجیہ بظاہر کھڑکی کے شیشے سے باہر کے نظاروں پر نظر جمائے بیٹھی تھی لیکن اگر کوئی پوچھتا کہ چند لمحوں پہلے باہر کون سا منظر گزرا ہے تو وہ کوئی جواب نہ دے سکتی تھی۔ ساتھ بیٹھے ڈرائیو کرتے غالب کی موجودگی کا احساس دیگر تمام احساسات پر حاوی تھا۔ جب وہ اجیہ تھا تو کتنی اپنائیت اور بے تکلفی سے مخاطب ہوتا تھا اور آج جب اس کی ذات سے اس کا سب سے مضبوط حوالہ جڑ گیا تھا تو کیسا اجیہ اجیہ سا لگ رہا تھا۔

”آپ باہر کے نظاروں پر تو یوں نگاہیں

جمائے بیٹھی ہیں جیسے ہم شمالی علاقہ جات کی حسین وادیوں سے گزر رہے ہوں۔ بالی داوے بتانا پسند کریں گی کہ اس بے ہنگم ٹریفک والے روڈ پر آپ کی دلچسپی کا کیا سامان ہے جو نگاہیں وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔“

ایک وقفے کے بعد غالب نے ہی خاموشی توڑی تھی۔ اجیہ نے ذرا کی ذرا نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا چند لمحوں تک وہ خاموش رہی تھی، غالب کے سوال کا یقیناً اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن غالب کے لیے اس کے پاس ایک سوال ضرور تھا اور وہ جی کڑا کر کے سوال پوچھتے بنانہ رہ پائی۔

”جب آپ کسی اور کو پسند کرنے لگے تھے تو اماں اور چچی کے کہنے پر یہ رشتہ کیوں جوڑا۔“ غالب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی وہ کب سے اسی سوال کا منتظر تھا۔

”کیا کرتا مجبوری تھی آپ تو جانتی ہیں خاتون! میں اپنی ماں اور رتائی کا کتنا فرماں بردار ہوں۔“ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس نے بہت مظلوموں والا انداز اختیار کیا۔

”اگر آپ اپنی آفس کو لیگ کو پسند کرنے لگے تھے تو آپ کو اپنی پسند صفیہ چچی سے منوانی چاہیے تھی۔ مجھ سے رشتہ جوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔“

اجیہ کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں ڈبڈبائے لگی تھیں۔ ان آنکھوں میں آنسو ہی تو غالب کی کمزوری تھے سو اسے مزید ستانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

”آپ کو کیسے یقین دلاؤں خاتون! کہ آپ ہی میری پہلی اور آخری چاہت ہیں۔ آپ نے پہلے بھی میری چاہت کو اس لیے درخور اعتنا نہ جانا تھا کہ اس سے آپ کی نیک نامی پر حرف آتا تھا۔ آپ کو عاصمہ بھابھی کی ان ہی باتوں سے ڈر لگتا تھا ناں کہ وہ یہ رشتہ ہونے پر آپ کو لڑکا پھانسنے کا طعنہ دیں گی۔ فقط آپ کو بے بنیاد الزام سے بچانے کی خاطر میں تائی اماں اور امی کو یہ بطور خاص سمجھا بجا کر لایا تھا کہ وہ یوں ظاہر کریں جیسے میں کسی اور لڑکی کے چکر میں ہوں اور صرف ماؤں کے مجبور کرنے پر اس رشتے پر راضی ہوا ہوں۔“

غالب نے تفصیلی وضاحت دے کر اس کے دل میں گڑی پھانس نکال دی تھی۔ اس وضاحت کے بعد اجیہ کے پاس واقعی بولنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ دل یکدم مطمئن اور شاد ہو گیا تھا۔

”مجھے نہیں پتا محبت کس بلا کا نام ہے میں بس یہ جانتا ہوں کہ پہلی ملاقات سے لے کر آج تک مجھے آپ کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں ہوتے اور جب کبھی قسمت سے میں آپ کو مسکراتا دیکھ لوں تو وہ مسکراہٹ مجھے سارا دن شاد رکھتی ہے اگر اسی کا نام محبت ہے تو میں روز اول سے آپ کی محبت میں مبتلا ہوں۔ اب یقین کرنا نہ کرنا آپ کی اپنی صوابدید پر ہے خاتون۔“

وہ بہت سنجیدگی بھرے لہجے میں اظہار محبت بھی کر بیٹھا تھا۔

”یہ آپ مجھے ہمیشہ خاتون کہہ کر کیوں مخاطب کرتے ہیں۔“ اجیہ کو اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ سوچا تو الگ ہی موضوع چھیڑا۔ یہ سچ تھا کہ اسے غالب کے منہ سے اپنے لیے محترمہ یا خاتون کے الفاظ کبھی بھلے نہ لگتے تھے لیکن آج سے پہلے وہ اسے ٹوکنے کی مجاز نہ تھی اب ان کے بیچ جڑے رشتے نے اتنی ہمت تو بخش دی کہ وہ دل میں کب سے کلبلاتا شکوہ زبان پر لے آئی۔

”دیئے تو اب آپ آفیشلی میری خاتون بن گئی ہیں لیکن اگر یہ لفظ آپ کے کانوں کو بھلا نہیں لگتا تو کچھ اور سوچ لیتے ہیں۔“

وہ چند لمحے خاموشی اختیار کر کے جیسے واقعی اس معاملے پر سوچ بچار کرنے لگا۔

”جان من زیادہ مناسب رہے گا یا جان تمنا؟“

ذرا سی گردن ترچھی کر کے وہ بہت سنجیدگی بھرے لہجے میں اس کی رائے جاننا چاہ رہا تھا۔

اجیہ کی ہتھیلیوں میں تو پسینہ آنا لازمی امر تھا اس نے بوکھلا کر پھر کھڑکی کی طرف نگاہیں جمائیں۔ اس بوکھلاہٹ پر غالب فدا ہی تو ہو گیا۔

”ایک غلط فہمی اور دور کردوں جان من! آپ تو وہاں سے مجھے صاف انکار کر کے چلتی بنی تھیں میں

نے اس انکار کو تب بھی تسلیم نہ کیا تھا۔ مجھے فقط مناسب وقت کا انتظار تھا ہاں شکوہ فقط اس بات کا ہے کہ آپ نے میری محبت کو بھی اعتبار کے قابل ہی نہ جانا۔ جب مشکل وقت پڑا تب بھی مجھے پکارنے کے بجائے تائی اماں کی ہی مدد چاہی، وہ تو اتفاق سے میں لائن پر تھا۔ آپ کا فون سن کر میری جان سولی پر لٹک گئی تھی فوری طور پر تائی اماں ادرا می کو معاملے سے آگاہ کیا، اپنے زرخیز ذہن سے ترکیب لڑائی اور شکر ہے خدا کا کہ سب کچھ میری پلاننگ کے مطابق ہو گیا۔ اب فقط ایک آرزو ہے کہ چاہت کا چھوٹا موٹا اقرار میں اپنی جان تمنا کے لبوں سے بھی سن لوں۔“

”تو بہ یہ تو وہ ہی غالب تھا باتوں میں اس سے کون جیتتا پھر باتیں بھی اس قسم کی۔ اجیہ کا چہرہ لال گلابی اور کانوں کی بوس سرخ ہو گئیں۔

”مجھے بھی بہت نیند آرہی ہے اگر میری آنکھ لگ گئی تو کوئی خطرے والی بات تو نہیں۔“ اس نے بوکھلا کر موضوع بدلاتھا۔

”ظاہر ہے جب تک میں ڈرائیو کر رہا ہوں آپ کو کیا خطرہ، پیچھے دونوں خواتین محو استراحت ہیں۔ بندہ ناچیز فقط ہاتھ پکڑنے کی جرات ہی کر سکتا ہے۔“ غالب نے شرارتی انداز میں ایک ہاتھ سے اس کا گود میں رکھا ہاتھ تھام کر دبایا۔ اجیہ نے گھبرا کر پیچھے دیکھا پھر اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کی۔ غالب نے مسکرا کر گرفت چھوڑ دی۔ اجیہ کے اوسان بحال ہوئے۔

”شادی کے بعد تمہیں پہلی فرصت میں مجھ سے کھانا بنانا سیکھنا ہوگا اب تجربے کرنے کے لیے تمہارا اپنا کچن ہوگا تو اب تم بد مزہ کھانا بنانے کے لیے کوئی توجیہ پیش نہ کر سکو گی۔“ اجیہ کی گھبراہٹ دیکھ کر غالب نے اسے مزید ستانا مناسب نہ جانا اور مسکرا کر موضوع ہی بدل دیا۔

”جتنا مرضی سیکھ لوں لیکن آپ جیسا ذائقہ میرے ہاتھ میں نہیں آ سکتا۔“ اجیہ نے اعتراف میں عار نہ سمجھا۔

ایکسڈنٹ تھی۔ وہ ہنساتھا۔

”غالب بچے کتنا سفر رہ گیا؟“ اسی لمحے اماں نے غنودگی بھری آواز میں استفسار کیا۔

”سو جا میں تائی اماں! ابھی بہت سفر باقی ہے۔“ غالب نے انہیں آگاہ کیا۔

”بس نیند کا ایک جھٹکا لگتا تھا لگ گیا، اب کہاں دوبارہ سو پاؤں گی۔“ وہ ذرا چوکس ہو کر اٹھ بیٹھی تھیں۔

”شکر ہے تائی اماں آپ دو منٹ بعد جاگی ہیں ورنہ میں اس وقت خود کو روئے زمین کا خوش قسمت ترین بندہ تصور نہ کر رہا ہوتا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا اجیہ نے گڑ بڑا کر اسے دیکھا تائی کالا ڈلا جانے کیا کچھ مزید گوش گزار کر ڈالے۔

”کیوں کیا ہوا تھا دو منٹ پہلے؟“ انہوں نے اچنبھے کے عالم میں دریافت کیا۔

ایک محفوظ مسکراہٹ غالب کے لبوں پر پھیلی اس نے شرارت سے اجیہ کی بوکھلائی شکل ملاحظہ کی۔

”دو منٹ پہلے آپ کی بہو نے مجھ سے زندگی کی پہلی فرمائش کی ہے کہتی ہے۔ بہت پیاس لگی ہے کہیں گاڑی روک کر جوس ہی پلا دیں۔“ اس نے مسکرا کر تائی کو آگاہ کیا تو اجیہ کی رکی سانس بحال ہوئی۔

”ہاں تو تھیک کہہ رہی ہے بچی، تمہیں خود سے کچھ خیال آیا نہیں۔ کہیں گاڑی روک کر کچھ کھلاؤ پلاؤ اسے ابھی تو بہت سفر باقی ہے۔“ انہوں نے اجیہ کی حمایت کی کہ غالب نے شوخ مسکرائی، نگاہوں سے اجیہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھپنی جھپنی بڑی دلکش مسکراہٹ پھیلی تھی۔

جس محبت اور مان سے غالب نے اسے اپنی زندگی کا حصہ بنایا تھا وہ اس محبت بھرے ساتھ پر مطمئن اور مسرور تو تھی ہی ساتھ ہی اپنے رب کی بے پناہ شکر گزار بھی تھی۔ بے شک وہ ہی ہے جو مشکل کے ساتھ آسانی عطا کرتا ہے۔ اجیہ نے دل کی گہرائیوں سے ایک بار پھر اپنے پالتار کا شکر ادا کیا تھا۔

☆

”بے فکر رہو سب کچھ سکھا دوں گا۔ محبت کرنا بھی اور کھانا بنانا بھی۔“ وہ اسے محبت سے دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

اجیہ نے ان لمحوں کی خوب صورتی کو دل سے محسوس کیا مرحومہ ماں اس پل شدت سے یاد آئی، مرنے سے پہلے انہوں نے اجیہ کو رب کی رحمت سے باورس نہ ہونے کی تلقین کے ساتھ اس کے شادمان مستقبل کی دعا بھی دی تھی۔

پچھلے والی نشستوں پر براجمان دو شفیق ترین ہستیاں اور ساتھ بیٹھا اس کا شریک سفر ماں کی دعا کی قبولیت نہیں تو اور کیا تھا۔ اس کا رواں رواں رب کی اس بے پایاں عنایت پر اس کا شکر گزار ہو رہا تھا۔

”تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم کئی راتوں سے سو نہیں پائی ہو۔ میرے مذاق کو سیریس مت لو۔ پلیز ریلیکس کرو۔ سونا چاہتی ہو تو سو جاؤ۔ میری اور میری ڈرائیونگ کی ٹینشن مت لو۔“

غالب کو اس کا منی سے وجود کی تھکن کا احساس تھا سواں بار محبت بھرے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

اجیہ نے دھیرے سے مسکرا کر نفی میں گردن ہلائی۔ اظہار صرف شوہر کا فرض اور بیوی کا حق نہیں ہوتا۔ غالب اب غیر نہیں تھا اس کا شریک سفر، اس کا محرم دل و جان تھا اس کا حق تھا کہ وہ بھی محبوب کے دل کی حکایت جان پاتا سو فطری شرم اور گھبراہٹ پر بہت مشکل سے قابو پا کر اس نے دھیرے سے غالب کو بتانا ضروری سمجھا تھا۔

”آپ کا ساتھ اور یہ سفر میری زندگی کا خوب صورت ترین وقت ہے اور میں سو کر ان حسین لمحوں کو کھونا نہیں چاہتی۔“

غالب تو یہ شرمیلیں سا اعتراف سن کر خوشی اور حیرت سے گنگ رہ گیا۔

”میں اگر خوشی کے مارے حواس کھو بیٹھا اور یہ گاڑی ڈگمگائی تو ذمہ دار آپ ہوں گی خاتون۔“

”پھر وہ ہی خاتون۔“ اجیہ کی حلفی بجا تھی۔

”اب اگر دونوں کان بھی پکڑ لیے پھر تو



کریں گی کہ آخر وہ کون سی وجوہات یا حالات ہیں جن کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ اپنے شوہر سے علیحدگی کی خواہش مند ہیں.....؟“
”وہ جی وکیل صاحب! بات دراصل یہ ہے۔“
عورت نے گہری سانس بھری۔

ان کا رویہ (شوہر کی جانب اشارہ کیا) روز بروز ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ہمہ وقت بگڑے بگڑے سے رہتے ہیں۔ اکثر گھر میں لڑائی جھگڑا اور فساد برپا کیے رکھتے ہیں۔ حالانکہ میں تو جی ان کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ تڑکے اٹھ جاتی ہوں۔ ان کے لیے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔ کپڑے استری کر کے غسل خانے میں لٹکا کر آتی ہوں اور جوتے تک پالش کر کے رکھتی ہوں اور میں جی.....“

”ایک منٹ محترمہ! ذرا مختصر بتائیے۔ عدالت کا وقت بہت قیمتی ہے۔“ وکیل صاحب نے ٹوکا۔
”عورتوں کو ذرا لمبی بات کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ آپ محل سے سنیں۔“ جج صاحب نے وکیل صاحب کے اعتراض پر اعتراض کیا تو عورت حوصلہ افزائی پا کر مزید بتانے لگی۔

”وہ جی..... میں کہہ رہی تھی کہ میں صبح دیر سے اٹھ کر ان کے دفتر جانے کی ساری تیاری کرتی ہوں۔ دوپہر میں ان کی پسند کا لچ بناتی ہوں اور شام کو ان کا بستر تیار کرتی ہوں اور ٹھنڈے پانی کا کولران کے سرہانے رکھتی ہوں۔“

”اس کا تو مطلب ہے کہ وہ جنت میں رہ رہے ہیں۔“ وکیل صاحب نے تعجب سے کہا۔
”پھر آخر وہ اس جنت سے نکلنا کیوں چاہتے ہیں.....؟“

”جنت.....“ لفظ جنت پر سامنے کی رو میں بیٹھے شوہر صاحب تڑپ کر کھڑے ہوئے اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔
”آپ تشریف رکھیں اور اپنی باری برسات

فیملی کورٹ میں میاں بیوی کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ دونوں کے مابین ازدواجی لڑائی جھگڑے اتنی شدت اختیار کر گئے تھے کہ مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہ بچی تھی۔ اب فریقین جلد از جلد علیحدگی کے خواہاں تھے۔ اسی سلسلے میں دونوں نے اپنی اپنی درخواست عدالت میں جمع کروا رکھی تھی اور آج ان کی پہلی پیشی تھی۔

اس وقت کمرہ عدالت میں سنہری فریم کا چشمہ لگائے بلیک گاؤن میں ملبوس سوہرے جج صاحب، کالے کوٹوں میں ملبوس وکیل صاحبان، میاں بیوی دونوں خود اور ان کے کچھ عزیز واقارب موجود تھے۔

مقررہ وقت پر سماعت کا آغاز ہوا۔ جج صاحب کی اجازت سے وکیل صاحب نے سب سے پہلے خاتون کو جرح کے لیے کٹہرے میں بلایا۔ وہ اپنی سرمئی چادر کا پلو سنبھالیں، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی تشریف لائیں۔ چہرے پر گہرے سنجیدگی طاری تھی۔ وکیل صاحب اپنی فائل کھولتے ہوئے خاتون کی طرف متوجہ ہوئے۔

”محترمہ! آپ ہیں بیگم الفت جہاں آرا صاحبہ زوجہ احمد دین ولد محمد دین عمر تقریباً.....“

”بائیس سال.....“ عورت نے ترنت جملہ مکمل کیا۔ ایک لمحے کے لیے وکیل صاحب چکرا کر رہ گئے کیونکہ کھلی فائل کے اندر جھانکتے ان کے شناختی کارڈ پر درج تاریخ پیدائش تو کچھ اور کہہ رہی تھی۔ خیر وہ اسے پیشہ ورانہ تجربے کی بنا پر عورت کی مبالغہ آرائی کو ہی سمجھ گئے اور سر جھٹک کر مزید گویا ہوئے۔
”دیکھیں محترمہ! آپ کچھ وضاحت کرنا پسند

ہیں آخر کیوں؟ وجہ۔“

”وکیل صاحب! یہ سراسر الزام ہے اور غلط ہے وہ میرا کوئی خیال نہیں رکھتی۔ آپ کو بھی ان کی باتوں سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مجھ سے زیادہ تو انہیں اپنے موبائل فون سے پیار ہے۔“

”وہ تو سب ہی عورتوں کو ہوتا ہے۔“ وکیل صاحب نے ان کا اعتراض چنگیوں میں اڑایا۔

”مگر وکیل صاحب! وہ ہر وقت اپنی ماں بہن سے باتیں کرتی رہتی ہیں مگر میری ماں بہن کا نمبر بلاک کر رکھا ہے۔“ شوہر کے نتھنے غصے سے پھڑکنے لگے۔

”یہ عورتوں کا آپسی معاملہ ہے۔ آپ خود کو علیحدہ رکھیں۔“ وکیل صاحب نے رسان سے مشورہ دیا۔

”مجھے کبھی اپنے موبائل کا چارجر نہیں ملا۔ یہ استعمال کر کے لاپرواہی سے ادھر ادھر پھینک دیتی ہیں اور میرے موبائل کی بیٹری لو ہوتے ہوتے ڈیڈ ہو

کیجیے گا۔“ جج صاحب نے انہیں ڈپٹا تو وہ اپنی تنجی چند یا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئے۔

”ہاں تو محترمہ! آپ اپنی بات مکمل کیجیے.....“ وکیل صاحب دوبارہ خاتون کی طرف متوجہ ہوئے۔

”وہ جی..... میں سچ کہہ رہی ہوں کہ میں ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہوں مگر یہ ذرا ذرا سی بات پر آپ سے باہر ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر ان کو میرے موبائل سے بڑی پر خاش ہے۔ کئی بار پھینک کر توڑ چکے ہیں۔ ناروے سے بھیانک نیا آئی فون بھیجا تھا۔ ایک دن اس کی بھی اسکرین توڑ دی۔“ اس کے ساتھ ہی عورت کی آواز بھرا گئی اور اس نے ایک سسکاری بھری۔

(اف یہ عورت کے آنسو.....) جج صاحب اور وکیل صاحب دونوں نے بیک وقت شوہر کو ملاتمی نظروں سے گھورا تو وہ اپنی جگہ پر کھسکا کر رہ گئے۔

”میری دوستوں کا فون آئے تو بہت چھیں بہ چھیں ہوتے ہیں۔ چوری چھپے باتیں بھی سن لیتے ہیں۔ اور اپنے یہ کرتوت ہیں کہ انہوں نے شبورانی کے نام سے جعلی اکاؤنٹ بنا رکھا ہے جس پر ہر وقت نامحرم عورتوں سے گپ شپ کرتے پائے جاتے ہیں۔ اگر روکوں تو ہنگامہ مچا دیتے ہیں۔ توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔“ بات کے اختتام پر عورت ہلپھٹک ہلپھٹک کر رونے لگی۔

اس کی جذباتی حالت کے پیش نظر وکیل صاحب نے مزید کچھ پوچھنا مناسب خیال نہ کیا اور انہیں واپس جانے کا اشارہ کیا تو وہ سسکیاں بھرتی ہوئی اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔

اب شوہر کی باری تھی۔ انہیں کٹہرے میں بلا یا گیا۔ وہ تشریف لائے تو وکیل صاحب کی توپوں کا رخ ان کی جانب ہو گیا۔

”جی مسٹر محمد دین! آپ کی زوجہ محترمہ کے بقول وہ آپ کے تمام جملہ حقوق کا خیال رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ گھر میں طوفان برپا کیے رکھتے



لینا چاہتے ہیں۔

عدالت عالیہ کا جو قیمتی وقت ضائع ہوا اس پر سخت شرمندہ ہیں۔ معذرت کے لیے بہ نفس نفیس خود حاضر ہوتے مگر فی الحال سیر و تفریح کے لیے بھور بن چکے ہیں۔

مزید التماس ہے کہ ہم نے جو اپنے اپنے موبائل فونز آپ کے دفتر میں جمع کروائے تھے اب ہمیں ان کی قطعی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم ان کے بغیر بہت خوش و خرم اور سکون سے رہ رہے ہیں۔ آپ انہیں بیچ کر پیسے چندہ بکس میں ڈال دیجیے گا۔

شکریہ۔

منجانب مسٹر اینڈ مسز محمد دین

وکیل صاحب اور جج صاحب نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیزی سے دیکھا اور محض کندھے اچکا کر رہ گئے۔

اتنے میں جج صاحب کے اپنے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ انہوں نے بٹن دبایا۔ ان کی بیگم کا میسج تھا۔ ”ڈائمنڈ جیولرز والوں نے آن لائن سروس کا آغاز کر دیا ہے۔ میں نے شادی کی ساگرہ کے لیے ایک نیکلس پسند کر کے آرڈر بھی دے دیا ہے۔ آپ رقم کا انتظام کر کے آجے گا۔“

نیچے جو رقم لکھی تھی وہ دیکھ کر جج صاحب کا سانس رک گیا۔

اتنے میں وکیل صاحب کے موبائل کی بھی بپ سنائی دی۔ ان کی بھی بیگم کا پیغام تھا۔

”اماں آئی بیٹھی ہیں مگر گیس ندارد۔ آتے ہوئے ایک کلو کڑا ہی اور دو کلو آم لے آنا۔“

وکیل صاحب نے ٹھنڈی آہ بھری۔ جج صاحب سے نظریں چار ہوئیں تو دونوں کے دلوں میں بیک وقت ایک ہی خواہش شدت سے ابھری۔

کاش وہ بھی کچھ دنوں کے لیے اپنا اپنا فون کہیں جمع کروائے۔ اے کاش.....!

☆

جاتی ہے۔“

”بھائی صاحب! یہ تو ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ بہتر ہے کہ آپ دوسرا چارج خرید لیں۔“ ایک اور نادر مشورہ۔

”جب بھی کسی برانڈ پر سیل لگتی ہے تو ان کی دوستوں کا آنا فنا میسج آ جاتا ہے اور یہ فوراً ہنگامی بنیادوں پر شاپنگ کے لیے نکل پڑتی ہیں۔ یوں میری تنخواہ بارہ تاریخ تک اڑن چھو ہو جاتی ہے۔“ اب کے شوہر کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی اور یہ اعتراض خاصا جان دار بھی تھا۔ پہلی بار جج صاحب اور وکیل صاحب کو ان سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

اتنے میں عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج صاحب نے اپنی فائل میں ضروری نکات درج کیے اور اگلی پیشی کے لیے پندرہ تاریخ دے دی۔ ساتھ ہی میاں بیوی دونوں کو تختی سے حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے موبائل فونز دفتر میں جمع کروائیں تاکہ ان کا ڈیٹا چیک کر کے ایک دوسرے پر لگائے گئے الزامات کی جانچ پڑتال کی جاسکے۔ دونوں بہت آنا کافی کے بعد آمادہ ہوئے۔ اس کے بعد عدالت برخواست ہو گئی۔

☆☆☆

15 تاریخ.....

مقررہ تاریخ اور مقررہ وقت پر کمرہ عدالت میں جج صاحب اور وکیل صاحبان موجود تھے۔ سماعت کے لیے میاں بیوی کا انتظار تھا مگر دونوں ہنوز نہ آئے تھے۔ اتنے میں چپراسی ایک براؤن رنگ کا لفافہ لایا اور وکیل صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے کھولا تو اندر سے میاں بیوی کا مشترکہ خط برآمد ہوا، لکھا تھا۔

محترم جج صاحب اور وکیل صاحبان!

مودبانہ گزارش ہے کہ ہمارا کیس خارج کر دیا جائے کیونکہ اب ہم میاں بیوی باہم شیر و شکر ہو چکے ہیں۔ ہمیں ان پندرہ دنوں میں ایک دوسرے سے کوئی گلہ، کوئی شکایت نہیں رہی اور ہم علیحدگی نہیں چاہتے۔ اس سلسلے میں دی گئی اپنی درخواستیں واپس

کرن

ماہنامہ کرن
اکتوبر 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک



✽ یاد "محمود ہائر فیصل"

✽ اداکارہ "کنول خان" سے ملاقات

✽ اداکارہ "زباب رانا" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"

✽ اس ماہ "صائمہ ریاض ہاشمی" کے "مقابل ہے آئینہ"

✽ "دامن سحاب" مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول

✽ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول

✽ "دستور وصل" سنیہ عمیر کا مکمل ناول

✽ "تمکین پانیوں کا سفر" منعم ملک کا مکمل ناول

✽ "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" نازیہ کنول نازی کا ناول

✽ "ہوائے محرم وفا" شبانہ شوکت کا ناول

✽ "آزمائش" ماہم اوزلین کا ناول

✽ قائدہ راجہ، زارا پنجر اور ام اقصیٰ کے افسانے اور مستقل سلسلے

✽ "کرن کتاب"

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزیداریں ریسمینز کے ساتھ

اکتوبر 2021ء کا شمارہ شائع ہو گیا

فرمانہ کھل

دوڑ کے دستِ حیات تک

وہ ایک مری کا بڑا سا بورڈ پڑھ کر اس کی تھکاوٹ پر خوش گواری کا احساس غالب آنے لگا۔ اس..... یہ کیا؟ گاڑی نے بائیں جانب موڑ کاٹا..... سامنے ہی سول کورٹ کا بورڈ اپنے معنی و مفہوم پہ اترتا پر غور سا ایسا دہ تھا۔ گاڑی سڑک پہ آگے رہنے لگی تو بے اختیار ایک دل دہلا دینے والی چیخ کو اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر روکا۔ گاڑی ایک خطرناک موڑ مڑ چکی تھی۔

”اللہ بھائی! یہ موڑ آپ روزانہ مڑتے ہیں؟“ اس کے بے وقوفانہ سوال پہ عادل کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”شکر ہے رمل بی بی بھی کسی چیز سے خوف زدہ تو ہوئیں۔ یہ کوئی موڑ دوڑ نہیں پورا موت کا کنواں ہے۔“

سامنے عدالت کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ ڈھلان کے رخ سڑک پر گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ جسے دیکھتے ہی دو ملازم دوڑے چلے آئے۔ عادل نے اتر کر اس کی طرف دیکھا جو ابھی تک سیٹ پہ براجمان تھی۔

”کیا باہر آنے کا ارادہ نہیں؟“ وہ کھڑکی کی جانب جھکا۔

”تو کیا گاڑی گھر کے اندر نہیں جائے گی۔“ لہجے کے ساتھ اس کے چہرے پہ بھی حیرت نمایاں تھی۔

”یہ گجرات نہیں ہے۔ ہم مری پہنچ چکے ہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ تو چارونا چاراسے اترنا پڑا۔

”عارف! بی بی کا سامان نیچے لے جاؤ“ میں عدالت کا چکر لگا لوں۔“



مُكَمِّل تَاوِل



عادل سامنے عمارت کی طرف گیا تو وہ ملازم کی معیت میں مزید سیڑھیاں اترنے لگی۔ اب اس نے گردو نواح پہ اک نظر ڈالی۔ تین چار سیڑھیوں کے اختتام پر صحن میں مسلسل نمی کی وجہ سے سبز کالی جمی ہوئی تھی۔ اس نے سنبھل کر قدم رکھا کہ مبادا پھسل ہی نہ جائے۔ سامنے بند دروازہ ملازم کی ہلکی سی دستک پہ کھل چکا تھا۔ وہ اندر آئی تو لاؤنج کے دروازے پہ بھا بھی اس کا استقبال کرنے کو کھڑی تھیں۔ وہ بھی انتہائی گرم جوشی سے ان سے گلے ملی اور پھر قریبی صوفے پہ جیسے گرسی گئی۔

”اف! اب پتا، چلا عادل بھائی دن بدن اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہیں۔“ اس نے جیسے دہانی دی تھی۔ ملازمہ نے پانی کا گلاس سامنے کیا جسے وہ فنافٹ چڑھا گئی۔

”بس کھانا لگوائے..... بھوک سے برا حال ہو رہا ہے میں تب تک ذرا گھر کا جائزہ لے لوں۔“ وہ کھڑی ہو گئی تو عفرامسکرا دی۔

اس کی ساس کہتی تھیں کہ پتا نہیں رمل رات کو کیسے سوئی ہے۔ اگر اس کا بس چلے تو گھوڑوں کی طرح کھڑے کھڑے ہی نیند بھی پوری کر لے، وہ ٹک کر بیٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔

”گھر تو کافی بڑا ہے اور اچھا بھی ہے۔“ وہ ہر جگہ دیکھنے کے بعد اسی صوفے پہ ٹک گئی۔

”اب نکلیں گے مری کے کس بل۔“ عادل نے اندر آتے ہی ہانک لگائی تو وہ جیسے جھینپ کر بولی۔

”جی نہیں۔ آپ کا مری مجھ سے بھی زیادہ میٹر ہائیٹ رکھتا ہے۔“ اس نے منہ رگڑ کر کچھ اس انداز سے کہا کہ عادل کے ساتھ اندر آئی عفرام بھی قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

عفرام کا چھٹا مہینہ چل رہا تھا۔ اس لیے اماں نے اس کے اکیلے پن کے خیال سے رمل کو تین چار ماہ کے لیے مری بھیج دیا تھا۔ کھانے کی ٹیبل پہ اپنے پسندیدہ چائیز رائس اور ٹکٹس دیکھ کر اس نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

”اب میں کچھ دیر سوؤں گی پھر اٹھ کر پچھلے صحن میں جائے اسٹھپے پئیں گے۔“ وہ کسل مندی سے کہتی ایک مسکراہٹ ان دونوں کی طرف اچھال کر اپنے لیے منتخب کردہ بیڈروم کی جانب بڑھی۔

”اللہ مری کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ پتا نہیں رمل اس کا کیا حال کرنے والی ہے۔“ عادل کی بڑبڑاہٹ اس نے ان سنی کر دی تھی۔

☆☆☆

”بڑی بات ہے، بھا بھی بھی آئی ہوئی ہیں۔“ شیران نے اسے خوش گواری سے سلام کیا اور باقر کے ناراضی لیے پھولے منہ کی طرف دیکھا۔

”یہ نہ کہہ کہ بھا بھی آئی ہوئی ہیں بلکہ یہ پوچھ کہ یہ محترمہ جانی کب ہیں۔“ وہ جلے بھنے لہجے میں بولا۔

”ابھی خالہ کو بتاتی ہوں۔“ وہ جو گھبراہٹ تو لیہ باہر لگتی پہ پھیلائے آئی تھی فوراً اندر کی جانب پسلی۔

”یہ کام ہر روز بڑی تن دہی سے انجام دیا جاتا ہے۔ ذرا جو پٹری سے اتر کر رومالس جھاڑنے کی کوشش کرو تو خالہ کو چوکیدار اور پھر سے دار کے عہدے پہ فائز کر دیا جاتا ہے۔“ باقر کہیں کا غصہ کہیں نکال رہا تھا۔

شیران کے قہقہے تھم ہی نہیں رہے تھے۔

”تو ایسا کر، رومالس کرنے کی پکی سند کے ساتھ لے آ.....“ اس نے کان میں کھس کر رازداری برتی۔

”لاڈو بیگم کا بھائی انگلینڈ سے آئے گا تو رخصتی ہوگی۔“ ابھی وہ مزید کچھ کہتا کہ وہ پلاسٹک کی میز اٹھائے ان ہی کی طرف چلی آئی۔ شیران بالکل سیدھا ہو بیٹھا۔ اس نے باقر کو نظر انداز کرتے ہوئے میز شیران کے آگے رکھی۔ باقر کی نظریں اسی پہ مرکوز تھیں۔ وہ میز رکھ کر جا چکی تھی۔

”اگر یہ دن کے آٹھ گھنٹے ادھر گزارتی ہے تو..... تو اسے دیکھ دیکھ کر اکتاتا کیوں نہیں۔“

”تیرے اس قدر بے تکے سوال کا جواب انتہائی سیدھا ہے کہ تجھے کسی سے محبت نہیں ہے۔“ چند منٹوں بعد وہ ٹرے میں سموے پکوڑے اور بسکٹ لیے چلی آئی۔ جان بوجھ کر ہر چیز شیران کے سامنے رکھی۔

”دشمنی ہو تو عنبر جیسی پکی والی۔“ باقر نے اس کی چپ پر کاری وار کیا تھا۔

”شیران بھائی! آپ کل مری جا رہے ہیں۔“ وہ اسے مکمل نظر انداز کر کے شیران سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں پکی خبر ہے۔“ وہ چور نظروں سے باقر کو دیکھ کر بولا۔

”جرنلسٹ کچی خبریں نہیں دیتے..... ان سے تو اللہ بچائے۔“ عنبر نے کانوں کو چھوا۔

”ساری دنیا بچ سکتی ہے پر تو ہی پھنسے گی۔“ باقر نے اس کے پاؤں کو بوٹ کی نوک سے دبایا۔

وہ جو شیران کو چائے تھما رہی تھی ایک دم درد سے بلبلائی۔

”اوئی اللہ.....“

”شکر ہے، اس دفعہ خالہ کو بیچ میں نہیں لائی۔“ ان کی محبت بھری نوک جھونک سے شیران کے ذہن پہ چھائی کشاف جیسے دھل گئی تھی۔

”سیٹھ صاحب کو چائے سمو سے پیش کیے جا رہے ہیں اور غریب مگیتزر کے لیے ایک پلیٹ تک نہیں۔“

”خالہ! میں گھر جا رہی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ دوسرے پل وہ دروازہ پار کر گئی۔

”حد ہوئی ہے یار..... تو نے اس کے پاؤں کو زخمی تو نہیں کر دیا۔“ شیران نے اسے ڈانٹا۔

”ہاں، میں تو ظالموں کا سردار ہوں جیسے..... ایک مشہور معروف بزنس مین جہانگیر کا اکلوتا صاحبزادہ اور ایک میری تایا کی معصوم دختر جو میری مگیتزر ہونے کا شرف رکھتی ہے۔ دونوں ہی میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔“ وہ عجیب سی تلملاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

تب ہی باقر کی امی بھی چائے لے کر ان کے پاس چلی آئیں۔

”اتنی دور کیوں جا رہا ہے پترا..... تیری ماں پریشان ہوگی۔“ خالہ نے بڑے سبھاؤ سے نرم لہجے میں اسے روکنا چاہا۔

”خالہ! میں وہاں جا ب کرنے جا رہا ہوں۔ امی کو تو میری مگنی شادی کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں، ان کی نظروں سے دور ہوں گا تو ہو سکتا ہے، ان کا دھیان ہٹ جائے۔“ اس نے اپنی طرف سے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

”مگر تجھے جا ب کی کیا ضرورت ہے۔ تیرے ابا کا کاروبار تو پوری دنیا میں پھیلا ہے۔“ خالہ کسی طور مطمئن نہیں تھیں۔

”مجھے شوق ہے..... میں کچھ ہٹ کے کروں اپنے بل بوتے پہ..... کچھ ماہ ہی سہی، اپنی کمائی کھاؤں۔“ وہ انہیں آسان سے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کسی بے چارے ضرورت مند کا حق مار رہا ہے سالا۔ اپنی کمائی کھانے کی بات کرتا ہے۔“ باقر نے زہر خند گہجے میں کہہ کر نخوت سے سر جھٹکا۔

”کسی کا حق مارا ہے..... تیرا تو نہیں..... تو کیوں تپ رہا ہے۔“ وہ خالہ کی وجہ سے لحاظ کر رہا تھا ورنہ اسے گھری گھری سنا تا۔

”تو جس سے حصہ تیری مگنی کرنا چاہتی ہے وہ تجھے کیوں پسند نہیں۔“ خالہ کی سوئی وہی پھنسی ہوئی تھی۔

”ارے چھوڑیں اماں! یہ امیر لوگوں کے چونچلے ہیں جنہیں ایڈونچر کا نام دے کر ٹائم پاس کیا جاتا ہے۔ یاد کریں ڈیڑھ دو سال پہلے چھ ماہ چیلان میں گزار کر آیا تھا۔ بے چارے امیر لوگ ڈھیروں کے حساب سے پیسہ کہاں خرچ کریں۔“ وہ استہزائیہ ہنسی ہنسا۔

”اچھا بک بک بند کر اور یہ برتن اندر رکھ آ.....“ خالہ نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

شیران اس کا غصہ، تنہا اور تلملانا سمجھ سکتا تھا۔ کل اس کی میمانے باقر کو گھر بلوا کر اس کی اچھی خاصی درگت بنائی تھی۔ مری جانے کے سلسلے میں سارا قصور باقر کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ حالانکہ اس نے مذاق میں ٹیچر کی جا ب کے لیے معلومات دی تھیں اور اسے وہاں ٹیچر بھرتی ہونے کا چیلنج دیا تھا، اگلا تمام مرحلہ اس نے چیلنج قبول کرتے ہوئے خود طے کیا، مگر حصہ آئی نے آوارہ گرد دوست کے طعنے مار مار کر

کرنے والا موضوع تھا۔ وہ گھر کی مکدر فضا سے دامن چھڑا کر کچھ دیر کے لیے ان کی طرف چلا آیا، دوسرا مقصد خالہ سے الوداعی ملاقات بھی تھی۔
 ”اب اجازت دیجیے۔“ وہ ان کے ہاتھ چوم کر کھڑا ہو گیا۔

”جیتے رہو.....“ خالہ نے اس کی پیشانی چوم کر دعائیں دیں۔

”اچھا بھئی صحافی صاحب۔ اپنی بریکنگ نیوز میں یاد رکھنا۔“

”ہاں۔ ہاں ضرور.....“ وہ جھپک کر بولا۔
 ”ولی عہد جہانگیر جھیکا گلی جاتے ہی ایک حسینہ کے عشق میں گرفتار.....“

”تیرے منہ میں لڈو اور گلاب جامن۔“ وہ شوخ سا ہوا۔

”پہلی تنخواہ سے ہی تمہارے لیے مٹھائی آئے گی۔ چلو عشق تو ہوتے ہوتے ہوگا، فی الحال تو مجھے ہی گلے لگا لے۔“ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت عزیز تھے۔

”اپنا خیال رکھنا اور آتے جاتے رہنا ورنہ آنٹی نے جلد ہی تجھے جلال پور جٹاں بھجوا دینا ہے۔ اب فوری شکل کم کر، مجھے اپنی روٹی منگیتے کو بھی منانے جانا ہے۔“ باقر نے اسے گاڑی تک چھوڑنے کا احسان اس کے سر تھوپ کر بہ عجلت واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

ایک ہفتے میں ہی وہ بور ہو چکی تھی اور اسی ایک ہفتے میں اس نے چڑھائی اور اترائی کی تقریباً تمام بستیاں دیکھ لی تھیں۔ اب بھی وہ بوریت سے بچنے کے لیے جھیکا گلی کے بازار چلی آئی۔

”ایسے وقت نہیں کئے گا، یہاں رہنا ہے تو مقامی لوگوں سے راور سم بڑھانا ہوگی۔ تب ہی یہ چار ماہ گزریں گے۔“ اوپر سڑک پہ ڈیوٹی دیتے سپاہیوں کے پاس وہ ٹھنک کر رکی۔ اب وہ بغور ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی اس حرکت پہ انہوں نے جربزسا ہو کر سر اسیسکی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

اسے ادھ موا کر دیا تھا۔
 ”تو تو منسا دودھ پیتا بچہ۔ تجھے الف ب کی سمجھ نہیں..... تیرے سارے کالے چٹے کرتوتوں کا ذمہ دار تو میں ہی ٹھہرا۔“ کل سے وہ پھولے ہوئے غبارے کی طرح کا منہ لیے پھر رہا تھا۔ غصہ تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

جب شیران نے اسکول جانا شروع کیا تھا تب سے وہ باقر کے گھر آ رہا تھا۔ باقر کی والدہ اس کے ڈرائیور کی خالہ تھیں ان کے اسکول کا راستہ یہی تھا۔ اس کا ڈرائیور روزانہ یہاں سے گزرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے یہاں رکتا تھا۔ موسم کے لحاظ سے روزانہ خالہ ان کی خاطر تواضع کرتی تھیں۔ باقر کی باقی برادری بھی قریبی گلیوں میں آباد تھی۔ اس طرح ان کے تمام دکھ سکھ میں شیران بھی شرکت کرتا تھا۔ یعنی وہ دونوں لنگوٹے پار تھے۔

وقت کے ساتھ ان کی دوستی پروان چڑھتی رہی۔ شیران اسٹڈی کے لیے بیرون ملک بھی آتا جاتا رہا۔ باقر ماس کمیونی کیشن کے بعد جرنلسٹ بن گیا۔ شیران ایم بی اے کے بعد اپنا وقت سیر و تفریح میں گزار رہا تھا۔ وہ سیاحت کا شوقین تھا۔ مہینوں گھر سے غائب رہتا۔ آج کل حصہ اس کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں اور وہ رسیاں تڑا کر ایک مرتبہ پھر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

باقر کے گھر زیادہ وقت گزارنے سے اس کی سوچ ماڈرن ازم کا شکار نہیں تھی۔ وہ اندر سے اپنی کلاس سے پیچ نہیں کرتا تھا۔ اس کے مزاج میں باقر کی والدہ کا سادہ انداز ان کا رکھ رکھاؤ اور تربیت کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔

حصہ، باقر سے اس کی دوستی کو ناپسند کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مڈل کلاس لوگوں سے تعلق کے باعث وہ اپنی کلاس سے آؤٹ ہوتا جا رہا ہے۔ اب کلاس کے رہن سہن یہ کھلے عام تنقید کرتا تھا۔ وہ اپنی ماں کو بھی خالہ کی طرح دیکھنا چاہتا سوا کثر اپنی ماں کے لباس پر بھی وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں تنقید کرتا۔ اس کا مری کے ایک اسکول میں نوکری کرنے جانا گھر میں ایک فساد برپا

”تم دونوں سول کورٹ کے گارڈ ہو۔“

”جی۔“ وہ یک زبان ہو کر بولے۔

”اس طرف پہرہ ہے۔ گھر کی دوسری طرف سے چاہے ججز صاحبان کی ٹیلی کو کوئی بھگا کر لے جائے، اس بارے میں بھی نہیں سوچا۔“ وہ ابرو چڑھا کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

”بی بی! ہم یہاں سے ہی فائرنگ شروع کر دیں گے، ہمیں نشانے کی خوب ٹریننگ دی گئی ہے۔ مڈل اسکول کی عمارت سے آگے تک ہماری نظر ہوتی ہے۔“ ان میں سے ایک نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے بڑھک ماری تھی۔

”اور اگر گولی مجرموں کے بجائے اس بے چارے ناک پونچھے ہیڈ ماسٹر کی کھوپڑی میں اتر گئی تو اس کی جوان بیوی ہو جائے گی بیوہ، پھر وہ بے چاری کیا کرے گی، کہاں سے کھائے گی، اس معاملے پر غور و فکر کرو..... کوئی حل نکل آئے تو کل مجھے ضرور بتانا۔“ وہ انہیں ہکا بکا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

سامنے چائے کے ڈھا بے والے کوزور سے سلام کیا۔

”سلام چاچا! کیا حال ہیں۔“ اس نے بوکھلا کر دیکھا کہ چچا ایک پلی پلائی بجی کہاں سے ٹپک پڑی..... بجی کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی ایک دم مؤدب سا ہوا کہ وہ کافی دنوں سے اسے جج صاحب کے ساتھ اگلی سیٹ پہ براجمان دیکھ رہا تھا۔

”سب ٹھیک ہے جی۔“ وہ ہلکی آواز میں منمنایا۔

”بس آج سے آپ میرے کچے والے چاچا.....“ وہ دانت نکال کر خوش دلی سے بولی۔

اس کی خوش اخلاقی کا یہ عالم تھا کہ اگلے کچھ روز میں ڈھا بے والا چاچا..... بھٹے والا ماموں اور نان چنے والا پھپھا کے رشتے پہ فائز ہو چکا تھا اور مل بی بی ابھی بھی بوریت کا راگ الاپ رہی تھیں۔

اسکول ٹائم میں بچوں کا شور وغل سنا تو ریلنگ کے قریب آ گئی۔ بچوں نے تو غور نہیں کیا، مگر ہیڈ ماسٹر صاحب اس کا رخ روشن دیکھ کر خوشی سے جھوم

اٹھے اور اپنے اچھے خاصے لمبے سویٹر کو مزید نیچے کھینچنے لگے۔ ریل نے مسکرا کر آنکھیں پٹپٹا میں۔ مقابل کی باچھیں چر کر کانوں تک آ گئیں، یہ بھی اچھا مشغلہ ہے مگر یہ بے چارہ اس قدر بھاری خوشی تلے دب کر کہیں مر ہی نہ جائے۔

”چلو اس مشغلے پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔“

”اب کیا کیا جائے۔“ قدم بہ قدم چلتی لان کے کونے تک چلی آئی۔

ساتھ والے گھر میں اس کی ہم عمر لڑکی جھولا جھول رہی تھی۔ خوب آنکھیں مسل کر دیکھا، کل تو اور شکل تھی آج اور.....

”ساون کے جھولے پڑے، تم چلے آؤ۔“ انتظار کی سولی پہ چڑھی وہ پاری سی لڑکی پیا کالا حاصل انتظار چھوڑ کر اپنی ہم عمر سگھی کی طرف پھینچی چلی آئی۔ دو تین دن میں وہ کئی سہیلیاں بن چکی تھیں۔ آج پھر ریلنگ کے ساتھ چلی ریل اس سے رازداری سے پوچھ رہی تھی۔

”تمہارا اس ماسٹر سے فیئر تو نہیں چل رہا۔“ دانیہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ وہ ناراض لہجے میں بولی، شرمندگی کے مارے چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”اس بڈھے کھڑوس کو جوتے نہ لگاؤں۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماسٹر کے سر پہ جو کچھ بال بچے ہیں۔ انہیں بھی اکھیڑ کے پھینک دے۔ وہ تھا کہ دو جوان لڑکیوں کو متوجہ دیکھ کر نئی ٹیلی دہنوں کی طرح شرماتا تھا۔

”دانیہ..... اگر یہ اسی طرح مسکراتا ہوا گھر گیا اور گھر جا کر بھی اس کی بے خودی کا یہی عالم رہا تو کل اس کی بیوی نے کھوج لگا کر ہماری چوٹیوں پہ ہاتھ ڈالنے ہیں۔“ ریل کو دانت نکالتے دیکھ کر وہ مزید چڑ گئی تھی۔

جھیر کا گلی کا موسم اس کے مزاج کی طرح جھٹ پٹ سا تھا، ابھی دھوپ ابھی دھند..... ابھی بارش.....

موسم بھی پچھلے دو ہفتوں سے حیرت سے اس لڑکی کو دیکھتا تھا جو پل پل رنگ بدلتے میں اس سے بھی دو چار ہاتھ تو ضرور آگے تھی۔ اسے جنگل میں منگل لگانا

خوب آتا تھا۔ رمل حسن اور جھیکا گلی دونوں نہیں جانتے تھے کہ اس جنگل میں کیا منگل لگنے والا ہے۔

☆☆☆

جب وہ مری پہنچا تو جھیکا گلی میں اتری شام رات کے آئینے میں اپنی آخری شبیہ دیکھ رہی تھی۔ وہاں اس نے ایک مقامی لڑکے سے مڈل اسکول کا راستہ پوچھا۔ اس لڑکے نے سوئڈ بوئڈ ہینڈسم آدمی کو حیرت سے دیکھا۔ بہر حال مکمل جائزے کے بعد وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ایک پتلی سی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

ڈھیلانی راستے کی طرف جاتی پگڈنڈی جہاں ختم ہوتی تھی وہیں سے اسکول کی عمارت شروع ہوتی تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ اسکول سڑک سے دور نہیں تھا۔ دو منزلہ اسکول کے سامنے احاطے کی دوسری جانب رہائش گاہ تھی۔ وہ مقامی لڑکا چوکیدار سے چابی لینے گیا تو بوڑھا چوکیدار بھی نئے ماسٹر صاحب کو سلام کرنے پہنچ گیا۔ شیران نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے چوکیدار کے سلام کا جواب دیا تو وہ بے چارہ خوش ہو کر اسے دعائیں دینے لگا۔

”صاحب! آپ جلال پور جہاں سے آئے ہو.....“ پہلے وہ چونکا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ یہاں اپنی حقیقت بتا کر اپنے ایڈوکیٹر کا مزہ کر کر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو کچھ اطمینان ہوا۔ کافی بہتر حالت تھی۔

کمرے کے ساتھ کونے میں ایک اسٹور تھا، اسٹور کے دروازے کے ساتھ باہر کی جانب ایک چوڑی لکڑی کی سلیپ لگا کر اسے کچن کی شکل دے دی گئی تھی۔ زمین سے چند فٹ اوپر دیوار کے ساتھ ایک پانی کی ٹونٹی بھی تھی جس کے ارد گرد اینٹوں کی سات آٹھ انچ اونچی دیوار بنا کر پانی کی نکاسی کا انتظام کیا گیا تھا۔

کمرے کے دوسرے کونے میں باتھ روم تھا، اس نے ٹونٹی کھولی تو گرم پانی بھی آ رہا تھا۔ کپڑے نکال کر الماری میں رکھ کر پلٹا اور بستر جھاڑ کر شکنیں درست کیں۔ گدا اور کمبل پرانے ضرور تھے مگر صاف ستھرے

تھے۔ کھڑکی کا پردہ بہت پتلا تھا، ایک دو روز میں چنچ کر واؤں گا۔ ایک استری اور اوون کی بھی ضرورت ہے اور چائے کے برتن وغیرہ۔ کل جو چیزیں اسے چاہیے تھیں، وہ انہیں ذہن میں ترتیب دینے لگا۔ وہ کھانے پینے کی کافی چیزیں اسلام آباد سے لے کر آیا تھا۔

”چلو چل کر جھیکا گلی سے چائے کا ایک کپ پیتے ہیں۔“ وہ کمرے سے باہر آیا۔ جون کا مہینہ چل رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بھلی لگ رہی تھی۔ چاند کی پچھلی تاریکی تھیں۔ اندھیرے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ اس نے اسکول سے ملحقہ رہائش گاہ کی جانب نظر دوڑائی۔ اسکول کے احاطے کے گرد کم از کم لوہے کی گرل تو ہونی چاہیے، وہ کمرے کو تالا لگاتے وقت سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

صبح وہ جلدی اٹھ گیا، آج اس کی کلاس کا پہلا دن تھا۔ تیار ہو کر باہر آیا تو چوکیدار اسکول کے کمرے کھول چکا تھا۔ تیس پینتیس سالہ ملازمہ جو صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی، حیرت کے مارے سلام کرنا بھی بھول گئی، بس پوری آنکھیں کھولے نئے ماسٹر صاحب کو دیکھے جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد بچے آنا شروع ہو گئے۔ پرائمری تک کلاسز نیچے جبکہ باقی تینوں اوپر کے کمرے میں ہوتی تھیں۔ وہ پہلی دفعہ گورنمنٹ کا ملازم بن کر گورنمنٹ کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ٹیبل پہ پڑے بوسیدہ سے رجسٹر کو اپنے سامنے کھسکایا اور بطور نئے ہیڈ ماسٹر باقاعدہ اسکول جوائن کرنے کی تاریخ رقم کی۔ پھر بچوں کی حاضری لگائی پڑھانا اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا، مگر الف پڑھانے کا بھی ایک اپنا مزہ تھا۔

اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد وہ صحن میں کھڑا چار اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا اسکول عدالت کی عمارت کے ساتھ تھا۔ عدالتوں کے ساتھ ہی ججز کی رہائش گاہ تھی۔ دونوں گورنمنٹ ادارے تھے مگر اس قدر تضاد..... شیران کا دل اس تفریق پہ کڑھ کر رہ گیا۔

میں چھٹیوں میں صبح نہیں اٹھ سکتی۔“ وہ بغیر حیل و حجت کے بولیں۔

”تو دانیہ انہیں تیار کر دیا کرے گی۔ ہم دونوں ایک ساتھ چھوڑ کر آیا کریں گے۔“ تھوڑے سے تذبذب کے بعد خالہ نے ہاں کر دی۔ اب وہ دانیہ کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”رل! تمہارے ذہن میں ہر چیز کا حل کیسے آ جاتا ہے۔“ دانیہ دو تین ہفتوں میں ہی اس سے متاثر ہو چکی تھی۔

”اب دیکھو، کیسے تم نے خالہ اور عفر ابھابھی کی دوستی بھی کروادی۔ اب وہ دونوں تمام وقت ساتھ گزارتی ہیں اور تم جو ان کا خیال رکھنے آئی ہوئی ہو بقول تمہارے، سارا دن بے فکری سے گھومتی ہو۔“

”تو کیا خیال نہیں رکھتی۔“ بقول تمہارے پہ اسے اچھا خاصا غصہ آ گیا تھا۔

”رات کو سونے سے پہلے دودھ کا گلاس ناشتے میں بوائے انڈہ شام کو دو سیب..... یہ میں انہیں زبردستی کھلاتی ہوں محترمہ! اگر میں یہاں نہ ہوتی تو انہیں یہ سب کون کھلاتا۔ بتاؤ.....“ اس نے آنکھیں دکھا میں تو دانیہ نے نظر چرائی۔

”اچھا یہ چھوڑو..... یہ بتاؤ، کل کس طرح ہیڈ ماسٹر سے ملاقات کرو گی۔“ اس کی بات سن کر دانیہ بے ہوش ہوتے ہوتے نکلی۔

”دفع دور..... میں جاؤں گی ہی نہیں بس.....“ وہ ناراضی کے اظہار پہ اٹھ کر ذرا دور جا بیٹھی۔

”تو ٹھیک ہے پھر دل خراب مت کرنا، اب میں اور وہ ہوں گے اور رقص میں سارا جنگل ہوگا۔“ اس کے بعد ان دونوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کے بل پڑ گئے تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ بچوں کو لے کر اسکول پہنچیں تو گیارہ بج رہے تھے۔ شیران پورڈ پہ کچھ لکھ رہا تھا۔ دروازے کی جانب اس کی پشت تھی۔ دروازہ ہلکے سے بجایا۔

مشین کی کناکٹ سے صاف لگ رہا تھا کہ اوپر لان کی گھاس کافی جا رہی ہے اور نیچے کھڑے شیران کا دل مٹی اور رویت سے اٹے اسکول کے آگس کو دیکھ کر کٹ رہا ہے۔ صبح صفائی سے قبل اس نے احاطے میں رات کو یہاں مٹر گشت کرتے جنگلی کتوں کے نشان جا بجا دیکھے تھے۔ اس وقت وہ تمام خیالات جھٹک کر اوپر تھیرکا گلی کے بازار کی طرف جا رہا تھا۔ اسے آج کچھ ضروری سامان بھی خریدنا تھا۔ خنک اور ٹھنڈی بادلوں سے بھری تھیرکا گلی۔

☆☆☆

دانیہ اپنی خالہ کے پاس گرمیاں گزارنے آئی ہوئی تھی۔ خالہ کے میاں کا ٹرانسفر لاہور ہو چکا تھا، مگر وہ چھٹیاں یہیں گزارنا چاہتی تھیں۔ خالہ کے بچوں نے دانیہ اور رل کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آج بھی ان کا پیدل مال تک جانے کا پروگرام تھا۔ تھوڑی دیر بعد بچے تھک کر بیٹھ گئے تو انہیں مجبوراً وین کا سفر کر کے واپس آنا پڑا۔ اب وہ دونوں سب سے چکی سیڑھی پہ بیٹھی بچوں سے چھٹکارے کے پروگرام بنا رہی تھیں۔

”مجھے تو لگتا ہے، یہ خالو کے نہیں کسی گڑبڑ کے بچے ہیں۔“ دانیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا حشر کر ڈالے۔

رل نے ایک دم کچھ سوچا۔

”ایک کام ہو سکتا ہے۔“ وہ برجوش ہو کر بولی۔

”کیا.....“ دانیہ کے بھی کان کھڑے ہوئے۔

”وہ یہ کہ ان بچوں کا ساتھ والے اسکول میں ایڈمیشن کروا دیتے ہیں۔ کیسا؟“ اس نے اپنے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر اپنے آئیڈیے کی داد وصول کرنا چاہی۔

”ہے تو اچھا پر خالہ نہیں مانیں گی۔ چھٹیاں انجوائے کر رہی ہیں، بارہ بجے تو ان کی صبح ہوئی ہے۔“ وہ مایوس ہو کر بولی۔

”چلو کوشش تو کرتے ہیں۔ جنگ لڑنے سے پہلے ہی ہتھیار نہیں ڈالتے۔“ اس نے ٹھوکا مار کر دانیہ کو اٹھایا۔ کچھ دیر بعد وہ خالہ کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کر رہی تھیں۔

”ہے تو اچھا، چند گھنٹے پڑھ لیا کریں گے، مگر

”لیس کم ان.....“ لکھتے ہوئے بغیر مڑے اس نے بھاری آواز میں کہا۔
”السلام علیکم.....!“ رمل نے پہلے اندر قدم رکھا۔

”وعلیکم السلام.....!“ وہ جواب دے کر بے ساختہ مڑا۔ آنے والیوں کے ہاتھوں کے توتے ’کبوتر‘ چڑیا سب اڑ گئے۔ کہاں وہ مریل سا ہیڈ ماسٹر اور کہاں یہ ہشاش بشاش خوب رو چہرہ چھ فٹ سے لگتا قد۔ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔

”جی فرمائیے؟“ وہ سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہمیں ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملنا ہے۔“ رمل اپنا اعتماد بحال کرتی آگے بڑھی۔

”میں یہاں نیا ہیڈ ماسٹر اپائنٹ ہوا ہوں۔“ اس نے شائستگی سے کہہ کر ہاتھ میں پکڑا چاک ٹیبل پہ رکھا اور انہیں سامنے پڑی کرسیوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتا خود بھی بیٹھ گیا۔ اس انکشاف پر دونوں پری طرح گڑبڑا گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد رمل نے اپنے تختل حواس کو قابو کر کے سامنے بیٹھے ماسٹر صاحب کو سرسری سادیکھا اور گلا کھنکار کر بولی۔

”ہم یہاں ایڈمیشن کروانے کے لیے تشریف لائے ہیں۔“ ماسٹر نے رجسٹر اپنے آگے کھسکایا۔
”نام بتائیں۔“ مہذب لہجے میں پوچھا گیا۔
”رمل اور دانیہ.....“ دانیہ نے بولنے میں عجلت سے کام لیا۔

”جی.....“ سامنے والے نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر سیدھا ہو کر کرسی کی پشت سے سر نکا کر انتہائی شرافت سے بولا۔

”آئی ایم سوری۔ یہاں تعلیم بالغاں نہیں دی جاتی.....“ رمل دانیہ کی عقل پہ فاتحہ پڑھ خود ہی میدان میں اتری۔

”بچوں کے نام..... مشاف..... اور مناف ہیں۔“
”اور بچے کہاں ہیں؟“ اس سوال پہ وہ دونوں بوکھلائیں..... دانیہ ہونفوں کی طرح باہر کی جانب

بھاگی..... رمل اس پرانے بوسیدہ رجسٹر پہ کچھ بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی..... سامنے والے کی نظر اس کی جھلی پلکوں پر پڑی۔ اتنی ہنسی مڑی ہوئی پلکیں اس نے پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔ رمل نے ارتکاز محسوس کیا تو پلکیں اٹھائیں، دوسری جانب فوراً نظروں کا زاویہ بدل لیا گیا۔

”ہتا نہیں دانیہ کہاں رہ گئی.....“ با آواز بلند خیالات کا اظہار کرتی وہ اب کلاس میں موجود بچوں کی جانب متوجہ ہوئی۔

شیران نے پہلی مرتبہ بڑے دھیان کی نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ گول سفید چہرے کے گرد..... لمبی گھٹنگریالی لٹوں کا سپرہ عجب بہار دکھارہا تھا۔ اس کے خوب صورت سفید ہاتھ ٹیبل کی سطح پر متحرک اس کی بے چین طبیعت کا اظہار کر رہے تھے۔

”اللہ رمل! قسم سے اتنی دور سے پکڑ کر لائی ہوں.....“ دانیہ ہانپتے ہوئے کرسی پہ دھپ سے گری اور بچوں کو گردنوں سے پکڑ کر اس کے سامنے کیا۔

اس نے بغور بچوں کو دیکھا۔
”یہ تو خاصے بڑی عمر کے ہیں۔“ انہیں دیکھنے کے بعد وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”خاصے سے کیا مطلب۔“ رمل نے تیوری چڑھائی۔
”اتنے بھی بڑے نہیں ہیں۔“
وہ لڑکی کے انداز پہ بھنایا تھا مگر ضبط کر کے نرمی سے بولا۔

”پہلے کسی اسکول میں پڑھے ہیں؟“
”نہیں جی، پہلی دفعہ اسکول کا منہ دیکھ رہے ہیں۔“ وہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولی۔ ”آپ اپنے بچوں کی اتج بتائیں۔“ وہ اب بھی اس کا بدتمیز لہجہ نظر انداز کر کے اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولا۔

”میرے بچوں سے مطلب؟ میرے بچے.....“ وہ اپنی جانب اشارہ کر کے بولی۔
”دماغ ٹھیک ہے آپ کا..... یہ میرے نہیں ان کے بچے ہیں۔“ غصے سے رمل کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔

”خواہ مخواہ..... میرے کہاں سے ہو گئے۔“
دانیہ نے بوکھلا کر ایک ناپسندیدہ نظر بچوں پہ ڈالی.....

باوجود شدید غصے کے تمام صورت حال خاصی دلچسپ ہو چکی تھی۔ وہ مسکراہٹ دبانے پر مجبور ہو گیا۔

”یہ میری خالہ کے بچے ہیں۔“ اسے دانیہ پھر بھی کچھ معقول لگ رہی تھی۔

”یہ لاہور میں پڑھتے ہیں، اب ہم لوگ چھٹیاں گزارنے مری آئے ہوئے ہیں تو.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنے ساتھ بیٹھی رمل کی طرف دیکھا..... یعنی اب آگے بات تم کرو۔

”بس اب آپ ان کا ایڈمیشن لیں۔“ اس نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی تھی۔

”یہ گورنمنٹ اسکول ہے، یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا.....“ شیران کو بھی غصہ آ گیا۔

”میں نے تو ایک بات کی ہے، حکم کہاں دے رہی ہوں..... بچوں کا بطور مہمان اسٹوڈنٹ ایڈمیشن کریں۔“ وہ ہنوز اپنی بات یہاں ہی روکی ہوئی تھی۔

”یہ پرائیویٹ اسکول نہیں کہ بچے ایک براؤنج سے دوسری میں مائیگریٹ ہو جائیں گے، اب میں ان دو بچوں کو ساری کلاس سے الگ تو نہیں پڑھا سکتا.....“ اپنی طرف سے اس نے انہیں سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

”آپ کی ایجوکیشن کیا ہے؟“ وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر مسکراتی نظروں سے پوچھ رہی تھی۔

”گورنمنٹ نے ملازمت ایجوکیشن کے بل پر ہی دی ہے۔ میں اسکول میں چنے بچنے نہیں آیا.....“

اس نے سیاٹ لہجے میں کہہ کر بچوں کو راز کا بتایا..... منٹوں میں کلاس خالی ہو گئی۔

”میں جانتی ہوں آج کل گورنمنٹ اسکولز میں ایم اے بلکہ ایم فل نیچر لیے جا رہے ہیں پھر آپ

لیکن کے بچوں کو بڑھانے سے کیوں گھبرا رہے ہیں۔“ اچھا تو ان کے بچے لیکن میں پڑھتے ہیں۔“

اب اس نے ذرا غور سے بچوں اور بچیوں کے ساتھ تشریف لائی بی بیوں کا حلیہ ملاحظہ فرمایا۔

”دیکھئے محترمہ! میں آپ سے وضاحت کر چکا ہوں کہ الگ سے میں یہ شوق پورا نہیں کر سکتا۔“ اور

رمل کو ایسی سمجھانے والی نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ورنہ پڑھا تو بی بی میں آپ کو بھی سکتا ہوں..... وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر ذرا سا جڑ ہوئی۔

”آپ ہم گجراتیوں کو نہیں جانتے ماسٹر صاحب! جب ہم کوئی کام کروانے کہیں جاتے ہیں تو جوتے اتار کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر تب ہی پہنتے ہیں جب کام ہو جائے۔“ وہ ذرا آگے کو جھک کر میز پر ہاتھ مار کر بڑے دھانسو لہجے میں بولی۔ اس کے اس اسٹائل پر وہ ششدر رہ گیا۔

”بھائی پلیز، یہ بچے ہمیں گھومنے پھرنے ہی نہیں دیتے۔ ہر وقت ہمارے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ آپ انہیں بس کلاس میں بٹھالیا کریں بھلے الف ب ہی پڑھا دیا کریں۔“ دوسری لڑکی روہاسی ہو کر بولی۔

”اوہ.....“ اس نے ہونٹ سکیڑ کر ان پہ ایک تیکھی نظر ڈالی۔ اب جب کہ سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ چکا تو اس کا چہرہ خود بخود ہی متبسم ہو گیا۔

”بے وقوف..... اسٹوڈنٹ لوگوں کے سامنے اپنے سیکریٹ آؤٹ نہیں کرتے۔“ رمل نے رخ موڑ کر دانیہ کو خوب ڈانٹا۔

اس کی درگت بنانے کے بعد وہ شیران کے بالمقابل سیدھی ہو کر وہ پرانا رجسٹر اس کی طرف کھسکا کر بولی۔

”بچوں کے نام لکھیں.....“

”میں ایڈمیشن صرف ان کی وجہ سے دے رہا ہوں۔“ وہ دانیہ کی طرف انکشت شہادت اٹھا کر بولا۔

رمل نے اس کی تحسینیں نظروں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس نے بال پوائنٹ سے رجسٹر پہ یقیناً کچھ لکھا تھا..... وہ دونوں ایک ساتھ کھڑی ہوئیں..... دانیہ

نے شکریہ ادا کیا..... رمل نے غضب ناک نظروں سے اسے گھورا..... اس کی اس حرکت پہ وہ مسکراہٹ دبا تا لب بھینچ کر رہ گیا۔

”رکیے دانیہ بی بی!“ وہ دروازے تک پہنچی تھیں۔

”بچوں کو بیک سمیت بھیجے گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا کہ اس کا جملہ دانیہ کے سر کے اوپر سے گزر گیا جو

پہلا گھونٹ اس کا حلق تک جلا گیا۔ زیب نے اس کے بے حد خوب صورت وجود کو حسرت سے دیکھا۔
”کیا اس کا بیڈروم کھلا ہے۔“ وہ کپ پہ نظریں مرکوز کیے دھیرے سے بولی تھی۔

”جی میم!“ وہ نظریں پتلی رکھ کر بولی۔
تب ہی اس کے موبائل کی گھنٹی بجی.....
اسکرین پہ زاہد کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس کے دلکش ہونٹوں پہ خوب صورت مسکان ابھری۔ وہ کپ رکھ کر یلکھت کھڑی ہوئی۔

زیب نے اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”اماں کہتی ہے ایسی عورتوں نے جہنم رسید ہونا ہے۔ اللہ نہ کرے جو شیران صاحب کی شادی ان سے ہو۔“ وہ خالی کپ اٹھاتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

دوپہر کو دونوں گھروں میں ملازمہ ہوتی تھی، سو وہ دونوں چھٹی ہونے سے قبل بچے لانے کی ذمہ داری اس پہ تھوپ کر نکل آئیں۔ منہ بولے چچا کو دیکھتے ہی رمل نے دور سے ہاتھ ہلایا۔ پھر بھٹے والے سے دعا سلام کے بعد دو بھٹے خریدے، اب وہ خراماں خراماں مال کی جانب جارہی۔ تھیں پروگرام یہ تھا کہ جہاں تھک گئیں باقی کا سفر لوکل دین پہ کریں گی، کچھ آگے جا کر وہ کھڑی ہو گئیں۔ ایک دین کو اشارے سے روکا اندر دو تین مسافر تھے اگلے ہی پل وہ اندر کود گئیں۔ نشست سنبھال کر ذرا غور کیا تو رمل کے عین سامنے ماسٹر صاحب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ جی بھر کے بد مزہ ہوئی۔

تب ہی موٹر مڑتے ہوئے زور کا جھٹکا لگا۔
”ارے ڈرائیور صاحب! دھیان سے، پیچھے بوریاں نہیں انسان ہیں۔“ آواز سنتے ہی شیران نے جھٹکے سے سر سیدھا کیا۔ عین اسی لمحے رمل نے بھی اسے دیکھا۔ چہرے پہ مکمل اجنبیت کا بورڈ چسپاں تھا۔ وہ بھی سنجیدگی سے باہر جھانکنے لگا البتہ دانیہ نے

اس نے ہلایا ضرور تھا..... رمل نے اس کے طنز کو سمجھ کر اب کی بار محض اس کے بوٹوں کو گھورا تھا..... اور بلا ارادہ شیران نے اس کا چہرہ ہی دیکھا تھا..... کچھ لوگوں کو بات تک کرنے کے میز نہیں ہوتے۔

☆☆☆

شانزہ نے محل نما شیران ولا میں بلند وبالا گیٹ کھلتے ہی گاڑی ذرا آگے ڈرائیوے پہ ہی روک دی تھی کیونکہ اس کے عین سامنے حفصہ آٹنی بھی گاڑی میں ہی تھیں۔ شانزہ اپنی گاڑی سے باہر نکل آئی۔ اسے دیکھتے ہی کھڑکی کا شیشہ نیچے کھسکا تھا۔ حفصہ نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے محبت سے اسے دیکھا۔

”میں بہت جلدی میں ہوں ورنہ کچھ دیر ضرور رکتی..... تم اندر جاؤ، چائے وغیرہ پی کر جانا۔“ ہلکا سا ہاتھ ہلا کر انہوں نے شیشہ چڑھا لیا تھا۔

وہ حفصہ کی بہترین دوست کی بیٹی تھی اور انتہائی خوب صورت مگر شیران اس کے معاملے میں بھی محسوس تھا۔ ان کی چھٹی حس کہتی تھی کہ وہ ٹڈل کلاس لڑکی سے ہی شادی کرے گا، لی ایم ڈبلیو بڑا سا گیٹ پار کر گئی تھی..... شانزہ نے وائپٹ ٹائمیٹ پر پر پل انتہائی شاٹ سیلوئس شرٹ پہنی ہوئی تھی جس میں سے اس کے پیٹ اور کمر کا کچھ حصہ پہلوؤں سے نظر آتا تھا۔

ان کے حد نظر پھیلے ہوئے لان میں رنگ برنگے پھول تازگی اور مسرت لیے جھوم رہے تھے، وہ طویل راہداری عبور کرتی سیدھی لاؤنج میں چلی آئی، زیب شاید کچن میں بھی۔ شانزہ کے آواز دیتے ہی دوڑی چلی آئی۔

”جیسی کافی شیران پیتا ہے سیم وہی ہونی چاہیے۔“ وہ اب شیران کی مخصوص نشست سنبھال چکی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں صرف شیران ہی تھا مگر اس میں کچھ ایسا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر دیوانی سی ہو جاتی تھی۔ زیب نے اس کے سامنے کافی کا کپ رکھا تو وہ اپنے دھیان سے چونکی۔ گرم کافی کا بڑا سا

سائینڈ یہ سنگی بیج پر بیٹھ گیا۔ اس کے موبائل پہ کال آ رہی تھی دوسری جانب باقر تھا۔

”جناب کے مزاج کیسے ہیں؟“ وہ بڑے موڈ میں پوچھ رہا تھا۔

”تم جانتے ہو، میں بڑا ملنگ ٹائپ بندہ ہوں نخرے نہیں کرتا۔ سو مزاج بخیر۔“ اس کا لہجہ بشارت لیے ہوئے تھا۔

”گڈ مین۔“ باقر بھی اسے خراب موڈ میں لانے کے حربے سے واقف تھا..... فقط دو لفظ کہے۔ مگر سننے والا اچھل ہی پڑا۔

”مین سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”جو سمجھ لو۔“ وہ چٹخارہ لے کر بولا۔ ”ابے گھامڑ تو بتیس برس کا ہو چکا ہے۔ اب تو صرف تیرا رشتہ کرواتے وقت ہی ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے پوچھیں گے کہ آپ کو ہمارا لڑکا کیسا لگا؟“ اور اس کی بات سن کر شیران کا قہقہہ فلک شکاف تھا۔

”بس یار۔ آوارہ گردی میں ہی عمر گزر گئی۔“ وہ آہ بھر کر بولا۔ ”کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہو سکا۔“

”اور سنا، وہاں کی حسینائیں کیسی ہیں؟“ اور اس کے سوال پہ جھٹ سے اس نے ہجوم میں کچھ شناسا چہروں کو تلاشا تھا۔

”پتا نہیں۔ فی الحال تو میں سامنے درخت پہ بیٹھے ایک خوب صورت سے طوطے کو دیکھ رہا ہوں۔“ وہ محظوظ انداز میں بولا۔

”مجھے پتا ہے، ایک دن تو بڑا سا پہاڑ کھود کر ٹرک میں بھر کر لائے گا۔ پھر اسے سیدھا بیونی پارلر لے کر جائے گا۔ یہ تیری بھابی ہے۔“

”ہاہاہاہا.....“ شیران ہنستا ہی چلا گیا۔ جبکہ دوسری جانب لائن کٹ چکی تھی۔

شام نے اس کی ہنسی کے جلت رنگ اپنی مٹھیوں میں نرم پھوار کی طرح بھر لیے تھے۔

”آج کھانا کھا کر ہی واپسی ہوگی.....“ اس نے سیل فون پینٹ کی جیب میں ٹھونسا۔ اور اب اس کا رخ پیچھے کی طرف تھا۔

سلام میں پہل کی جس کا جواب مبہم سی مسکراہٹ سے دیا گیا۔

”سر! بچے ٹھیک طرح پڑھتے ہیں۔“ دانیہ نے سوچا، ملاقات ہو ہی گئی ہے تو معلوم کر لوں۔

”جی۔“ جواب مختصر آیا.....

فیروز سی سوٹ میں رمل کا رنگ خوب دمک رہا تھا۔ شیران نے اس کے پاؤں پہ نگاہ ٹکائی، اتنا کم فاصلہ بیچ میں تھا..... وہ آئے آئے تھے۔ نیچی نگاہیں پیر ہی دیکھ سکتی تھیں، دو تین مسافرا ترے، ان کی جگہ دو عورتیں سوار ہوئیں۔ وہ دونوں با آواز بلند خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔

وین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ پہلے وہ دونوں خواتین اتریں۔ پھر دانیہ بھی اتر گئی۔ مگر وہ بس سے مس نہ ہوئی۔ شیران سمجھ گیا کہ وہ اس کے سامنے آڑی تر چھی ہو کر اترنا نہیں چاہتی سوا ایک ہی جست میں وہ باہر تھا۔ رمل نے اتر کر ادھر ادھر دیکھا۔ شکر ہے وہ نظر نہیں آیا۔

”کیا ضرورت تھی اندر سے بات کرنے کی۔“ اب وہ دانیہ کی کلاس لے رہی تھی۔

”بس کر لی بات۔ اب چھوڑ دو بھی۔ پیچھے پڑ جاتی ہو.....“ پھر بھی رمل ناراض، ناراض سی اس سے آگے ہی چلتی رہی۔ آج مال پہ بے تحاشا شرس تھا۔

”پیچھے دیکھو۔“

”کیوں بھئی۔ پیچھے کیا فواد خان ہے یا پیر کامل کا سالار سکندر ہے۔“ وہ اونچی آواز میں بولی جو پیچھے والے نے با آسانی سن لیا۔

”ہمارے پیچھے ہیڈ ماسٹر ہے۔“ دانیہ دوبارہ اس کے کان میں ہنسی۔

”اچھا.....“ اس نے اچھ..... آ کو کافی لمبا کیا۔

”ہم ایسے مڈل کلاس ماسٹروں کو مڑ کر نہیں دیکھتے۔“

ایک تقاضا سے کہا گیا۔

شیران نے اس کی پشت پہ بکھری گھنگھریالی لٹوں کو بڑی توجہ سے دیکھا۔ اور کئی لمبے ڈگ بھرتا ان سے آگے چلنے لگا۔ کچھ آگے جا کر وہ سڑک کی

”اچھا اچھا تو نے میری پگ کو کلف تو لگوادی تھی نا۔“ وہ بیوی کے ناراض چہرے سے نظر ہٹا کر بولے اور پاؤں میں چپل اڑی۔ ”میں ذرا نہالوں اور تاجی پتر! گل سن۔“

”جی بھاجی!“ دوسرے لمحے وہ سامنے تھی۔ سب نوکر چا کر انہیں صاحب کے بجائے بھاجی کہہ کر بلاتے تھے۔

”وہ برتن باہر بھیجنا جو رمل اس دن خرید کر لائی تھی.....“ تاجی کے دانت نکلے۔ کٹے میوے ابھی تک اس کی مٹھی میں تھے۔

”تو ذرا مجھے منہ کھول کے دکھا.....“ وہ بے بے! میں تو زردے پہ چھڑکاؤ.....“ وہ اٹنے قدموں بھاگی۔

”ایک تو غضب کی گرمی اوپر سے چیز ٹرکی دہائی، میرا تو سر دکھ رہا ہے۔“ ابھی وہ لیٹی ہی تھیں کہ دور سے ہانک لگاتا خوش لباس ہانپتا کانپتا اندر آیا.....

”بھاجی کدھر ہیں؟“ وہ تاجی کے پاس ہی رک گیا کیونکہ جن نظروں سے بے بے نے اسے دیکھا تھا آگے ایک قدم بڑھانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ”ادھر آ.....“ میں بتاتی ہوں تیرے بھاجی کدھر ہیں؟“ تب ہی تو لیے سے سر گرڑتے نواز حسن ان کے قریب چلے آئے۔ اونچے لمبے، مضبوط کاٹھی کے مالک، مردانہ وجاہت سے بھرپور نواز حسن آج بھی زرین کی دھڑکنوں میں بستے تھے۔ انہوں نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

”اوائے خوش لباس۔ ذرا جلدی سے اندر سے میرا کھسہ لے آ.....“

”بھاجی مخالف پارٹی دھاکی گیٹ تک آ چکی ہے۔“ وہ ان کے پاس سے گزرتا کھسر پھسر کرتا بے بے کو کن اکھیوں سے دیکھتا اندر کی طرف بھاگا۔

اب نواز حسن بیوی کی طرف گھومے۔ ”سب کچھ اپنی نگرانی میں باہر بھجوانا۔ ہر دفعہ یہ سب میری دھی کرتی تھی، اس کو بھی تم نے مری بھجوا

گجرات قدیم اور جدید امتزاج سے مزین نرم گداز جذبوں کا امین۔ یہاں مٹی کے خوب صورت پرتلوں کے تحفے مہمانوں کی دلچسپی کا عنصر رکھتے ہیں۔ گجراتی اپنے رسم و رواج پہ مرنے والے لوگ، غیرت اور محبت یہاں کا خاصہ جی ہاں گجرات سوتی کی سرزمین۔ چناب کی پھری لہریں ابھی تک شکوہ کنال نظروں سے انہیں دیکھتی ہیں۔ کچے گھرے بنانے والوں کا کنالوں تک آنا ممنوع قرار دیا جا چکا ہے۔ یہ دریائے چناب کا فیصلہ ہے، مٹی تو ٹھکنے والی شے ہے، پتی بھی ہو تو ٹوٹ جاتی ہے۔ بے وفائی مٹی کی سرشت میں ہے، پار اترنے کے لیے گھڑوں کے سہاروں کا دوراب گزر چکا ہے۔

وڈی حویلی میں صبح کے گیارہ کا ٹائم ہے..... نواز حسن..... سر..... داڑھی اور مونچھوں پر کلر لگا کر سامنے شیشہ رکھ کر بیٹھے ہیں۔ اس حویلی کی مالکن اور نواز حسن کے دل کی ملکہ زرین نواز..... جنہیں یہاں کے نوکر چا کر اور کم عمر رشتے دار بڑی بے بے کہہ کر بلاتے ہیں..... آج انتہائی خراب موڈ کے ساتھ..... آتے چلتے نواز حسن پر ایک کڑی تنقیدی نظر ڈالنا ضروری سمجھتی تھیں۔

”تاجی! دیسی مرغ کے سالن میں ثابت گرم مسالا یاد سے ڈالنا..... اور زردے پہ دم دینے سے پہلے کٹے میووں کا چھڑکاؤ کرنا نہ بھولنا۔“ اتنا کہہ کر وہ شوہر کے سامنے صحن میں بچھے رنگیں پلنگ پہ ٹک گئیں۔

نواز حسن نے شیشے سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ ”ابھی تک تیرا غصہ نہیں اترتا۔ تیری ناراضی میرے شوق کا ایک دن بھی مجھے خوشی سے نہیں گزارنے دیتی۔“

”میں کون سا تمہاری خوشی کے دن کے آگے روڑے اٹکا کے بیٹھی ہوں۔“ بے بے نے تاجی پہ نظر رکھی ہوئی تھی جو چھپا کے کٹے ہوئے میوے منہ میں ڈال لیتی تھی۔

تھا۔

”عادل خوب سمجھتا ہے ان باتوں کو اور میری دھی بہت نڈر اور دلیر ہے۔ اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔ تو فکر نہ کر بلکہ باہر جا، تیرے گلڑکی لڑائی بھی شروع ہونے والی ہوگی۔“ بے بے کے یاد دلانے پر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ زرین نے جاتے ہوئے اکبر کو ناگواری سے دیکھا۔

انہیں شوہر کے کتوں اور مرغیوں کی لڑائی کے شوق پسند نہیں تھے۔ وہ بڑھی لکھی تھیں اور نواز حسن نے صرف آٹھ جماعتیں بمشکل پاس کی تھیں، اکبر میں سارے شوق اپنے تایا جیسے تھے، وہ رمل کو ایک اور زرین نہیں بنانا چاہتی تھیں۔

☆☆☆☆☆

آج کا دن رمل پہ بھی بھاری تھا۔ اس کا دھیان تو گجرات میں اٹکا تھا۔ عادل نے اس کے کھوئے کھوئے انداز کو معنی خیزی سے دیکھا اور پھر پوچھ بھی لیا۔

”کیا ہوا مری کے سارے بھوت بھاگ گئے ہیں جو اتنی اداس ہو۔“ اس نے منہ بسورا اور پھر آہستگی سے بولی۔

”آج بے بے اور بھاجی کی زبردست لڑائی ہوئی ہوگی۔“ لوگوں کی سنا سنی ان کے بچے بھی انہیں ان ہی ناموں سے پکارتے تھے۔

”فکر مت کرو۔ شام کو دونوں شیر و شکر ہوں گے..... ایا کو منانے کے بڑے فن آتے ہیں۔“ ”واقعی۔“ عفرانے شرارتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

”پہلے ناراض کرنا پھر منانا تو آج پتا چلا کہ فن بھی خاندانی ہوتے ہیں جو سل درسل سکھائے جاتے ہیں.....“ عادل نے اس کی بات کا خوب لطف لیا۔

”اماں اور ایا کی محبت بھی مثالی ہے جو بقول تمہارے نسل درسل منتقل ہوگی۔“ وہ فی وی چینلو سرچ کرتا اسے بہت بڑی بات جتا گیا تھا۔ عفرانے خفیف سا ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بڑی لگن کے ساتھ اسے

دیا۔ بیٹا! اور بہو تو خوش ہو گئے، شوہر کا کیا ہے۔“ اب وہ کھسہ پہن رہے تھے۔

”مجھ سے کبھی خوش نہ ہونا۔“ وہ شکوہ کرتی اٹھ بیٹھیں۔

وہ برآمدے میں لگے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر کنگھا کر رہے تھے۔

”او تو میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جاذرا ڈیرے کی خیر خبر لے۔“ بھی ڈھول پٹاخوں کی آواز قریب آنے لگی۔ بے بے نے نک سک سے تیار شوہر کو زہریلی نظروں سے گھورا۔

”پہناؤ دیکھو جیسے ڈیرے پہ نہیں قومی اسمبلی میں جا رہے ہوں۔“

”اپنی زبان نہ بند رکھنا پتا نہیں کہاں سے تیز کرواتی رہتی ہے۔“ انہیں بیوی کا تبصرہ پسند نہیں آیا تھا وہ تو نکل گئے مگر زرین کے غصے کو ہوا دے گئے۔

تب ہی باہر سے نواز حسن کا بھتیجا اکبر چلا آیا ”سلام بے بے۔“ بے بے نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ تاجی اندر سے مہنگی والی کرسی لے آئی۔ اکبر نے موچکھوں کو تاد دے کر تاجی کا سرخ دکھتا چہرہ دیکھا۔

”عادل آج بھی نہیں آیا۔“ انتہائی حیرت کا اظہار کیا گیا۔

”کیوں آج صبح کا گجرات پہ اتر آیا ہے۔“ جواب تنک کر دیا گیا۔ سوال کرنے والا بجل سا ہو گیا۔ اصل تلاش تو اسے رمل کی تھی، وہ بند دروازوں کے پیچھے خواہ مخواہ جھانک رہا تھا..... بالآخر پوچھ ہی لیا۔

”وہ تو ایک مہینہ ہو گیا، مری گئی ہوئی ہے۔“ بے بے نے مسکراتے لبوں سے جواب دیا۔ اکبر کا ماتھا چڑھا۔

”گھر کے ساتھ تو عدالتیں ہیں۔ ہزار طرح کے مردوں کا آنا جانا رہتا ہوگا، عورتوں کے وہاں رہنے کی کوئی تک نہتی ہے بھلا۔“ اس کا غصیلا لہجہ بے کے صبح سے جلتے دل پہ ٹھنڈی پھواریں برسا رہا

اونچی آواز میں بولا۔ اس بے ایمانی پہ رمل جیسے چیل کی طرح اڑ کر ان کی طرف جھپٹی اور آن کی آن میں جیب کے آگے کھڑی ہو گئی۔

”میسے دیے بنا آپ جا کر تو دکھائیں۔“ وہ انہیں للکار کر بولی۔ یہ پجوشن ان کے لیے غیر متوقع تھی۔ جیب رک گئی ان میں سے دو تین نیچے بھی اتر آئے اور رمل کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔

”اور اگر ہم انکار کر دیں تو۔“ وہ بھی اس دھان پان سی لڑکی کو تنگ کرنے کے موڈ میں آ گئے۔

”تو جیب ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔ وہاں جھگڑا شروع ہوتا دیکھ کر کافی آدمی اکٹھے ہو چکے تھے۔ شیران بھی باہر نکل آیا اور گنگ سا کھڑا یہ منظر دیکھنے لگا۔

”قاسم! جیب اشارت کرو۔“ ان تینوں میں سے ایک رمل کو نظروں کے نشانے میں رکھ کر ضدی اور اکھڑے لہجے میں گویا ہوا۔ قاسم نامی لڑکے نے جیب اشارت کر دی تھی۔

”بھائی! تم لوگ جاؤ، مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔“ بھٹے والے نے معاملہ بگڑتا دیکھ کر رمل کی طرف بھی انتہائی نظروں سے دیکھا۔

”آپ کی محنت کی کمائی ہے، کیسے نہیں چاہئیں۔“ وہ تیزی سے کہتی اسے بھی آنکھیں دکھانے لگی۔ دانیہ بھاگ کر سول کورٹ کے گارڈز کی طرف گئی جو لڑکا زیادہ اچھل رہا تھا۔ وہی اتر کر رمل کی طرف بڑھا۔ صورت حال بھانپتے ہی شیران کے قدموں نے بھی تیزی دکھائی۔

”آپ سامنے سے نہیں گی کہ اٹھا کر ہٹاؤں۔“ اس لڑکے کا مذاق اڑاتا لہجہ رمل کو مزید سلگا گیا۔

”ہاتھ بڑھا کر دکھاؤ، لگانا تو دور کی بات ہے۔“ وہ تنٹاتے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولی تھی۔ لڑکے کا بھی دماغ اس کے سکون پہ گھوم گیا۔ اس نے رمل کی کلائی کو تھامنا چاہا۔ شیران نے ایک جھٹکے سے

دیکھ رہا تھا، وہ سر جھکا کر مسکرا دی۔

عادل نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ عفر ا لاہور کی رہنے والی تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ لاہور میں رہنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ ڈیمانڈ بھی عادل نے پوری کر دی تھی۔ اس کے ساس، سر بہت اچھے دل کے تھے بس گفتگو عجیب انداز میں کرتے تھے رمل نے بھی ماں باپ سے جہاں خوب صورت نین نقش چرائے تھے وہیں ان کا گفتگو اسٹائل بھی چرایا تھا۔

عفر ابھی پیار سے اسے ٹوکتی تو اکثر اس کے پٹاخہ ٹائپ لب و لہجہ یہ چپ بھی کر جاتی۔ بھائی اور بھائی کی محبت بھری باتیں اس کا موڈ خوش گوار کر گئیں۔ وہ باہر نکل آئی۔

گینڈی پہ اوپر کی جانب چڑھتے شیران کی نظر اس پر پڑی۔ اب وہ ششدر سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ عادل سے واقف تھا تو کیا یہ اس کی کوئی رشتہ دار ہے تب ہی رمل نے بھی اسے دیکھا اور پوری ڈھٹائی سے وہیں جمی رہی۔

راستہ لان کے کونے کے قریب سے مڑتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پاس سے گزر کر بنا اس کی طرف دیکھے آگے بڑھ گیا۔

”چلو اچھا ہے، اسے علم تو ہوا کہ بچے کہاں سے آتے ہیں۔“

☆☆☆

سڑک پہ آتے ہی حسب معمول وہ دانیہ کے ساتھ پہلے بھٹے والے چاچا کے سر پہ پہنچی۔ وہاں خاصا رش تھا۔ بڑی سی جیب میں بیٹھے پانچ چھ لڑکوں کے آرڈر پہ بھٹے بھونے جارہے تھے۔ وہ ذرا سا آگے بڑھی، نان چنے والے ماموں کو پر جوش سا سلام کیا۔ ہوٹل کے اندر نان چنے کھاتا شیران اس کی آواز سن کر بھونچکا رہ گیا۔ جیب والوں کے بھٹے تیار ہو چکے تھے۔ وہ ان دونوں کو بھی مسلسل دیکھ رہے تھے مگر دوسری طرف پرواہ کیسے تھی۔ بھٹے وصول کرتے ہی جیب جو پہلے اشارت تھی آگے کو بڑھی۔

”ارے رکو بچو! پیسے تو دیتے جاؤ۔“ وہ ذرا

اس لڑکے کو کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔
”تمہیں کسی نے عورت سے بات کرنے کی تمیز
نہیں سکھائی۔“ اس کا لہجہ انتہائی سرد اور خشک تھا۔
ابھی اس لڑکے کا منہ کھلا ہی تھا کہ ان کے پاس مسلح
گارڈ پہنچ چکے تھے۔ ایک گارڈ نے لڑکے کے منہ پر
زنائے کا پتھر مارا۔

”ایڈیشنل جج صاحب کی بہن سے بدتمیزی
کرنے کی سزا جانتے ہو۔۔۔۔۔“ گارڈ کی بات سن کر ان
کی شکلوں پہ بارہ بج گئے اور آنکھوں میں خیر اتر آیا۔
”بابا کے پیسے دو اور اپنی شکلیں گم کرو۔“ وہ اکھڑ
لہجے میں کہتی جیب کے سامنے سے ہٹ گئی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ بی بی جی! ان کو تھانے
لے چلتے ہیں۔“ ان کی جیب کے گرد گھیرا ڈالے
گارڈ زیوں بلبلائے تھے جیسے بی بی کی ذہنی حالت پہ
شک کر رہے ہوں۔

”نہیں، ہمارا ان سے ذاتی کوئی جھگڑا نہیں،
انہیں جانے دو۔ امید کرتی ہوں، آئندہ کسی غریب کا
حق نہیں ماریں گے۔ چلو دانیہ!“ اس نے اس
چھوٹے سے مجمع پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ شیران کے
چہرے پہ پل بھر کو اس کی نظریں رکی تھیں۔ وہ اب
پیچھے ہٹ چکا تھا اور کافی دور کھڑا تھا۔

اب وہاں بیٹھ کر چائے پینا محال لگنے لگا۔ وہ
مال کی طرف جانے والے راستے پہ ہولیا۔ کچھ دیر بعد
وہ ایک لوکل وین میں سفر کر رہا تھا کیونکہ بارش شروع
ہو چکی تھی۔ اترنے کے بعد وہ کسی محفوظ جگہ پہنچتے پہنچتے
بھی خاصا بھیگ گیا۔ جی پی او چوک سے کچھ آگے موڑ
میڑتے ہی ایک چائے کا ڈھابہ تھا اندر بیٹھنے کی جگہ بھی
تھی۔ اس نے وہیں سے چائے پینے کا ارادہ کیا اور
جیسے ہی اندر قدم رکھے سامنے بیٹھی قہقہے بکھیرنی ان
دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔

وہ اب پیچھے ہٹنے کے موڑ میں نہیں تھا۔ آگے کی
جانب بڑھا اور ایک خالی کرسی پہ بیٹھ گیا، پہلے بالوں
سے پانی جھاڑا پھر جیب سے موبائل نکال کر چیک
کیا۔

”شکر ہے، بھیگا نہیں۔“ وہ کچھ پرسکون ہوا۔
باہر اندھیرا چھا چکا تھا۔ بارش ایک بار پھر ہونے
لگی اور اس قدر موسلا دھار تھی کہ باہر کچھ بھی نظر نہیں آ
رہا تھا۔ اب ان کے چہروں سے اطمینان رخصت
ہونے لگا۔

وہ بار بار نمبر ملاتی مگر سگنل نہیں آ رہے تھے۔
دانیہ کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا۔

وہ کرسی پیچھے دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک دانیہ
نے بھی اپنی نشست چھوڑی اور شیران کے پیچھے
بھاگی۔

”آپ رکیں، ہمیں بھی ساتھ جانا ہے۔“ رمل
نے دانیہ کی اس حرکت پہ جیسے اپنا سر پٹا تھا اور قریب آ
کر نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چلو آؤ۔“ اب وہ اس کو گھسیٹتے ہوئے لے جا
رہی تھی۔

”مگر ہم اکیلے خراب موسم میں کیسے جائیں
گے۔“

”اکیلے کہاں۔ ہم دو ہیں۔“ وہ دانیہ کو کچا
چبانے کے موڑ میں تھی۔

”مگر ہم تو لڑکیاں ہیں۔“
”اس نئی اطلاع کے لیے بہت بہت شکر یہ۔“

اور وہ جوان کے پیچھے ہی تھا، سر جھٹک کر ہنس دیا۔
”مم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ہم دو اکیلی
لڑکیاں۔“ وہ شدید پریشانی کے عالم میں حواس باختہ
ہو رہی تھی۔

”اوہو۔۔۔۔۔ دانیہ تو وین والا کیا گدھا ہوگا۔۔۔۔۔“
”بارش دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ ایسے میں
راستے نظر نہیں آتے چاہے وہ ہمیں کہیں کا کہیں لے
کر چلا جائے۔“ دانیہ کے خدشات اپنی جگہ درست
تھے۔

”ارے بھائی، وہ ہمیں کیوں کہیں کا کہیں لے
جائے۔ دیکھنا وین منٹوں میں فل ہو جائے گی۔
“بہر حال کچھ نہ کچھ سلی تو اسے دینا ہی تھی۔
پھر وہ ذرا سا ہنسی۔

سکتی۔“ وہ کچھ جتانے والے انداز میں بولی۔ بارش کی تیز بو چھاڑ ایک بار پھر انہیں بھگو گئی۔

”جھیر کا گلی، جھیر کا گلی.....“ وین والا چلا رہا تھا، سب سے پہلے وہ دونوں اندر گھسیں اور ان کے بعد دو خواتین جن کے پاس چار بچے تھے۔ اس نے ایک رمل کی گود میں ٹھونس دیا..... وین میں بچوں کی سریلی آوازیں سر بکھیرنے لگیں۔

”ارے کسی کے پاس موبائل ہے تو لائٹ جلا دو، بچے اندھیرے سے گھبرا کر ڈر رہے ہیں۔“ اور شیران نے موبائل کی لائٹ جلا دی۔

”آپ اپنے بچے کو تو پکڑیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ایک تو اس نے ہاتھ پیچھے موڑ کر ڈنڈا پکڑا ہوا تھا دوسرے ہاتھ سے بچے کو پکڑنے میں ناکام ہو رہی تھی جو بار بار نیچے پھسل جاتا۔

”کیا ضرورت تھی بچوں کے ساتھ خراب موسم میں آنے کی۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”تم تو جیسے خراب موسم میں اپنے ابا کے گھر میں بیٹھی ہو.....“ وہ بھی جلی بھی بیٹھی تھی۔ وین میں موجود تمام مسافروں کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ رمل کی بے بسی اسے مزہ دے رہی تھی اور وہ جان بوجھ کر کھل کے مسکرا رہا تھا۔

”آپ کا بچہ ابھی نیچے گر جائے تو مجھے کچھ مت کہنا۔“ وہ اپنے سابقہ لہجے ہی میں بولی۔

”بڑی تیز طبیعت ہے تیری۔ دو گھڑی صبر نہیں ہوتا، اپنے شوہر کو پکڑا دے احسان ہوگا۔“ اس عورت نے شیران کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”ہیں ہیں.....“ وہ تڑخ کر بولی۔ ”یہ کس کو کہہ رہی ہیں آپ۔“

”یہ جو میرے سامنے بیٹھا ہے۔“ شیران یوں بیٹھا تھا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو، ابھی کچھ دیر پہلے بے چارے پہ خوب گرج چمک رہی تھی۔

”وہ تو میں.....“ اتنا کہہ کر وہ فوراً چپ کر گئی۔ نظروں کے تصادم پہ ایک کی آنکھوں میں قہر برس رہا تھا۔ دوسرے کی آنکھوں میں زچ کر دینے

”اتنی مہنگائی میں وہ گھر والوں کو ہی بھگت لے تو بڑی بات ہے۔ دانیہ! ہمیں پتا نہیں کس بات کی خوش فہمی ہے۔“

اچانک وہ چھینکا۔ وہ دونوں رک گئیں، مڑ کے دیکھنے میں پہل رمل نے کی تھی۔ دوسرے ہی پل وہ پوری کی پوری اس کی طرف گھومی۔

”آپ چارے پیچھے کیوں آرہے ہیں.....؟“ ابرو چڑھا کر کڑھکی سے پوچھا گیا۔

وہ بھی ٹھہر گیا۔ بولا تو کھل سے تھا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی لہجہ سخت ہو گیا۔

”واپسی کے لیے مجھے بھی اسی راستے سے جانا ہے جس پہ آپ جا رہی ہیں۔“

شرمندگی اور خفت مٹانے کے لیے دن کا واقعہ یاد آیا بلکہ ضرورتاً یاد کیا گیا۔

”پہ تائیں، میرے معاملے میں پڑنے کی اور ہیر و بننے کی کیا ضرورت تھی۔“ بڑا لٹھ مار لہجہ تھا۔

”جب آپ سڑکوں پہ ہیر و بنیوں جیسے کام کریں گی تو کسی نہ کسی کو تو ہیر و بن کر میدان میں کودنا ہی پڑے گا۔“ لہجہ میں طنز سے زیادہ شرارت تھی.....

”ہیر و بن سے کیا مراد ہے آپ کی، میں وہاں درختوں کے آگے پیچھے بھاگ بھاگ کر گانا نہیں گا رہی تھی۔“ وہ ٹیلے لہجے میں بولی۔

”رمل اب چلو بھی، دیکھو بجلی کیسے چمک رہی ہے۔“

”اف تو بہ! دیکھ رہی ہوں بزدل چوڑی۔“ وہ پھر جیسے ایڑیوں پر گھومی تھی۔ شیران نے تیوریاں چڑھا کر اس پہ سوالیہ نظر ڈالی۔

”آئندہ میرے معاملے میں ہیر و..... میرا مطلب ہے ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔“ آخر میں اس نے اپنے لہجے کو کچھ نارمل کیا۔

”تو کیا آپ آئندہ بھی اس قسم کے پروگرام سیٹ کر کے بیٹھی ہیں۔“ جواب بڑے محظوظ لہجے میں دیا گیا۔

”میں غریبوں کی حق تلفی برداشت نہیں کر

والی مسکراہٹ تھی۔ منہ بگاڑ کر دانیہ کی طرف دیکھا۔ وہ بے چاری بھی ایک رو ہانسو بچے کو سنبھالتے ہوئے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔
”تو یہ ہے جو آئندہ کسی وین میں سفر کروں۔“
وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی۔

☆☆☆

”شیران شکوہ کر رہا تھا کہ پاپا سے بات ہی نہیں ہو پاتی۔ خیریت پوچھ کر ہی فون بند کر دیتے ہیں۔“
حفصہ نروٹھے انداز میں کہتے ہوئے ہاتھوں کا مساج کر رہی تھیں۔ وہ جو آج بڑے عرصے بعد مطالعہ کر رہے تھے بڑے گم سے انداز میں محض ہوں کہنے پہ اکتفا کیا۔

”ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ آپ کو اسے ٹائم دینا چاہیے۔ تفصیل سے حال احوال پوچھنا چاہیے۔“
بالآخر انہوں نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور رخ موڑ کر بیوی کے خوب صورت چہرے کو غور سے دیکھا پھر بڑے ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔
”ہم بھی آپ کے اکلوتے شوہر ہیں۔ ہمارے لیے تو آپ نے کبھی خصوصی ٹائم نہیں نکالا۔“
”جد کرتے ہیں آپ بھی..... میں کس کی بات کر رہی تھی اور آپ گھما پھرا کر مجھ پر لے آئے ہیں۔“

وہ ان کے نرم و ملائم سنہری بالوں کو چھو کر مدہم لہجے میں بولے۔

”کوئی بھی بات جو آپ کے منہ سے سنوں میرے لیے زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے اور کیا کہہ رہے تھے آپ کے صاحبزادے۔“ تھکے تھکے سے انداز میں سر بند کر اؤن سے نکایا۔

”کہنا کیا ہے، ہزاروں باتیں کرتا ہے سوائے گھر آنے کے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولیں۔
”بس بہت ڈھیل دے لی ہم دونوں نے اسے، یہ اس کا آخری ایڈونچر پلس آوارہ گردی ہے۔ اب اسے اپنے ساتھ بزنس میں انوالو کریں۔“

”کہہ تو ٹھیک رہی ہو..... لیکن میں تھکتا بالکل

نہیں کیونکہ میں ابھی بوڑھا نہیں ہوا جوان ہوں۔“
شوہر کے سنجیدگی لیے شرارتی سے انداز پر وہ کھل کے ہنس پڑیں۔
”جہا تک میرا صاحب! کوئی بوڑھا نہیں مانتا کہ وہ جوان نہیں رہا.....“

”ہم کچھ نہیں جانتے، ہمیں بس اتنا پتا ہے کہ آپ کو دیکھ کر آج بھی ویسے ہی دل دھڑکتا ہے۔“ وہ معنی خیزی سے مسکرا کر نیم وا آنکھوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”ستائیس سال کا ہو گیا ہے آپ کا بیٹا مگر اس کا دل کسی کو بھی دیکھ کر نہیں دھڑکتا۔“ وہ تاسف سے بولیں۔

”ارے بھئی۔ آج کل کے نوجوانوں کے دل موبائل میں دھڑکتے ہیں۔ پہلو میں نہیں۔ فکر نہ کرو اسی سال اس کا بندوبست کریں گے فی الحال اسے کال ملاؤ ذرا بات چیت ہی کر لیں۔“

آج وہ بڑے موڈ میں تھے۔ حفصہ کی انگلیاں اب اس کا نمبر ملا رہی تھیں کال جا رہی تھی وہ دونوں سیدھے ہو بیٹھے۔

☆☆☆

چھپرکا گلی کے واحد بازار میں رٹل کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ وہاں ہونٹوں، ڈھابوں اور دکانوں کے آگے سیاست اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے والے پہلے تو شاید وہاں اسے آڑی ترچھی نظروں سے دیکھ لیتے ہوں گے..... مگر اب ان محترمہ کے وہاں قدم رنج فرماتے ہی بغلیں جھانکنے لگتے۔ آخر کونج صاحب کی بہن تھی۔

شیران کا کھانا پینا وہیں چلتا تھا تو وہ بھی زیادہ تر اسکول ٹائم کے بعد وہیں پایا جاتا..... اب وہ ہوٹل والے سے اپنی پسند کا سبزی، گوشت وغیرہ بنا لیتا تھا۔ وہ روزانہ وہاں سب دکانداروں وغیرہ سے ان کے بال بچوں کے حال احوال دریافت کرتی جیسے مری میں وہ یہ ہی کام کرنے آئی ہو۔ وہ ملازم کے ساتھ پھل، سبزیاں، دودھ، دی اور گھر کی دیگر اشیاء

خریدتی روزانہ وہیں نظر آتی تھی۔

اپنے اسٹینڈرڈ کی لڑکی دیکھیے اور پھر دھیان رکھنے والی اس قدر چپ فرمائش اس سے کیجیے گا۔“ وہ اس کے بھرے بھرے بازوؤں سے نظر چرا کر روکھے لہجے میں بولی۔ وہ اپنا پیلچہ وہیں چھوڑ کر اگلی ہی جست میں اس کے عین سامنے تھا۔

”آپ بھی معاف کیجیے بی بی..... میں اپنی نہیں بلکہ اس بے چارے آپ کے پڑوسی اسکول کی بات کر رہا ہوں۔ پتا نہیں تم لڑکیاں اس قدر خوش فہم کیوں ہوتی ہو۔“ وہ بڑی محظوظ سی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر اس کا چہرہ نہایت تسلی سے دیکھ کر بولا تھا۔

”مجھے تو دونوں ہی بے چارے اور مسکین نہیں دکھتے۔ دونوں اچھی خاصی مضبوط عمارت کے مالک ہو۔“ اپنی کہی گئی بات پہ شرمندگی کے مارے اس کا چہرہ پل بھر کو سرخ ہوا تھا، دوسرے ہی پل وہ سنبھل کر الٹا اسے لتاڑنے لگی اور اسے سامنے سے ہٹنے کے لیے کہا مگر وہ وہیں جم رہا۔

”اب آپ پھر خود مجھے بیچ میں گھسیٹ رہی ہیں۔ میں نے صرف گورنمنٹ عمارت کی بات کی ہے۔“ وہ بازوؤں سے مٹی جھاڑتا اسے پھر خجالت میں مبتلا کر گیا۔

”تو آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ بڑے فراخ دلانہ انداز میں پوچھا گیا۔ وہ بھی سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ جو بکنا ہے بکو۔

سامنے کھڑے بندے کی انتہائی ڈارک براؤن آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر ابھرا تھا کہ وہ گڑبڑا کر نظر جھکا گئی۔

”میں فی الحال تو آپ سے کچھ بھی نہیں چاہتا بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ آپ بھی خود ان دونوں گورنمنٹ اداروں کا تقابل کیجیے گا بمعہ رہائش گاہ۔ فرق خود آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔“ وہ ابھی تک اس کی خم دار پلکوں پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”عادل صاحب اور میں دونوں گورنمنٹ کے ملازم ہیں۔ کبھی ان کے ہاتھ میں بیلچہ دیکھا ہے؟“ یہ آپ کیسی احمقوں جیسی باتیں کر رہے

اس دن کے واقعہ کے بعد اس بازار کے تمام مردوں کی وہ بٹی اور بہن تھی۔ شیران ادھر سے کچھ اٹھانی۔ ادھر کچھ پڑانی۔ تحقیقے، بکھیرتی اس لڑکی کو دیکھ کر گنگ اور دنگ رہ جاتا۔ وہ وہاں بیٹھنے والا واحد مرد تھا جو اسے بڑی فرصت سے دیکھتا تھا، شاید اسی لیے اس نے شیران سے اللہ واسطے کا بیر باندھ رکھا تھا۔ وہن میں سفر کے کڑوے کیلے تجربے کے بعد اب وہ مٹر گشت کرنے کے لیے گاڑی استعمال کرتی تھی اور ان پہاڑی راستوں میں اس کی گاڑی چلتی کم اور ریشتی زیادہ تھی۔ کچھ یوں کہ کوئی بھی کنگلا یا تھکا ہارا مسافر ایسکیوزمی کہتا اندر بیٹھ سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ شیران کو محسوس ہونے لگا کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اس کی حرکتوں پہ بھی نظر رکھنا ایک خوب صورت مشغلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ آج اس نے دو تین لڑکوں کو مزدوری دے کر اپنے ساتھ اسکول کے ارد گرد صفائی پہ لگایا ہوا تھا۔ دھوپ کافی اچھی تھی۔ اس نے شرٹ اتار کر کرسی پہ رکھی اور اب وہ صرف بنیان پہنے اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی کمزوری باڈی گارڈ یعنی مس دانیہ کے ساتھ وہاں سے گزر کر نیچے بستی کی طرف جاتی نظر آئی۔

شیران اپنے حلیے کی وجہ سے پہلے تو تھوڑا شپٹایا۔ وہ بھی محض اسے گھور کر ٹیکسٹ انجان بنی پاس سے گزرنے لگی۔ شیران نے اس کے خوش گوار موڈ کو تہس نہس کرنے کا سوچا۔

”ویسے تو سارے جہاں کا درد آپ کے دل میں ہے، کبھی اس غریب مسکین، اپنے پڑوسی.....“ وہ جان بوجھ کر خالی جگہ پر کمریں جیسی شکل بنا کر اس کے پل پل رنگ بدلتے چہرے کو شرارت سے دیکھ کر چپ ہوا۔

”اس پر بھی دھیان کی نظر ڈال لیا کریں۔“ لہجہ انتہائی سنجیدہ ہی رکھا۔

”مجھے تو معاف رکھیے ماسٹر صاحب! آپ

ہیں۔ وہ کیوں یہ سب کریں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر خاصی غضب ناک ہو کر بولی۔

”گورنمنٹ کے نوکر ہم دونوں ہی ہیں تو پھر اتنا تضاد کیوں؟ آپ کے گھر کی ٹنکیاں پانی سے بھری رہتی ہیں اور ہم آدھا ادھورا نہا کر پچھتاتے ہیں کہ یہ نہانے جیسی غلطی نہ ہی کرتے تو بہتر تھا۔ کبھی گورنمنٹ کی اس نا انصافی پہ بھی ایکشن میں سامنے بلکہ ہمارے ساتھ مل کر عدالتوں کے آگے دھرنے کا پروگرام بنائے۔ اسکول کا احاطہ پکا ہونا چاہیے اور عمارت کے گرد گرل کی باڑھ کیا ضروری نہیں؟“ اب وہ بھی غصے میں تیز تیز بول رہا تھا۔

”اور بی بی! آپ کہتی ہیں، میں حق تلفی برداشت نہیں کر سکتی۔ کیا یہ نا انصافی نہیں ہے؟“

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔“ اپنے سامنے کھڑے اکڑوں کو دیکھتے ہوئے اس نے کچھ نرم انداز اختیار کیا۔

وہ کچھ بھی کہے بنا ایک طرف کو ہو گیا۔

بے قراری نے دل کے اندر ایک درز جتنی جگہ بنائی تھی۔ مڑی پلکوں والی کی خوشبو نے گلشن دل کی آوارہ تیلیوں کو جنگل کے راستے کا پتا بتا دیا تھا وہ اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

☆☆☆

عفرا چائے بنانے جا رہی تھی۔ اس سے پوچھنے کے لیے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ رمل نمکو کھاتے ہوئے پورے انہماک سے ہارر مووی دیکھ رہی تھی۔

نہیں بھابی! اس وقت موڈ نہیں۔“ اس کی نظریں اسکرین کی طرف تھیں سو نکا سا جواب دے کر اپنا مشغلہ جاری رکھا۔ وہ اپنے اور عادل کے لیے چائے لے کر آئی۔ وہ کافی دیر سے فائلوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ عفرانے کب سائیڈ پہ رکھا اور اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ اسے مسلسل اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ اچانک سر اٹھا کر مسکرایا تو وہ جھینپ کر بولی۔

”چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد آہستگی سے بولی۔ ”ایک بات پوچھوں۔“

”ہزار پوچھو۔“ وہ شگفتگی سے بولا۔

”مجھے اکثر لگتا ہے کہ رمل کی پرورش آپ لوگوں کے ماحول سے ہٹ کر ہوئی ہے، میرا مطلب جس طرح کی آپ کی برادری ہے۔“ وہ کچھ جھجک کر بولی ابھی اس کی شادی کو سات آٹھ ماہ ہی ہوئے تھے اس لیے بڑی محتاط ہو کر بات کی۔

وہ چائے کا کپ اٹھا کر ایک دم سیدھا ہوا۔

”اس کی وجہ بھی تمہیں بتانا ہوں۔“ وہ گھونٹ بھر کر بولا۔

”رمل مجھ سے دس سال چھوٹی ہے۔ بھائی کوئی تھا نہیں، سو میں ہر لمحہ اسے اپنے ساتھ لیے پھرتا، وہ مجھ سے کہیں زیادہ تیز ذہن رکھتی تھی، اکثر اپنے ساتھ زیادتی کر جانے والوں سے میں لحاظ برت جاتا تو وہ میرے لیے ڈٹ جاتی اکلونی ہے تو بے تحاشا لاڈ کی وجہ سے ابا نے بھی اسے پابندیوں میں نہیں رکھا۔ جب شادی کے لیے میں نے تمہارا نام لیا تو یہ رمل ہی تھی جس نے ابا کی عدالت میں میرا کیس نہ صرف لڑا بلکہ جیت کر بھی دکھایا..... ورنہ ابا تو میری شادی پھوپھو بتول کی طرف کرنا چاہتے تھے۔“

یہ سب باتیں دہراتے ہوئے اس کے چہرے پہ بڑی پیاری سی مسکراہٹ در آئی۔

”یہ آج تمہیں کیا خیال سوچا۔ کیا اس کی کوئی حرکت تمہیں غیر معمولی محسوس ہوئی ہے اگر ایسا ہے تو کھل کر بتاؤ؟“ عادل کا لہجہ اب پہلے جیسا ہلکا پھلکا نہیں تھا کچھ فکر مند سا ہوا۔

”ارے نہیں نہیں..... خدا نخواستہ ایسا کچھ بھی نہیں میں تو بس ویسے ہی۔“ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اپنے احساسات کن الفاظ میں بیان کرے۔

”دراصل وہ ٹمک کر بیٹھتی ہی نہیں مطلب گھر میں۔“ اس نے کن اکھیوں سے شوہر کا چہرہ دیکھا۔

اب اس نے بغور عفرانے کے چہرے پہ کچھ جانچنے

پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے آنٹی بے چاری تپتی رہتی ہیں مگر اکبر برا بھلا اور انکل۔۔۔ وہ اپنی سوچ کا گلا تختی سے دبا کر پھیکا سا مسکرائی کہ کہیں عادل اس کا چہرہ ہی نہ پڑھ لے۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی دھند کچھ ایسے پھیلی کہ سب کے مزاج بھی دوپہر تک کچھ سرد اور کافی ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ آج وہ اپنے ساتھ عادل کو لائی تھی۔ اس نے نج صاحب کو بھٹہ بھی کھلایا تھا، اپنے پسندیدہ ڈھابے کی چائے بھی پلوائی تھی اور اب زیر تعمیر سڑک یہ اس کے ساتھ ٹہلتے ہوئے وہ ایسے اپنی نئی بننے والی تھیلیوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ دھند نے اب سرمئی رنگ کو سیاہی کے پیالے میں گھول دیا تھا۔

سامنے سے آتے ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی اس نے برا سامنہ بنایا مگر اس کی بیزاری اس وقت حیرت میں بدلی جب عادل نے آگے بڑھ کر نہ صرف اس سے مصافحہ کیا بلکہ گلے بھی لگایا۔

اور سنا میں سر! آپ کا ایڈونچر کیسا جا رہا ہے۔ وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

”ہماری خدمات کو گورنمنٹ ایڈونچر سے منسوب کر رہی ہے مگر سر! معذرت کے ساتھ ججز حضرات بطور ایڈونچر بھی ایسی خدمتیں کیوں نہیں کرتے۔ چار چھ ماہ سے زیادہ رعایا کو اپنے جلووں سے مستفید نہیں ہونے دیتے۔“

عادل کا قہقہہ فلک شکاف تھا۔

”قصور ہمارا نہیں بلکہ گورنمنٹ ہمیں ہر جانی ثابت کرنے پہ تلی ہوئی ہے۔ جب کوئی شہر محبوب ہونے لگتا ہے تو مفارقت کا پروانہ ہمیں بھیج دیا جاتا ہے کہ اب رخت سفر باندھ لو۔“ وہ انتہائی مزہ لے کر بولا تھا۔

”آپ اپنی اداؤں پہ ذرا غور کیجیے۔“ سارا الزام گورنمنٹ پہ کیوں؟ اس رخت سفر کے آرڈر کے پیچھے کیا مخفی ہے۔ کبھی جاننے کی کوشش کیجیے گا۔“

”بڑے دوستانہ انداز میں دشمنوں والی بات کر

کی کوشش کی مگر وہاں سادہ سے تاثرات تھے۔
”آپ کی برادری کا ماحول ایسا نہیں اور پھر شہباز انکل لوگ تو بہت بیک ورڈ قسم کے ہیں۔“ ایک دم عادل نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”اس بات سے کیا مطلب ہے؟“ اس نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ ”زل کا رشتہ ان کی طرف طے تو نہیں ہوا یہ صرف ان کی خواہش ہے۔“ وہ خراب موڈ کے ساتھ بولا۔
”مگر انکل نواز تو.....“

”زل کے رشتے میں صرف بابا کی پسند تو نہیں دیکھی جائے گی۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر درشتی سے بولا تو پل بھر کو وہ چپ ہو گئی۔

”میں نے تم سے اس لیے شادی کی تھی کہ ہمارے گھر کا ماحول کچھ چینیج ہو، کچھ ہمارے مزاجوں کی سختی میں کمی ہو اور اگر تم بھی وہی روایتی بیو اور وہی جل کٹری بھابھ بن کر سوچو گی تو پھر تمہاری تعلیم کا کیا فائدہ یار..... خوب صورتی میں تو پھپھو بتول کی بیٹی نہیں مات دیتی ہے۔“ آخر میں وہ اس کو چڑانے کے لیے شرارتی انداز میں بولا۔ عادل کی بات سن کر اس کا چہرہ تپ گیا۔

”تو کر لیتے شادی، میں نے تو نہیں روکا تھا۔“ وہ خاصی جڑ کر بولی۔

”قسم سے ضرور کر لیتا..... اگر تم سے محبت نہ ہوئی ہوتی.....“ چہرہ تو اس کا بھی تپا تھا مگر جذبوں کی حدت سے، جسے دیکھ کر وہ یل سر نظر چڑا گئی۔

”آپ کی اطلاع کے لیے بتادوں میں کوئی روایتی بھابھ نہیں۔ مجھے بھی رمل کا یہ لا ابالی ساروپ بہت پسند ہے۔ تو بس اکبر سے رشتے کی وجہ سے کچھ فکر تھی۔“

”اکبر کے شوق دیکھے ہیں کبھی، کتوں کی لڑائی کبھی مرغوں کے مقابلے، سارے جاہلوں والے شوق اس میں پائے جاتے ہیں۔“ اکبر کے ذکر پہ وہ یوں ہی کڑوا سا ہو جاتا تھا۔

”یہ سارے شوق تو انکل نواز میں بھی بدرجہ اتم

گئے ہو، یاد رکھنا مسٹر صاحب!“ عادل کا لہجہ بڑا محفوظ سا تھا۔

”ہم بندے صاف گو ہیں، اب دیکھیں ناں، بنا لگی لپٹی رکھے بیچ سڑک آپ کے سامنے قد آدم آئینہ کیسے رکھا کہ آپ بھی دنگ رہ گئے۔“ ایک دفعہ پھر عادل کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”آپ کی صاف گوئی کے قائل ہو گئے جناب۔“ شیران اس کی بات پر مسکرایا۔

رمل کو کوئی جاننے والی مل گئی تھی وہ پیچھے ہی رک گئی۔ شیران کو لگا جیسے ابھی جہاں اس کے ساتھ گامزن تھا اور کسی کے رکنے سے زمانہ پیچھے ہی ٹھہر گیا۔ یہ احساس اس قدر اچانک ابھرا اور اتنا اثر پذیر تھا کہ اپنے اندر سرایت کرنی بے چینی اسے حیران کر گئی۔ وہ اب عادل کی باتوں کا جواب ہوں ہاں میں دے رہا تھا۔

عادل گھر کی طرف جاتی سیڑھیاں اتر رہا تھا اور وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ آگے بڑھے یا واپس ان ہی راستوں پہ جائے۔ شام کے جھٹ پٹے کا ہاتھ دھند نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ راہوں میں رکنا اس کے مزاج کے خلاف تھا پھر آج کیا ہوا تھا کہ وہ ٹھہر گیا تھا۔ آگے راستے کھلے پڑے تھے مگر وہ مڑ مڑ کے دیکھ رہا تھا۔ وہ پتھر کا کیوں ہونا چاہتا تھا۔ خنک دھند نے کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر ایک مانوس سی خوشبو کو اس کی جانب اچھال دیا تھا۔

رمل اسے یوں اس طرح ساکت کھڑا دیکھ کر ٹھٹھکی تھی۔ اسے وہ کسی بھید کی طرح لگا تھا۔ وہ بے دھیان سی ہو کر پاس سے گزر گئی مگر نہیں دھیان کے پانیوں میں کسی اٹھنے والی نظر سے ارتعاش سا ہوا تھا.....

☆☆☆

”اس کی ماں بڑے رنگ برنگے کپڑے پہنتی تھی، خود کو سجا سنوار کر رکھتی تھی۔ بے چاری کا شوہر ہر وقت میلا کچیلارہتا تھا، بیٹا ہوا تو بڑے چاؤ سے اس کا نام خوش لباس رکھا۔ جب تک چھوٹا تھا، خوب صاف

ستھرا رکھتی تھی۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا باپ کے نقش قدم پہ چل نکلا۔ ماں کی خواہش اور نام کا بھرم بھی کھوٹا کیا۔

”بندہ اس بد بخت کو کم لباس یا بے لباس بھی نہیں کہہ سکتا۔ ناہنجار کا پورا نام لے کر بلانا پڑتا ہے۔“ اور صرف نام کا خوش لباس بھاجی کا حقہ سلگاتا ہوا دانت نکوس رہا تھا۔ بے بے تاجی سے پاؤں دبواتی اسے خوش لباس کی کہانی سنارہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ بھاجی کے سامنے حقہ رکھ رہا تھا۔

”کان کھول کے سن لے، اگر کل تو اس حلیے میں آیا تا تو تیرے ٹوٹے کر دوں گی۔“ زرین نے حقے کی گڑ گڑ کا غصہ بھی اس پہ نکالا جو سر ہلاتا باہر کی جانب بھاگتا تھا۔

”چل بس کرتاجی! تو بھی جا کے سو جا۔“ انہوں نے پاؤں کھینچے تو تاجی نے بھی ہاتھ اٹھا لیے۔

چاند بڑا خوش رو تھا۔ وہ ماتھے پہ بازو رکھ کے آسمان کو تنگنے لگیں۔ تاجی بھی چپل کی شپ شپ کرتی حویلی کے پچھواڑے چلی گئی۔

”تجھے بڑی کہانیاں یاد ہیں ابھی تک۔“ نواز حسن نے چاند کی روشنی میں ان کا چہرہ دیکھا۔ چار سو چاند کی نرم رو کر نہیں تھیں۔ وہ زرین کو دیکھ رہے تھے انہوں نے چاند پہ اک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ ہمیشہ ان سے خفا، خفا، خفا، فاصلے پر رہیں۔ وہ ہی فاصلے پاتے تھے، انہوں نے کبھی چاند کو چھونے کی خواہش نہیں کی تھی مگر ان کے قرب کی خواہش ہمیشہ آدھی ادھوری سنائی جانے والی کہانیوں کی طرح تھی، انہیں لگتا، وہ آج بھی تشنہ تھے۔ وہ کبھی ان کے لیے خود کو بدل نہیں سکے تھے۔

انہیں حقے کی بدبو اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ حقہ نہ چھوڑ سکے۔ انہیں سگریٹ کے دھوئیں سے الرجی تھی۔ نواز حسن کو سگریٹ سے عشق تھا۔ ان کے تمام شوق زرین کو بے مقصد اور برے لوگوں کے شوق لگتے تھے وہ جیسے تھے وہ بے نواز حسن سے محبت تو کر رہی تھیں مگر انہیں اپنی چاہ کی چھاؤں میں سستانے

نہیں دیتی تھیں۔
زندگی کے بتیس سال یونہی گزر گئے۔ وہ خود کو ٹھیک سمجھتے تھے اور وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ ”کہانیاں تو تمہیں بھی بھولی نہیں ہوں گی پر تمہارا دل سننے کو ہی نہیں کرتا۔“ وہ پتا نہیں کیا یاد دلانا چاہتی تھیں۔ بس ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔
”ایسی آہیں بیوہ عورتیں بھرتی ہیں۔“ انہیں پتا نہیں کیوں غصہ آ گیا تھا۔

”استغفار کرو، کیسی بری بات منہ سے نکالی ہے۔“ وہ جیسے کراہ کر بولیں۔

”اور سنو! زیادہ خوش نہ ہو، میری تعزیت کے لیے آئے ہوؤں کا استقبال تم ہی کرو گے۔“ یہ بات سن کر وہ چار پائی پہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”ایک تو میری بیٹی کو مجھ سے دور بھیج دیا، اوپر سے آدھی رات کو ایسی باتیں کر رہی ہو۔“ وہ ٹھٹھکی باندھ کر ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”بیٹی کو ساری زندگی پاس نہیں رکھنا، نواز! اس کی شادی بھی کرنی ہے، پھر کیسے رہو گے۔“ جب وہ یوں بے اختیار ہو کے دیکھتے تھے تو وہ گہری شرمندگی کے حصار میں گھر جاتی تھیں۔

”اس نے کون سا سات سمندر پار جانا ہے، شادی کے بعد بھی گجرات میں ہی رہے گی۔“ وہ تین بھرے لہجے میں بولے۔

”یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“ زرین نے جیسے ان کا یقین توڑا تھا۔

”تم ڈولی میں پیر رکھتے وقت گھر سے سوچ کے آئی تھیں کہ میری ہر بات کا الٹ جواب دو گی۔“

”میں تو بڑے خواب سجا کر آئی تھی جو تم نے یوں چکنا چور کر دیے جیسے چوڑی کا چھابہ گرتا ہے تو ایک چوڑی بھی نہیں بچتی۔“ زرین کے تیز لہجے میں ٹوٹی چوڑیوں کے چھناکے تھے۔

”بڑے چا سے بیاہ کر لائے تھے ہم یاد کرو۔“ بڑے میٹھے لہجے میں یاد دلایا گیا۔

”ہاں اسی لیے دوسرے ہی دن کتوں کی لڑائی

کروانے پشاور چلے گئے اور بیس دن بعد واپس آئے تھے۔“ انہوں نے چھوٹی انگلی سے آنکھ کا کونہ چھوا تھا پانی تھا کہ آنسو، وہ سمجھ نہیں پائیں۔

”تمہارے اما کو بتایا بھی تھا مگر انہوں نے بھی جان بوجھ کر شادی کی وہی تاریخ رکھی تھی۔ بس یار باش بندہ تھا، ان کے ساتھ نکل جاتا تو مہینوں آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ تمہارے سامنے کتنی دفعہ پچھتا چکا ہوں۔“

”تمہارے پچھتانے سے وہ وقت واپس نہیں آئے گا۔“

وردان کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ سکون سے وہ بھی نہیں سو سکتی تھیں۔

☆☆☆

”ایسا نہیں تھا کہ رمل حسن دنیا کی واحد خوب صورت لڑکی تھی۔ وہ مکمل خوب صورتی کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی پھر بھی اس میں کچھ ایسا تھا کہ جس کی وجہ سے وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ وہ خود کو کافی دنوں تک پہلاتا رہا۔“ وہ بار بار اس کے خیالوں میں چلی آتی تھی۔

تین چار دن سے وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ واپس چلی گئی ہو، یہ سوچ کر اس کی بے چینی سوا ہو جاتی۔ وہ بے خیالی میں چلتا ہوا اس ڈھا بے تک آ گیا جہاں اکثر وہ چائے پیتی تھی۔ وہ وہاں جا کر ٹھہر گیا۔ ڈھا بے کے مالک نے بس اس کی طرف دیکھا، چائے کا نہیں پوچھا۔ شاید اس کے چہرے پہ چائے کی طلب نہیں تھی۔

بادلوں نے ایک دم ہی دھوپ کو اپنے پروں میں چھپا لیا تھا۔ مقامی لوگ کہتے تھے کہ یہ گلی بادلوں کی گزرگاہ ہے اور اس نے کہیں پڑھا تھا کہ گزرگاہوں پہ بھٹکنے والے منزلوں کی جانب جا ہی نہیں پاتے۔ وہ پہاڑوں کا اسیر تھا۔ دریاؤں کا شور اس کا عشق تھا۔ اونچے لمبے درختوں کی چوٹیاں پہروں دیکھنا اسے پسند تھا۔ وہ ایک سیاح تھا۔ سفر اس کے پاؤں تلے ہمکتا تھا۔ وہ رکنے کا تصور بھی نہیں کرتا تھا۔ پہلی دفعہ

پہلے ریل نے جو کچھ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پہ ریم دیکھا تھا وہ اس کی طرف دیکھنے سے اب کتر رہی تھی۔

”چلو، میں دیکھتا ہوں۔“ وہ بونٹ پکڑ کر انجن پہ جھکا ہوا تھا اس کا تروتازہ بٹاش سا چہرہ وہ بہت قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بڑی مہارت سے مصروف تھے یک لخت وہ پیچھے مڑا۔ اس کا کندھا ریل کے بازو سے ٹکرایا وہ بوکھلا کر اٹھنے قدموں پیچھے ہٹی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

”اس کی بیٹری کا ٹرمینل ڈھیلا تھا جو میں نے اچھی طرح کس دیا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اشارت کروں۔“ وہ اس کے چہرے پہ نظر ٹکا کر بولا۔

”جی ضرور۔“ فی الحال مجبوری تھی تو لہجہ بھی خود بخود نرم پڑ گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھا۔ دانیہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی اس نے جیسے ہی چابی انکیشن میں گھمائی، گاڑی اشارت ہو گئی۔۔۔۔۔

”تین چار دن گھر والوں نے آپ دونوں کو کیسے برداشت کیا ہو گا۔“ اس نے دانیہ سے ہی معلومات لینا بہتر سمجھا۔

”ریل لوگ پنڈی عفر ابھائی کی آپا کے گھر گئے ہوئے تھے۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح سادگی سے جواب دیا جبکہ باہر کھڑی ریل جھنجھلائی تھی۔

وہ گاڑی اشارت چھوڑ کر باہر نکلا۔ ”آپ کو تھوڑی بہت سوجھ بوجھ ہونی چاہیے اگر یونہی وقت بے وقت خراب ہو گئی بھی تو مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہتا دو قدم آگے بڑھ کر اس کے بہت نزدیک آ گیا تھا۔

”آپ پوچھیں گی نہیں کہ آپ کی غیر موجودگی مجھے کیوں محسوس ہوئی؟“

اس نے ایک لمحے کو بھی ریل کے چہرے سے نظریں ہٹائی نہیں تھیں۔ اس کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکا تھا۔ وہ شیشائی ہونٹوں کی طرح اس کا چہرہ تنکے لگی جیسے وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہو۔

ایسا ہوا تھا کہ پہاڑوں، دریاؤں، درختوں سے ہٹ کر کسی کی محبت نے اس کے سفر کو باندھ دیا تھا۔ وہ خود پہ اترتی اس کیفیت پہ سرشار سا تھا۔ اگر اس تلاش اس بے چینی اس کھوج کو ہی محبت کہتے ہیں تو اسے محبت ہو چکی تھی۔

اس کی اندرونی حالت کیا بدلی تھی کہ سارا شہر ہی بدلا سا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر راستوں کی حیرت بجا تھی کہ تاک کی سیدھ میں چلنے والا اب انتہائی ڈھیلے اورست قدموں سے جا بجا دیکھتا رہتا تھا۔ آج تو اسے ہونٹ والے کی انتہائی تیز آواز میں چلنے والی موسیقی بھی بھلی لگ رہی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ آنکھوں کی تلاش ختم ہوئی۔ نگاہ جو کسی چہرے پہ ٹھہری تو واپسی کی کشتیاں وہیں جلادی گئیں۔ اس کی بے قرار آنکھوں نے وہیں خیمے گاڑ دیے تھے۔

میرے نین پیاسے درشن دے گاڑی ذرا دیر کو رکی تھی۔ اس نے چند بھٹے لینے چاہے شیرانی کی محویت اس قدر شدید تھی کہ ریل کی نگاہ اسی کی جانب تھی۔

وارفتی کا وہ عالم تھا کہ نہ بھید نہ پردہ جیسے دل اٹھا کر آنکھوں میں رکھ دیا تھا تو پھر ان آنکھوں کی ان سنی باز گشت حشر پانے کرنے والی بولیاں وہ کیونکر نہ سمجھ پاتی۔ وہ جھٹکی، جو کئی اس کے چہرے پہ استعجاب اترتا پھر وہ سنبھل بھی گئی تھی تب ہی تو نظریں دامن جھٹک کر اپنی راہ پہ ہو لیں۔۔۔۔۔

گاڑی کے آگے بڑھتے ہی وہ جیسے اپنے حواسوں میں آیلے دل کی من مانیوں پہ خود کو سرنش کی۔ تب ہی اس کی نظر سامنے اٹھی تھی۔ کافی آگے ریل گاڑی کا بونٹ اٹھا کر چیک کر رہی تھی وہ تیزی سے کی طرف بڑھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے وہ آپس میں بہت بے تکلف ہوں۔ وہ بونٹ پکڑے ہوئے ہی ذرا سا ترچھی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں نہیں اچانک ہی بند ہو گئی ہے۔“ کچھ دیر

اس کے الفاظ پر حدت تھی یا اس کا قرب، وہ تھوڑا دور ہوئی، اور گاڑی میں بیٹھ گئی وہ فرنٹ ڈور کی کھڑکی پہ جھکا تھا۔

”میری بات کا جواب ادھار ہے۔“ اس کا لہجہ گنہگار تھا۔

”لگتا ہے، آپ کا دماغ گھوم چکا ہے ان بل کھاتے راستوں پہ ذرا کم مٹر گشت کیا کریں۔“ اس نے بمشکل اپنے حواس سمیٹ کر پرانا انداز اپنایا تھا اور گاڑی زن سے آگے بڑھائی تھی۔

وہ طمانیت سے مسکرا دیا۔ وہ ابھی اسی شہر میں تھی۔ ابھی بہت سی ملاقاتیں متوقع تھیں۔

☆☆☆

آج کراچی کا موسم کافی خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ہوائ نے مکینوں پہ اچھا اثر ڈالا تھا۔ حصہ اور شانزہ بید کی نفیس اور آرام دہ کرسیوں پر لان میں آمنے سامنے براجمان تھیں۔

”کیا خیال ہے، ایک چکر مری کا لگا آئیں۔“ شانزہ نے انہیں اپنی طرف سے ایک معقول مشورے سے نوازا تھا۔ حصہ پر سوچ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس کا بیٹا شانزہ کو کبھی گھاس نہیں ڈالے گا۔ وہ اکثر ماں کے کپڑوں پہ بھی تنقید کرتا تھا شانزہ تو پھر بہت بولڈ ڈریسنگ کرتی تھی۔

”میرا آئیڈیا کیسا لگا؟“ وہ اب دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

”آئی ایم سوری سویٹ ہارٹ! میں اور جہانگیر تو دو ہفتوں کے لیے پیرس جا رہے ہیں۔ ہاں اگر تم جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔“ وہ لا پرواہی سے کندھے جھٹک کر بولی تھیں۔

”آنٹی! آپ کا بیٹا کسی عجوبے سے کم نہیں، ہو سکتا ہے وہ وہاں تجھے دیکھ کر پہچاننے سے ہی انکار کر دے۔“ وہ منہ بگاڑ کر خاصی صاف گوئی سے اعتراف کر گئی۔ اس کی بات پہ حصہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ایک مسکراتی نظر شانزہ پہ ڈالی۔

”بیگم صاحبہ! باقر صاحب تشریف لائے ہیں۔“ چوکیدار نے انہیں مودب ہو کر اطلاع دی۔

”ہاں ہاں، اسے فوراً بھیجو، میں نے خود ہی فون کر کے بلوایا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد وہ انہیں بہت محتاط سا ہو کر سلام کر رہا تھا کہ مبادا شانزہ کے سامنے ہی عزت افزائی نہ ہو جائے۔

”بیٹھو۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولیں۔ وہ ان کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ شانزہ نے بغور اس کا جائزہ لیا۔۔۔۔۔ آخر کو وہ شیران کا بیسٹ فرینڈ تھا۔

”سنا ہے، تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

”جی۔ آپ نے درست سنا ہے۔“

”خیر اچھا ہے۔ اسی بہانے ہمیں بھی تمہارے دوست سے ملنے کا موقع فراہم ہو گا۔“ وہ ان کا طنز محسوس کر کے بوکھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

”آپ شرمندہ تو نہ کریں آنٹی!“ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا سو سنجیدگی سے بولا۔

”میں نے سمجھیں یہ بتانے کے لیے بلایا تھا کہ ہم دونوں پیرس جا رہے ہیں، شاید شادی سے ایک دن پہلے واپسی ہو تو۔۔۔۔۔“ انہوں نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکالا۔ ”یہ تمہارے اور غنیم کے لیے ہے۔ اپنی پسند سے گفٹ خرید لیتا۔“

باقر کے لیے یہ نئی اور انجانی صورت حال تھی۔ پھر بھی اس نے بھلے گڑبڑا کر ہی مگر شکریہ کے ساتھ لفافہ پکڑ لیا۔ وہ اب خوش دلی سے مسکرا رہی تھیں۔

”اپنے دوست سے بھی کہو، اب شادی کر لے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری دیکھا دیکھی ہی اس کا موڈ بن جائے۔“ وہ ان کا نرم سار عمل دیکھ کر ہکا بکارہ گیا کیونکہ ان کی جانب سے اسے ہمیشہ صلواتیں ہی سننے کو ملی تھیں۔

”اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں، اب تم بھی معقول لوگوں کی لسٹ میں آنے والے ہو اور تمہارا

”جی فرمانا کیا ہے، عرض کرنے حاضر ہوئے ہیں۔“ وہ خاصے نامعقول انداز میں بولا۔ ”وہ اسکول آپ نے بڑا چمکا کے رکھا ہوا ہے۔“ اس کی گول گول آنکھوں کی پتلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔

وہ خاصا الجھ کر انہیں دیکھنے لگا، ان کے آنے کا مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”بات یہ ہے ماسٹر صاحب کہ جب آپ یہ گورنمنٹ کی جگہ سیل کرنا چاہیں تو ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔“ اب وہ کام کی بات کی طرف آیا تھا۔ شیران کے چہرے پہ تحیر آ رہی تھی۔

”کیا مطلب.....؟“ اس نے اپنی ٹھوڑی پہ انگلیاں پھیر کر آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا۔

”مطلب‘ مطلب کیا ہوتا ہے صاحب! سیدھی سی بات ہے جب تک آپ یہاں ہیں، اس پہاڑ کے آپ ہی مالک ہیں۔“ ٹھک کوئی وزنی چیز اس کے دماغ پہ لگی تھی مگر وہ بڑے ضبط سے اپنا غصہ دبا گیا کہ اسے ابھی ساری رام کہانی معلوم کرنی تھی۔

”مگر وہ کیسے سر! کچھ کھل کر بات کریں۔“ اس نے لہجہ حتی الامکان پرسکون ہی رکھا۔

”آپ گورنمنٹ کے بندے ہیں سر! اور میں برابری ڈیلر ہوں، ہم دونوں مل کر اپنا اور لوگوں کا بھلا کر سکتے ہیں۔“ وہ بائیں آنکھ دبا کر خیانت سے مسکرایا تھا اور وہ ہل بھر میں جیسے سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

”ہوں تو یہ قصہ ہے۔“ اس نے گہرا سانس لیا پھر ان کی طرف رازداری سے جھکا۔

”اور اگر کسی مخبری پر عدلیہ انوالو ہو گئی تو.....“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

”اس کی آپ فکر مت کریں، یہاں کوئی پھٹا نہیں ڈالے گا۔ عدالت والے بھی اپنے یار دوست ہیں اپنے حصے کا حقہ پانی وصول کر لیتے ہیں۔“ وہ آدمی اب اسے آمادہ دیکھ کر اطمینان سے بول رہا تھا۔

”تو کیا مجھ سے پہلے بھی جو ہیڈ ماسٹر تھے، وہ

نامعقول دوست رنگتا، تمہارے ہی رنگ میں ہے۔“ وہ اسے کچھ جتا کر مسکراتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ وہ بس کھسیا کر رہ گیا۔

آنٹی کا لہجہ بھلے طنزیہ سہی مگر اسے مزہ دے رہا تھا البتہ شانزہ ان کی نوک جھونک سے بور ہو رہی تھی۔

”آنٹی! مجھے اجازت دیں، ان شاء اللہ پھر ملاقات ضرور ہوگی۔“ اس نے ٹیبل سے بیگ اٹھاتے ہوئے کافی پرسوج نظروں سے باقرا کو دیکھا تھا۔

اسے خدا حافظ کہہ کر وہ دوبارہ باقر کی جانب متوجہ ہوئیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے باقی! شیران شانزہ سے شادی پہ آمادہ ہو جائے گا؟“ آنٹی نے اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں لیا تھا۔

”مجھے نہیں لگتا۔“ وہ پیالی کے سنہری کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ انہوں نے ایک گہرا سانس اندر کی طرف کھینچا۔

”چلو اللہ بہتر کرے، تمہارے ساتھ بھی اور اس کے ساتھ بھی۔“

وہ رک کر بولیں اور اس کا شانہ تھپتھا کر اپنے تلے قدم اٹھاتی اندرونی دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

آج کل بچوں کے ٹیسٹ ہو رہے تھے، وہ اسکول کے احاطے میں ہی اپنے سامنے ٹیبل پہ کاپیاں پھیلانے بیٹھا تھا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی مگر وہ اپنا کام ختم کر کے اٹھنا چاہتا تھا تب ہی کچھ آدمی اس سے ملنے چلے آئے۔ اس نے وہاں موجود پھیلا واسمیٹا اور میز کی دوسری طرف موجود کرسیوں پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا، ان تینوں میں سے ایک کا چہرہ اسے کچھ شناسا لگ رہا تھا باقی دونوں کو وہ پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔

”جی فرمائیے۔“ وہ اب ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کی بھیگی شرٹ کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

اس کے دل کی دھک دھک وہ اپنے سینے میں سن رہا تھا۔ وہ شاید تصور میں خود کو کتوں کی خوراک بننے دیکھ چکی تھی اور اس وقت خوف کی انتہاؤں پر کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے اس نے آہستہ سے شرٹ اس کے ہاتھوں سے چھرائی تھی۔

”آج آپ کی بہادری کا پتا بھی چل گیا۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”آپ مجھے اکیلا نہ سمجھیں، دانیہ میرے ساتھ ہے۔“

”وہ تو کب کی اوپر جا چکی۔“ وہ بڑا محظوظ سا ہو کر زرب لب مسکرایا۔ تو وہ بدحواس سی ہو کر نظر اٹھانے پہ مجبور ہو گئی۔

بارش تھم چکی تھی مگر شیران کی بھیگی آنکھوں میں جذبات کی بارش اس قدر پر زور تھی کہ وہ ایک پل کے لیے بھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی۔

”پلیز۔“ وہ ملجی ہو کر بولی تو اس نے آہستگی سے کلاسیاں چھوڑ دیں۔

”جاؤ میں نے محبت کے سارے موسم تمہاری نرم ہتھیلیوں میں بودیے ہیں۔“

وہ اس کے کان کے پاس سرگوشی کر گیا تو وہ لڑکھڑاکر اٹھے قدموں بھاگی۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ محبت کیلی مٹی کی صورت اس کے قدموں کے نیچے لپٹی جا رہی ہے یہ صرف اس کا خیال تھا جانے والی نے کسی پیڑ پتے بوند یا ہوا کے ہاتھ پہ امید کا ننھا سا دیا بھی نہیں جلا یا تھا۔

☆☆☆

تمام رات نیند اس کی آنکھوں کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلی رہی تھی وہ کروٹوں پہ کروٹیں بدلتا رہا یوں لگتا تھا کہ جیسے سینے میں دو دل دھڑک رہے ہوں اپنے دل کی تو خیر تھی مگر پشت پہ ابھرنے والی دھک دھک اسے بے حال کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر ایک گہرا سانس لیا۔ پتا نہیں دن

بھی۔“ وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر ان سے اور بھی بہت کچھ اگلوانا چاہتا تھا۔

”یہ سارا گورنمنٹ کا پہاڑ تھا جو اسی ذریعے سے بک چکا ہے۔ اب تو یہ چند قطعے ہی بچے ہیں۔“ وہ اپنی طرف سے اسے قائل کر چکے تھے۔ وہ چند ثانیے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر ان سے سرد لہجے میں بولا۔

”فی الحال تو آپ جائیں بعد میں بتاؤں گا مجھے کچھ وقت چاہیے۔“ اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔

”ٹھیک ہے، جتنا مرضی وقت لے لیں۔“ وہ تینوں اسے اٹھتا دیکھ کر کھڑے ہو گئے..... وہ جانتا تھا کہ آئندہ ان کے یہاں آنے کی نوبت نہیں آئے گی کیونکہ رات کو یہ سارا مواد باقر کے ہاتھ میں پہنچنے والا تھا۔ سامان کمرے میں رکھ کر وہ چائے پینے کی غرض سے بازار کی طرف جا رہا تھا۔ چند موٹی موٹی بوندیں اس کے سر پر پڑیں تو وہ رک گیا۔ چائے گھر میں ہی چلے گی، اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

رہائشی کمرے کا دروازہ کھولنے تک وہ کافی بھیگ چکا تھا۔ جنگلی کتوں کے غول اپنی آوازوں کے سر بارش کی آواز میں ملتا رہے تھے گہرے ہوتے بادلوں کی وجہ سے ملکجے سے اندھیرے کا گمان ہو رہا تھا ابھی اس نے دروازے کا ایک پٹ ہی کھولا تھا کہ اپنے عقب سے حواس باختہ سی دانیہ کی آواز سنائی دی۔

”پلیز سر! نیچے رمل کی ہیلپ کیجیے۔“ وہ تیر کی تیزی سے مڑا۔ اب کتوں کی آوازیں انتہائی قریب سے آ رہی تھیں اس نے رمل کی ایک جھلک درختوں کے پاس دیکھی تھی دوسرے ہی لمحے وہ نیچے کی جانب اندھا دھند دوڑا تھا۔

رمل بھاگ بھاگ کر جیسے اپنے حواس کھو چکی تھی۔

شیران نے منہ سے کوئی آواز نکالی تھی جسے سن کر جنگلی کتے بھاگ گئے اس کے قریب پہنچنے پر وہ تیزی سے اس کی آڑ میں چھپی تھی اور پشت سے اس

کب نکلے گا۔ وہ اس سے مل کر اس کے احساسات اس کے چہرے پہ دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

”بے بی جی! بھاجی کہہ رہے ہیں، میرا سامان پیک کر دیں جی۔ شام کو پشاور کے لیے نکلنا ہے۔“
زرین نے بڑے سکون سے بے حد میلے حلیے میں خوش لباس کو دیکھا جو نظریں پیچی کیے سامنے مودب سا کھڑا تھا۔

”تو کیوں اتنا رنجیدہ ہو رہا ہے، تجھے تیرا بھاجی ساتھ نہیں لے کر جا رہا؟“ اس کی اتری ہوئی صورت پہ سوا بارہ بج رہے تھے۔

”بے بی جی اس کی اداسی کی وجہ میں بتاتی ہوں۔“ خوش لباس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی تاجی بڑے کرارے لہجے میں بولی۔

”تو کب سے اس کی وجہ جاننے لگی ہے۔“ انہوں نے تاجی کے ہنستے مسکراتے چہرے کو شکی نظروں سے دیکھا۔

”لو جی۔ یہ کون سی اوکھی بات ہے، آدھا گجرات جانتا ہے۔“

”اچھا کیا اس کا کوئی چکر چل رہا ہے۔“ زرین نے ابرو بڑھائے۔

”آپ بھی بے بی معجزوں کی بات کرتی ہیں۔ اس کلمے سے کون سر پھری چکر چلائے گی۔“ اب خوش لباس نے اسے مرنے مارنے والی نظروں سے دیکھا۔

”بات یہ ہے کہ بھاجی اس کا عزیز ترین کالے کنوں والا کتا اپنے دوست کو دینے جا رہے ہیں۔“ تاجی نے منہ پھاڑ کے اس کی اداسی کا بھانڈا پھوڑا تھا۔

”اچھا.....“ بے بی نے سر ہلایا اور خوش لباس کو دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت میں گھر گئیں۔ کبھی کسی بلی سے، کبھی کسی کیسیے، گلے میں آنے والے مستقل فقیر سے وہ یونہی اپنی دل جوئی کے سبب ڈھونڈ لیتا تھا۔

”ادھر آ..... میرے قریب بیٹھ۔“ لہجہ نرم تھا سو وہ زمین پہ چوڑی مار کے بیٹھ گیا۔ ”تو نہیں چاہتا کہ وہ یہاں سے جائے۔“

”اتنا سا تھا، میں نے ہی پال پوس کے بڑا کیا ہے، اب بھاجی کسی اور کو دے آئیں گے..... جدائی پڑ رہی ہو تو رونا تو آئے گا۔“ وہ آنکھوں میں اترے آنسو صاف کر کے بولا۔ تاجی اس کی حالت دیکھ کر ہنسی کے مارے دوہری ہو رہی تھی۔ بے بی نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

”تو دل پہ مت لے..... پھر کوئی لے آئے گا ادھر سے، تیری گود پھر سے بھر جائے گی۔“ بے بی نے قریب آتے نواز حسن کو دیکھ کر با آواز بلند کہا تھا۔ وہ خوش لباس کا دکھی چہرہ دیکھ کر اپنی بیوی کا جملہ سمجھ گئے تھے مگر ایک تیز نظر ان پہ ڈالتے سیدھا کمرے میں چلے گئے۔

”اچھا چل اٹھ۔ اسے خوشی رخصت کر، شاباش۔“ وہ اسے پکڑ کر بولیں۔ ان کا استہزاء یہ لہجہ سن کر اندر کھڑے نواز حسن تلملا کر رہ گئے۔

☆☆☆

آج وہ مال کی ایک پھریلی بیچ پہ بیٹھا غالب کے شعر کی سچائی کا اعتراف کر رہا تھا کہ.....
عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس ہفتے وہ کراچی جا رہا تھا، اسکول سے وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے رہا تھا۔ اس بھگی شام کے بعد وہ اس کی شکل دیکھنے کو ترس گیا۔ وہ ایک طرفہ محبت کا قاتل نہیں تھا۔ وہ جس کیفیت کی گرفت میں تھا۔ اسے بھی اسی کی زد میں دیکھنے کا خواہاں تھا۔ وہ کہیں نظر تو آئے اندر کا حال جاننے کے لیے بات کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ وہ اس کا چہرہ پڑھ کر بتا سکتا تھا کہ حادثہ دو طرفہ ہے۔

”آہی! دیکھیں تو، ہمارے سر بیٹھے ہیں۔“ اس کی سوچ کی تان بچوں کی آوازوں سے ٹوٹی تھی۔ بچوں نے اس کی جانب دوڑ لگائی، بے چین نگاہوں

میں بہت کچھ تھا۔

”اسنو پڈ!“ وہ دل ہی دل میں تلملائی پھر یونہی اس کا دھیان خود پر سے ہٹانے کے لیے روکھے سے لہجے میں ٹوک گئی۔

”آپ کو اس طرح اپنی ساری تنخواہ سیر سپاٹوں میں خرچ نہیں کرنی چاہیے، بھلا گھر میں کیا بھیجتے ہوں گے۔“ یہ بات اس نے کچھ ایسے منہ بنا کر کی تھی کہ وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

”شکریہ آپ کے احساس کا۔ مگر میرے گھر والے بھی جو کماتے ہیں، خود پہ ہی خرچ کرتے ہیں۔ ابھی اکیلا بندہ ہوں۔ سیونگ کا شادی کے بعد سوچوں گا۔“

”سر! آپ شادی کب کریں گے؟“ دانیہ نے اچانک ہی پوچھا تھا۔

”جلد ہی شاید..... کیونکہ مجھے لگتا ہے، ایک لڑکی کے دل نے قابو کر لیا ہے۔“ آخری بات اس نے اتنے مدہم لہجے میں کی تھی جسے دل بھی بمشکل سن پائی تھی..... اب وہ اسے شرارتی نظروں سے دیکھ رہا تھا..... اور وہ اسے زیادہ دیر گھور بھی نہ سکی۔ کافی ختم کرنے کے بعد انہوں نے معذرت کے ساتھ اللہ حافظ کہا کہ انہوں نے آج بچوں کو پتہ لے کر جانا تھا۔

”سر! آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“ بچوں نے پھر ضد باندھ لی تھی جس پہ ان دونوں نے بمشکل ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں بہلایا اگر وہ دونوں مڑ کر اس کا چہرہ دیکھ لیتیں تو جان سکتی تھیں۔

”اس کے چہرے وہ تم لوگ جاؤ میں آ رہا ہوں“ صاف صاف لکھا نظر آ رہا تھا۔ وہ آج پورا دن اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا، اس کا نظریں چرا کر بات کرنا اس کی اندرونی کیفیت کا غماز تھا۔

”وہ اس سفر میں تنہا نہیں.....“ بڑا ہی دل فریب احساس تھا۔

☆☆☆

دانیہ کو جتنی قرآنی آیات یاد تھیں۔ وہ پڑھ چکی

نے وہ چہرہ دیکھ کر قرار پایا تھا، نظروں کے تصادم پہ ایک سیکنڈ میں اس نے نگاہ چرائی تھی تو شیران کے ہونٹوں پہ خود بخود مسکراہٹ چل گئی.....

دانیہ بچوں کے پیچھے ہی لپکی تھی۔ مگر وہ اپنی جگہ جمی رہی..... پھر دانیہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بچوں کو چاکلیٹ پکڑاتے ہوئے، بھی اس کی نگاہ اس کے چہرے پہ لپکی رہی..... جو ارد گرد موجود لوگوں کو بلاوجہ ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ ہی چل پڑا۔

”کل پرسوں تک ہم واپس لاہور جا رہے ہیں تو آج بچے ضد کر کے ہمیں لے آئے ہیں۔“ دانیہ خواہ مخواہ ہی اسے وضاحتیں دے رہی تھی۔

”اچھا۔“ وہ طنزیہ سا ہو کر ہنسا۔ ”بے چارے بچوں کو تم دونوں نے یہاں بھی خوب پھنسایا۔“ اب وہ لوگ ریل کے قریب پہنچ چکے تھے۔

”آج بچوں کی انجوائے منٹ میری طرف سے۔“ قریب آنے پر وہ بڑی سلی سے اس کا چہرہ دیکھ کر بولا۔ ”کیونکہ دو تین دنوں تک میں بھی جا رہا ہوں.....“ وہ کچھ توقف سے بولا تھا۔

ریل کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزر گیا..... جسے شیران نے دلچسپی سے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ شیطان بچے کس طرح ان کی تفریح کو ملیا میٹ کرتے ہوں گے کیونکہ ان کے پیچھے نہ صرف بھاگنا پڑتا تھا بلکہ وہ آپ کی جیب کا بھی کبڑا کر دیتے تھے۔ آج شیران کی پاکٹ سے ان کے عیش ہو رہے تھے۔

”اب بس کریں شیران بھائی! ان کی نیت نہیں بھرے گی۔“ دانیہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔ وہ جواباً بس مسکرا کر رہ گیا۔

بچوں کو آٹکس کریم دلانے کے بعد وہ اپنے اور ان دونوں کے لیے کافی لے آیا۔ جسے تھینک بو کے ساتھ پکڑتے ہوئے اس نے ذرا سا اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مقابل کی آنکھوں کی کیفیت ہوش گم کر دینے والی تھی۔ دلچسپی شوق اور توجہ کے علاوہ بھی اس

کی گاڑی تو میں نے ریگتی زیادہ چلتی کم ہی دیکھی تھی۔

”اس سے تو اچھا تھا ہم پیدل ہی پتہ پتہ چلی جاتیں.....“

اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا رمل پہاڑی راستوں پہ ڈرائیونگ میں مہارت نہیں رکھتی تھی۔ جہاں پہ موٹر اور چڑھائی زیادہ ہوتی تو وہ گاڑی کی مرضی کے بغیر ہی کہیں ریس زیادہ تو کہیں بریک ایک دم لگا دیتی۔ مری کی چڑھائی وہ بھی مال تک اپنی خطرناک نہیں تھی اس نے عادل کے ساتھ ان راستوں تک مہارت سے گاڑی چلانا سیکھ لی تھی۔

اب پتہ پتہ کی چڑھائی پر اس کے بھی جھکے چھوٹے رہے تھے مگر پھر بھی وہ ہمت نہیں ہار رہی تھی۔ جیسے جیسے چڑھائی خطرناک ہوئی، اس کی ہمت تو نہیں البتہ گاڑی جواب دے گئی۔

”اوشٹ.....“ وہ باہر آئی اور دروازہ زور سے بند کیا۔

”تم عادل بھائی کو فون کرو کہ یہاں ڈرائیور بھیج دیں۔“ دانیہ اب زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔

سر پہ دوپٹہ چمائے دعائیں پڑھتی وہ پوری عالمہ فاضلہ نظر آ رہی تھی۔ اتنی مشکل صورت حال میں بھی اسے دیکھ کر رمل کی ہنسی چھوٹ گئی تب ہی ان کے قریب سے ایک لوکل وین سڑاپ سے گزری۔ رمل کا مدد کے لیے اٹھا ہاتھ ڈرائیور نے نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ وین میں دوسری جانب بیٹھا تھا۔ موٹر مڑتے ہی اس کی سمت بدلی اس نے یوں ہی سر گھمایا اور اس منظر کو دیکھتے ہی جیسے وہ ساکت سا رہ گیا۔ گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے آتی جاتی ٹریفک کو ہاتھ کے اشارے سے روکتی وہ رمل حسن ہی تھی.....

”بے وقوفی اس لڑکی پہ ختم ہوتی ہے۔“ اس نے ڈرائیور سے وین روکنے کے لیے کہا تھا۔

پانچ منٹ بعد وہ اس کے سامنے کھڑا اسے غصیلی نظروں سے گھور رہا تھا.....

”اتنے خطرناک راستوں پہ تجربہ کار ڈرائیوروں کے بھی ہوش ٹھکانے نہیں رہتے اور آپ

کی گاڑی تو میں نے ریگتی زیادہ چلتی کم ہی دیکھی ہے۔“ غصیلی نظروں کے باوجود اس کے چہرے پہ ایک محسوس کی جانے والی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر وہ مزید چڑ گئی۔

”نہ ہم نے آپ کو روکا نہ مدد مانگی۔ آپ خواہ مخواہ ہمارے باڈی گارڈ مت بنیں۔“ نہایت سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

وہ مزید کچھ بھی کہے بنا ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا تو اس نے بھی فرنٹ ڈور دھک دھک کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے کھولا تھا۔

گاڑی میں ایک نامانوس سی خوشبو نے اس کا استقبال کیا تھا جو سانس لینے کی صورت میں اندر تک اتر رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ آگے چڑھائی ہی چڑھائی تھی اور سڑک بھی کافی خراب تھی۔

بچے اب مطمئن ہوئے تو انہیں کھانے پینے کا دھیان آیا تھا مگر وہ اپنے دھیان کا کیا کرتی جو اس ریسکی سی مہک میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ اس طلسمی فسوں سے نکلنے کے لیے اچانک ہی پوچھ بیٹھی۔

”کیا آپ مقامی ہیں؟“ ان ڈھائی مہینوں میں یہ پہلا سوال تھا جو اس کی طرف سے کیا گیا تھا۔

وہ سن کر مبہم سا مسکرایا۔

”میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ایک مقام پہ نہیں نکلتے۔“ بڑا ہی انجان سا لہجہ تھا۔

”کیا مطلب۔“ وہ ششدر سی اس کی طرف رخ موڑ گئی۔

”مطلب ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح۔“ فقرہ ادھورا چھوڑ کر..... مسکرائی گنگنائی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ایویں ہی..... میرا شہر کہاں سے ہو گیا.....“ وہ اس کی نظروں سے کترا کر بولی تھی۔

موٹر مڑتے ہوئے گاڑی کے بریک چرچرائے تھے۔

”ارے..... رے آرام سے۔ دھیان سے چلائیں۔“ وہ حواس باختہ ہو کر بولی۔
 ”یہ راستہ ہی ایسا ہے۔ اچھے اچھوں کے جھکے چھوٹ جاتے ہیں۔“ اس نے رمل پہ نظر ڈال کر ذومعنی جملہ بولا تھا..... اس کا دل پورے وجود میں دھڑکنے لگا۔

”ان اچھے اچھوں میں ہمارا شمار نہیں ہوتا۔“ وہ سمجھ کر انجان سے لہجے میں بولی..... اور بیرونی منظر پہ نظر ٹکا کے دیکھنے لگی..... اس کے کان کی لوہ گہرا سیاہ قتل اس کی جانب سے رخ موڑنے کا بھید کھول رہا تھا..... اگرچہ اس قتل کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش دل میں کروٹیں لے رہی تھی مگر وہ ضبط کیے راستوں کی جانب متوجہ رہا۔

”آپ کو اور کچھ نہیں پوچھنا میرے بارے میں۔“ وہ خاصے توقف کے بعد گویا ہوا۔

”پہلے سوال کا جواب بڑا سیدھا دیا گیا تھا۔“ خاصا تپا، تپا لہجہ تھا۔

”دوسرا سوال تو کریں..... کچھ تو پوچھیں۔“ وہ بضد سا ہو کر کہہ رہا تھا۔

”مگر کیوں؟“ وہ بھی چڑ کر بولی۔
 ”وجہ آپ بخوبی جانتی ہیں۔“ انتہائی مدہم لہجے میں کہا گیا۔

رمل کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی..... اس کی ہتھیلیوں پہ جیسے بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برسی تھیں۔ پیچھے بچوں نے ایک ادمم مچا رکھا تھا ویسا ہی ادمم اس کی دھڑکنوں میں برپا تھا۔

شکر ہے وہ پتریا نہ پہنچ چکے تھے۔ اس نے اترنے میں لمحہ لگایا تھا۔ اس کی اس تجلّت پہ وہ محفوظ سا ہو کر ہنس دیا.....

بچے اور دانیہ تو خوب انجوائے کر رہے تھے مگر وہ دونوں ایک پراسرار سی خاموشی کے دائرے میں تھے۔ وہ جہاں بھی بیٹھتا اس کی جھکتی، اٹھتی پلکوں کو بے اختیار سیاہ دیکھے جاتا..... اور وہ اسے یکسر نظر انداز کر رہی تھی..... شیران نے بچوں کو ہارس رائیڈنگ بھی

کروائی اور رمل کے منع کرنے کے باوجود انہیں شام کے چھ بجے لہج بھی کروایا۔

”آپ نے ساری سیونگ بچوں پہ اڑادی۔“ وہ اسے اکیلا دیکھ کر اسی لکڑی کے بیچ پہ ذرا سے فاصلے پر بیٹھ گیا تھا.....

”ابھی پہلی تاریخ تو کافی دور ہے۔“ وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے پتا نہیں اسے کیا جتا رہی تھی۔

”آپ جیسی امیر و کبیر گورنمنٹ اگر پڑوسی ہو تو خالی جیب کا دکھ نہیں ہوتا۔“ وہ اس کی گردن سے لپٹی گھنگھریالی لٹوں کو بے خود سدا دیکھ کر بولا تھا۔

”اب پتا نہیں گجراتی ادھار کے معاملے میں کتنے فراخ دل ہوتے ہیں۔“ لہجہ انتہائی چھیڑنے والا تھا۔

وہ بھی ایک دم اس کی طرف مڑی۔
 ”ہم گجراتی فراخ دلی سے ادھار دیتے ضرور ہیں مگر وصولی کے معاملے میں مقررہ تاریخ یاد رکھتے ہیں۔“ جواباً شیران کا زندگی سے بھرپور تہقہہ اسے حیرت سے دوچار کر گیا۔

”جیب خالی ہو چکی ہے، اس لیے تو گھر جا رہا ہوں۔“ وہ سنجیدہ سا ہو کر بولا مگر اس کی گہری براؤن آنکھیں ہنوز ہنس رہی تھیں اور اس کیفیت میں اتنی اپنی اپنی سی لگیں کہ اب بے خود ہو کے دیکھنے کی باری اس کی تھی۔

”یہ آنکھیں کسی چہرے کو بھی اتنے انہماک سے دیکھ لیتیں تو ان کا دل بھی ریت جیسا ہونے لگتا۔“ اس کی نظروں کی گرفت میں مقید اپنی آنکھوں کو اک ساعت میں چھڑا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

”شام کافی گہری ہو رہی ہے، اب چلنا چاہیے۔“ وہ قدم بڑھا کر اس کے ہمراہ چلنے لگا۔

”رمل.....“ اس کا نام چھو کے لہجہ ایک دم مہکا تھا اور رمل کے پاؤں سے لپٹا تھا.....

”میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا..... مگر جانا چاہتا ہوں۔“ کنبھر لہجے میں وہ بہت کچھ کہہ

گیا تھا۔ اور گردن موڑ کر اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھنے لگا۔

”اکثر انجان رہنے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔“ وہ جھکی جھکی نظر سے کہہ کر تیز قدم اٹھائی آگے بڑھ گئی تھی.....

واپسی کا سفر گہری خاموشی میں کٹا۔ چپ نے ہی اس قدر شور مچایا ہوا تھا کہ ان دونوں کے وجود مجسم سماعت بن چکے تھے۔ گاڑی بڑا رنگ رنگیلا سفر کرتی اپنے مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ رانیہ اور بچے اتر گئے۔ وہ اترنے لگی تو شیران نے ہاتھ بڑھا کر لاگ پہ ہاتھ رکھ دیا، وہ اس کی حرکت پہ گنگ سی رہ گئی۔

”میں اپنا سوال دہراتا ہوں کہ میں آپ کو جانا چاہتا ہوں۔“ اس کے دھیمے لہجے میں جیسے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے ہاتھ لاگ پر سے ہٹا لیا تھا۔

”میں نے آپ کو جواب دیے دیا تھا۔“ اس کی آواز جیسے کسی گہری کھائی سے آئی تھی۔

”آپ کا چہرہ جواب کی تائید نہیں کر رہا تھا۔“ وہ جیسے بڑا محتاط ہو کر مسکرایا۔

”لگتا ہے، آپ چہروں کو بڑھینے کا اچھا خاصا تجربہ رکھتے ہیں۔“ لہجے کی کاٹ واضح تھی۔ ”مگر میں ایسی لڑکی نہیں ہوں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

اس نے گہرا سانس لے کر اسٹیرنگ پہ انگلیاں بجائی تھیں اور پھر ان پہ دونوں بازو جما کر مضبوط لہجے میں بولا۔

”اور اگر میں کہوں کہ دنیا میں ایک ہی لڑکی رمل نواز حسن ہے جسے میں جانا چاہتا ہوں تو.....“ وہ اپنے لہجے سے طلب کو جد نہیں کر پا رہا تھا۔

”میں سچ مان لوں تو بھی کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔“ اس نے دروازہ کھولا..... اس نے تیزی سے اسے روک دیا۔

”اگر میں خود راستے ڈھونڈتا تمہارے دروازے تک آ پہنچوں پھر.....؟“ وہ اسے عجیب سے دورا ہے پہ لے آیا۔

”میرے اور آپ کے درمیان بہت ڈیفرنس

ہے سو پلیز.....“ وہ ہنسی ہو کر دروازہ کھولنے لگی۔

”اسی طرح بار بار تمہارے دروازے تک آؤں گا۔ کوئی روک سکے گا نہ ہٹا سکے گا۔“

اس کا لہجہ اس قدر ہٹیل اور اٹل تھا کہ رمل کے جسم پہ ہزاروں چیونٹیاں سی ریگ گئیں۔ آخری سیڑھی تک وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس نے بند دروازے پہ دستک دینے سے قبل مڑ کر دیکھا تھا۔

اور دور سڑک پہ کھڑا ہونے والا یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ پیچھے رہ جانے والوں کو مڑ کے دیکھنا ایک اچھا استعارہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

کراچی آتے ہی باقر کی شادی کے ہنگامے اس کے منتظر تھے۔ ان ہنگامہ خیزیوں میں اس نے بھرپور شرکت کی تھی۔ آج ولیمہ کی تقریب تھی۔ فٹنشن رات کا تھا۔ شام کو اس کے ماں باپ بھی آگئے تھے۔

خضہ بیٹے کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا پا رہی تھیں۔

”ماشاء اللہ! لگتا ہے، مری کا موسم میرے بیٹے کو خوب راس آیا ہے۔“ وہ نظروں ہی نظروں میں اس کی بلا میں لے رہی تھیں۔

”اچھا! کیا پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گیا ہوں۔“ دل میں کھلے گلابوں کی خوشبو محسوس کر کے بڑی ہبکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا گیا۔

”اور کیا..... تمہارے چہرے پہ بڑی انوکھی سی چمک ہے۔“ وہ اب بھرپور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کس کے چہرے کی بات ہو رہی ہے۔“ جہانگیر نے اچانک آکر ان کی گفتگو کا سراپکڑا تھا۔

”میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔“ وہ نک سب سے تیار ماما پاپا پہ توصیفی نظر ڈال کر بولا تو وہ دونوں اس کے پیچھے ہی چل دیے۔

ولیمہ کی تقریب میرج ہال میں تھی، انہیں دور سے ہی آتا دیکھ کر باقران کی طرف بھاگا چلا آیا۔ وہ تینوں اس کی ہمراہی میں اسٹیج کی جانب آئے تھے۔

دلہن نے بھی اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا، کچھ بھی تھا وہ

جس میں تین چار گلے ہوئے سے کیلے تھے اس نے سیر اٹھا کر ریل کو بغور دیکھا اور بڑے شکستہ لہجے میں بولی تھی۔

”بی بی! اگر تم کسی کیس کے سلسلے میں آئی ہو تو واپسی کی راہ لو کیونکہ یہاں کسی غریب کی تو بالکل بھی نہیں سنی جاتی مگر تم مجھے حال چلے سے کسی کھاتے پیتے گھر کی لگ رہی ہو، شاید تمہارا کام بن جائے۔“ خود ہی سوال خود ہی جواب۔ رمل عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر تو اتر سے آنسو اس کے گال بھگونے لگے تھے۔ رمل کے دل پہ جیسے گھونسا سا پڑا تھا۔

”اماں! آپ ایسے کیوں رو رہی ہیں۔ کچھ بتائیں تو سہی۔“ وہ اس کے ساتھ ہی پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی، کچھ یوں کہ اس کی پشت عدالتی عمارت کی طرف تھی۔

”اب بتائیں، کیا مسئلہ ہے۔“ اس نے نرمی سے اس کا پتلا سوکھا سا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔“

”بیٹا! مسئلہ وہی عام سا ہے، جوان بیٹا روڈ ایکسڈنٹ میں چل بسا۔ کسی پراپرٹی بیچنے والے نے ہماری زمین کا قبضہ کسی اور کو دے دیا۔ اب وہ لوگ اس یہ مکان تعمیر کر رہے ہیں۔ دو سال ہو گئے ہیں اب تو گھر مکمل بھی ہو چکا اور کرائے پہ بھی چڑھا دیا گیا..... کوئی بیج صاحب ادھر نکلتا ہی نہیں، یہ تیسرا بیج صاحب کیس لڑ رہا ہے مگر فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا..... پتا نہیں یہ کب تک یہاں ٹھہریں گے، مجھے تو بات بنتی نظر نہیں آتی۔ اپنی روزی رونی سے کچھ بچا کر پیٹ کاٹ کر بسوں اور ویکنوں کے دھکے کھا کر پتا نہیں کیسی کیسی خواری کے بعد ہم لوگ آتے ہیں مگر یہ صاحب لوگ اس معاملے کو سمجھتے ہی نہیں، کہتے ہیں اگلی پیشی پہ آنا۔“

اس نے دونوں ہاتھوں کو ہوا کی طرف اچھالا تھا۔ پتا نہیں اس نے ہوا کو کیا سوچا تھا، رمل لرز کر رہ گئی..... اس نے اچانک جھرجھری سی لی۔

ان کے بیٹے کا جگری دوست تھا، وہ ان کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ باقر کی ماں نے بھی حصہ سے گلے مل کر خوش دلی سے مبارک باد وصول کی تھی۔ باقر نے مووی والے کو آواز دے کر بلایا۔

”یار! ادھر کدھر کیرے کی آنکھ سے جھانکتے پھر رہے ہو۔ یہ جو ہمارے ساتھ ہم سے زیادہ خوب صورت کپل بیٹھا ہے، فٹنٹ ان کی مووی بناؤ۔“ وہ شرارتی لہجے میں بولا تھا۔

”ہمیں بناؤ مت..... آج ہماری بہو ہی تمام مہمانوں سے زیادہ پیاری اور وی آئی پی ہے۔ مووی اسی کی بنے گی۔“

جہاگیر نے عنبر کے سر پہ محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”دہن کے ہونٹوں پہ بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ چلی ہوئی تھی۔“

☆☆☆

جھپکا گلی آج کل شدید اداسی کے گھرے میں تھی۔ دانیہ کے جانے کے بعد وہ اکیلی ہی سڑکیں ناچتی تھی۔ ابھی بھی ناشتے کے بعد چائے کا کپ لیے وہ لان میں چلی آئی۔ اسکول کی طرف سے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بے دھیانی میں ہی ریلنگ کی طرف چلی آئی۔

”تو کیا ساری اداسی اور خالی پن دانیہ کے جانے سے ہی ہے؟“ اس نے خود سے سوال کیا اور اپنے اندر کے جواب سے بچنے کے لیے وہ تیز تیز قدموں سے لاؤنج میں چلی آئی.....

”بھابی! میں فدا اوپر تک جا رہی ہوں۔“ اس نے بیڈ روم میں جھانک کر انہیں اطلاع دی۔ عفرہ کپڑے تہہ کر کے الماری میں رکھ رہی تھی، مڑ کے اس کی طرف دیکھا۔

”ضرور جاؤ مگر اپنا سیل فون ساتھ لے جانا۔“ اس نے تاکید لہجے میں کہا تو وہ سر ہلاتی مڑ گئی۔ اس نے پہلی میڑھی پہ قدم رکھتے ہی اوپر بیٹھی ایک آنسو پوچھتی عورت کو دیکھ لیا تھا۔ قریب پہنچنے پر وہ اس کے پاس رک گئی تھی۔ اس عورت کے پاس ایک شاپر تھا

”اماں! آپ مجھے اپنا اور بیٹے کا نام بتائیں۔
میں آپ کے لیے ضرور کچھ کروں گی۔“ رمل کا لہجہ کسی
انہونے درد سے کپکپا گیا تھا۔

کوئی ہواؤں سے لپٹا دکھ اس کے وجود پہ اتر آیا
تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے ہزار ہزار کے چند نوٹ
نکالے اور اس عورت کے ہاتھ پہ رکھ کر مٹھی بند کر دی
تھی۔ اس عورت نے حیرت اور تشکر کے ملے جلے
احساس کے ساتھ نم آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

”جیتی رہو۔ سدا سکھی رہو۔“ اس کی دعا نے
رمل کی دھڑکنوں کو نئے سرے سے توانائی بخشی تھی۔

اس کے جانے کے بعد وہ سوچ رہی تھی۔
”پتا نہیں کتنے مجبور اور بے بس لوگ کہاں کہاں
سے ناامید ہو کر جب واپسی کی راہ پکڑتے ہوں گے تو
ان کی ماپوس مسافت زدہ ایڑیوں سے دکھ بہہ بہہ کر
راستے بھگوتے جاتے ہوں گے۔“ اس نے پانی سے
بھری آنکھوں کو اچھی طرح مسلا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں گھری خاموشی سے
سیڑھیاں اترتی گھر تک چلی آئی اور بالکل گرنے
والے انداز میں صوفے پہ ڈھے سی گئی۔

”کیا ہوا؟“ عفرانے جونی وی دیکھ رہی تھی
گھبرا کر اس کا دھواں دھواں چہرہ دیکھا۔

”گھر میں سب خیریت تو ہے نا.....“ وہ اس کا
تغ ٹھنڈا ہاتھ پکڑ کر پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، گھر میں سب ٹھیک ہے۔ سب کو اپنے
اپنے گھر کی فکر ہے۔ ملک جائے بھاڑ میں۔“ اس نے
اپنا جملہ ایک باہمت مسافر کی طرح آگے بڑھایا تھا
جس کے پاس زاد سفر نہیں ہوتا..... اس کے جواب پہ
عفرانے گہرا سانس لیا تھا۔

وہ اکثر عادل اور رمل کی بحث سنتی رہتی تھی۔ رمل
کو حب الوطنی کے دورے اکثر پڑتے رہتے تھے۔

”جب ہم سب اپنے اپنے حصے کا کام اپنی ذمہ
داری سمجھ کر کریں گے تب عفرانے عادل نواز پاکستان
میں تبدیلی آئے گی۔“ عادل نے اندر آتے آتے
بھی اس کی دھواں دھار تقریر اچھی خاصی سن لی تھی۔

”اور معاف کیجیے گا۔ ملک کی ابتری میں ججز
حضرات نے بڑا فراخ دلانہ کردار ادا کیا ہوا ہے.....“
بھائی پہ نظر پڑتے ہی وہ اپنے اصل موضوع کی طرف
آئی تھی۔

”کچھ ہاتھ ہولار کھو جو کچھ پکتا ہے بے چارے
ججز سیدھے ہاتھ سے کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے
ہیں۔“ وہ بات کو مزاح کا رنگ دے کر اس کے ساتھ
ہی بیٹھ گیا۔

”ہاں اگر آپ غریب حضرات نہ سکتے تو
صورت حال مختلف ہوتی۔“ وہ سیدھا اس کی آنکھوں
میں دیکھ کر بولی تھی۔ وہ اس کے اتنے شدید انداز پہ
ایک دم سنجیدہ ہوا۔

”سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

”ٹھیک ہے، سب نہیں ہوتے مگر خربوزے کو
دیکھ کے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ کچھ سینئر اپنے جونیوز
کو اس کنویں کے کنارے لے جانے پہ مجبور ضرور کر
دیتے ہیں کہ ہم تو ڈو بے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں
گے۔“ وہ استہزائیہ ہو کر کہتی۔

”آپ بجا فرماتی ہیں مگر ہمارے صنم کو ہوا کیا
ہے۔“ وہ جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا تھا..... اور رمل
نے آج کا تمام ماجرا اسے کہہ سنایا..... جسے سننے کے
بعد وہ حتی الامکان اپنا لہجہ نرم اور دھیمہ کر کے بولا تھا۔
”وہ بوڑھی عورت وکیل نہیں کرتی..... سرکاری
وکیل بھی ہار نہیں کرتی۔“

”تو کیوں کرے۔ اسلام میں وکیل کا تصور ہی
نہیں، پوری اسلامک ہسٹری کھنگال لیں جو کسی وکیل
کا ذکر تک ہو..... فیصلہ سنانے کا طریقہ کاریہ ہے کہ
جج دونوں حضرات کی روداد سننے پھر گواہ طلب کرے
پھر اپنی عقل و فہم کے مطابق فیصلہ کرے تو وکیل کا کام
کہاں پر ہے۔“

عادل اور عفرانے دونوں کی آنکھیں حیرت سے دا
تھیں۔ عادل کے کانوں میں اس کا لہجہ کوڑے برسا
رہا تھا۔ پھر بھی اسے کچھ تو بولنا تھا۔

”یہ قانونی طور پہ ہوتا ہے۔“

یہ قانون انگریز کا بنایا ہوا ہے اور انگریز اسلام کی اہمیت سے نا بلند تھے۔ وہ انتہائی درستی سے بولی۔ ”انگریز کے بنائے کتنے قانون ہم نے توڑے ہیں تو یہ کیوں اب تک مسلط ہے۔ بے چارے کتنے غریب لوگ وکیل اور ڈی ہی نہیں کر سکتے۔“

”واہ بھئی واہ! میں تو ریل کو لایا ابلی سی سوچ کا سمجھتا تھا جو کبھی کبھی علامہ بھی بن جاتی ہے مگر آج تو میں حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہوں۔“ اس نے تیرنے کے سے انداز میں ہاتھ پاؤں مارے تھے کہ ریل کو نہ جاتے ہوئے بھی ہنسنا پڑا۔

”بس بھائی! مجھے ایک ماہ کے اندر اس عورت کے حق میں فیصلہ چاہیے۔“ وہ پر زور لہجے میں بولی تھی۔ ”اللہ کے بعد انصاف کی ذمہ داری آپ پر ہے زندگی اور موت کے فیصلے کے درمیان ایک لمحہ۔ مظلوم کی ہار اور جیت کے بیچ ایک بل.....“

کبھی سوچے گا کہ ایک حج کو اللہ نے کیا درجہ دیا ہے، کسی کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے منصب پہ آپ فائز ہیں۔ بل صراط پہ چلنے کی گھڑی آپ کی جانب میں کانٹوں کا سفر ہے، ہمیر کا سودا کسی صورت بھی ممکن نہیں، اللہ کو حاضر ناظر جان کر فیصلہ کیا کریں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔“

اس کے لہجے کی کچی نے عادل کی زبان جیسے بند کر دی تھی۔ وہ وہاں سے جاتی ہوئی ریل کو روک بھی نہیں سکا تھا اور عفریہ کے چہرے پہ بھی فکر کی کتنی ہی لکیریں جال بن چکی تھیں۔

جب بد عاقل سے ڈر لگنے لگے تو گنہگاروں کو ضمیر زندہ رکھنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

”لگتا ہے، آج ہمارے سیاح صاحب نے سالوں کی نیند پوری کی ہے۔“ وہ شاور لے کر کمرے میں آیا تو شانزہ بڑے اسٹاکش سے انداز میں صوفے پہ آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ شیزان نے اسے ناگواری سے دیکھا اور بہ عجلت شرٹ پہنی۔

”اس طرح کسی کے بیڈ روم میں گھسنا کہاں

کے میسرز ہیں۔“ وہ چاہ کر بھی لہجہ ہموار نہیں کر سکا۔ ”کم آن..... ڈارلنگ!“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ وہ اس قدر بے ہودہ لباس میں تھی کہ شیران نظر نہیں اٹھا پایا۔

”تم نیچے جا کر بیٹھو، میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔“ وہ اس کے سامنے سے ہٹ کر ڈریسنگ میبل کے سامنے آ گیا۔ اب وہ بالوں میں برش کر رہا تھا۔ وہ اس کے عقب سے جھانکنے لگی پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا کہ بے اختیار ہو گئی۔

”آئی لو یو شیران.....“ دوسرے ہی لمحے شیران کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

یہ شانزہ کے ساتھ پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا مگر پہلے شیران کے انداز میں اس کے لیے اس قدر حقارت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کے پیچھے باہر کی جانب پسلی۔ وہ لاؤنج میں جانے کے بجائے کچن میں چلا آیا۔

”زیو! مجھے فنانٹ گرما گرم چائے کے دو کپ چاہئیں۔“ اس نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے مستعدی سے ہاتھ چلاتی زیو کو دیکھا۔

”شیران بھائی! آپ جا کر آرام سے بیٹھیں، میں پانچ منٹ میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ وہ تکتش فرائی کر رہی تھی۔

”ویسے بھائی! اب آپ شادی کر ہی لیں۔“ اس شانزہ جیسی مصیبت سے تو جان چھوٹے گی۔ اس کے باہر کی جانب بڑھتے قدم جیسے تھم سے گئے تھے۔ وہ فوراً مڑا اور دھیان سے زیو کا چہرہ دیکھا۔

پھر اس کے پاس آ کر پوچھنے لگا۔ ”تو تمہارے خیال میں مجھے کس طرح کی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے۔“ وہ اب اس کے جواب کا منتظر تھا۔

”بھائی! اس طرح کی ہو کہ جس کو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ ہو جو خود کو نمایاں نہ کرے جسے دیکھ کر شرم سے نظریں نہ جھکیں۔“ وہ پتا نہیں کب کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ کسی کی شبیہ نے تصور میں آ کر دل میں بے چینی سی بھر دی تھی۔ وہ اپنے آپ ہی مسکرا دیا، زیو

کے خیال سے کیوں الجھ سا جاتا ہے، وہ سامنے پگڈنڈی پہ پتا نہیں کس کے نقش پا دیکھ رہی تھی۔ جانے کس سمت کا مسافر تھا اور مجھے کیوں جاننا چاہتا تھا۔

نے مڑ کے تعجب سے اسے مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہ لاؤنج کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ”محبت کے موسم دھند کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک دم ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینے والے اور پھر اچانک گم ہو جانے والے تو کیا اس کے اندر سے کوئی موسم گم ہو جائے گا۔ فی الحال وہ یہ سوال خود سے کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ جھیر کا گلی پہ اترنے والی کتنی ہی جھیں اور کتنی ہی شاہیں ہمیں یاد کریں گی۔“

ان لفظوں پہ اس کے اندر بڑی بھیگی سی رت اتری تھی اور اس کے لب بلاوجہ ہی پل بھر کو مسکرائے تھے۔

☆☆☆

پیٹری علاقوں میں اوائل ستمبر کی راتیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔ یہ بھی پی سی بھور بن میں اترنے والی ایک ایسی ہی خنک رات تھی پورا چاند آسمان کے عین وسط میں تھا۔ ہوا کسی اپنے سے چہرے کو چھو کے آتی اور اس کے رخساروں پہ وہ لمس ثبت کر کے بھیگ جاتی۔ وہ اپنے قریب بیٹھی نینی کو یکسر بھول چکی تھی۔ شاید خود کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ اس کے عین سامنے وہ چہرہ تھا جسے دیکھنے کی وہ چکور کی طرح تمنائی تھی۔

وصل کی شب اور اتنی کالی۔

ان آنکھوں میں کا جل ہوگا

غزل کے بول شیران کے دل کی ترجمانی کر رہے تھے۔

”تمہاری کجبراری پلکوں پہ میں کیا فدا کروں۔“ ایک تمنا سرگوشی کی صورت اس کے لبوں سے ابھری۔ اس کی آنکھوں نے خم دار پلکوں کو نرمی سے چھوا تھا۔ اور محبت نے جادو کی چھڑی گھما کر تمام منظر بدل دیا تھا۔

”پیار کی راہ پہ چلنے والو۔“

”کچھ دن تو تمہاری بوری ختم ہو جائے گی کیونکہ تارا آیا اور نینی کل آرہی ہیں۔“ عفرانے سبزیوں کی باسکٹ نیل پہ رکھتے ہوئے بے زاری سے بیٹھی رمل کو دیکھ کر کہا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ وہ اپنی بھابی کا دل رکھنے کے لیے ذرا سا مسکرائی۔

”اتنی ڈھیر ساری سبزیوں کا کیا کرنا ہے۔“ اس نے دھلی ہوئی سرخ گاجر کو اٹھا کر کھانا شروع کر دیا تھا۔

”آج تمہارے بھائی کی فرمائش پہ چائیز پلاؤ بنا رہی ہوں۔“

”کیا.....“ وہ ایک دم تیز لہجے میں بولی۔ ”اس حالت میں بھی آپ سے کام کروا رہے ہیں۔ یہ شوہر بھی نا۔“ وہ ایک گے بعد ایک سبزی اٹھا کے کھا رہی تھی۔

”بھابی! کل امی کہہ رہی تھیں کہ اب آپ لوگ واپس آ جائیں کیونکہ یہ لاسٹ منٹھ چل رہا ہے تو اللہ کے کاموں کا کیا پتا۔“

”ہاں! کل میری بھی ان سے بات ہوئی تھی۔ میں تمہیں بتانے ہی والی تھی اگر تم نے بھی شاپنگ وغیرہ کرنی ہے تو کر لو کیونکہ دو چار دنوں بعد تارا آ پاپا کے ساتھ ہی ہم لوگوں نے بھی نکل جانا ہے۔“

رمل کے دل نے پتا نہیں کتنی دھڑکنیں مس کی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں جھیر کا گلی کی تمام دھند بھر گئی۔ ایک دم ہی کھانس کر اس نے چہرے کا تاثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

”اوہو کیا ہوا؟ تم بھی نہ کچرا مشین کی طرح سبزیاں ٹھونسنے جا رہی ہو۔ چلو اٹھو، دو گھونٹ پانی پیو۔“ عفرانے اس کی پیٹھ پھکی۔ وہ گلاس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر باہر لان میں ہی چلی آئی۔ نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپ کا کوئی قصہ پھر دل اس

اندھیرے جنگل میں بھٹک رہی تھیں۔ نہ وہ تھی نہ بادل تھا۔
جنگل کا رقص ختم چکا تھا۔

☆☆☆

جانے والے جھیکا گلی سے خوشی اور محبت کے تمام رنگ اپنے ساتھ ہی سمیٹ کر لے گئے تھے۔
آج بادلوں کا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔ درختوں کی چوٹیوں پہ محبت کے روشن دیے ٹٹمنا تک بھول چکے تھے۔ شہر تو ویسے ہی آباد تھے دلوں میں بسنے والے بھی دل میں موجود تھے پھر دھند کے اڑتے بگولے کسے ڈھونڈ رہے تھے اور وہ خود ان بگولوں کے ساتھ کسے ڈھونڈ رہا تھا۔

اسے دوسرے دن پتا چل گیا تھا کہ دو ماہ کی چھٹیوں میں جج صاحب لاہور چلے گئے ہیں۔ آج اس بات کو بھی ہفتہ ہو گیا تھا۔ وہ اس سے رابطہ کرنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس اس کا فون نمبر بھی نہیں تھا۔ یونہی اسے سوچتے ہوئے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔
جس دن وہ بچوں کا ایڈمیشن کروانے آئی تھیں تو اس نے دانیہ کا نمبر لیا تھا کہ اگر بچوں کے ساتھ کوئی مسئلہ وغیرہ ہو تو رابطے کی صورت ہونی چاہیے۔ وہ نمبر ایڈمیشن رجسٹر میں تھا اور چند منٹوں کے بعد اس کے سیل فون کی فہرست میں آچکا تھا۔
رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ اس کا نمبر دل کی انگلیوں سے مل رہا تھا تیسری نیل پہ فون ریسیو کر لیا گیا۔

”ہیلو۔“ اس کی نیند میں ڈوبی آواز مردہ تنوں میں جان ڈالنے جیسی تھی۔ وہ خاموش رہ گیا۔
”کون؟“ اصرار سے پوچھا گیا۔

”میری نیندیں چرا کر تم کیسے سو سکتی ہو۔“ اس کا بھاری ہوتا لہجہ نیند بھٹک سے اڑا گیا۔ رمل کے جسم پر جیسے ہزاروں چیونٹیاں ریگ گئی تھیں۔

”میری بات سننے بغیر تم وہاں سے کیسے آ سکتی تھیں۔“ اب نرمی اس کے لہجے سے مفقود تھی۔
”آپ نے میرا نمبر کہاں سے لیا۔“ وہ ہلکی

راستہ سارا دلیل ہوگا
رمل نے ان آنکھوں کی ساری خوشبو چرا کر خود میں بھر لی۔ اچانک خوشبو لٹاتے ان ہیولوں نے ان دونوں کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ شیران نے تصور میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے ہمراہ کر لیا۔

سارے منظر پہلے جیسے تھے اگر آنکھیں اس چہرے سے ہٹیں تو بے وفائی کی سزا جانے کب تک بھٹکتیں..... وہ ایک مدھری مسکان ہونٹوں پہ دھر کر آنکھوں کو دان کرنا چاہتا تھا۔

اسی لمحے اس کی دوست نے اپنا سفید عریاں بازو اس کے شانوں کے گرد پھیلایا۔ وہ اچانک اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ چکی تھی۔

”وے میں چوری چوری تیرے نال لالیاں اکھاں“

اس نے رمل کا چہرہ تاریک ہوتے دیکھا تھا، اس لمحے اسے اندازہ ہوا کہ شمعیں کس طرح بجھتی ہیں۔

وہ اس قدر ساکت بیٹھا رہ گیا کہ سوزی کا بازو اپنے شانوں سے ہٹا ہی نہ پایا تب ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ وہ جیسے کسی خواب سے چونکا تھا۔ وہ میوزک کنسرٹ مانگی حالت میں تھا۔ شیران کو اس کے وہاں سے جاتے ہی ایسا لگا تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہی لپکا تھا۔ وہ لمحوں میں ہی غائب ہو چکی تھی۔

آج مری آتے ہوئے اس کے چند دوست بھی ساتھ آئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔ اسے آج رات یہیں ٹھہرنا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں رمل بھی ہو سکتی ہے مگر اسے یوں اچانک سامنے پا کر وہ اندر تک شانت ہو گیا تھا۔
اب اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سوزی کا گلا گھونٹ دے۔

وہ دکھ اور غصے سے پیر پختا کمرے میں آ گیا تھا۔ آج بڑے بڑے خود سے انداز میں اس کے وجود میں وہ اپنی محبت دیکھ پایا تھا۔ پتا نہیں وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔ اس کی سوچیں گھپ

”آئندہ کی کچھ لگتی..... تم ذرا منگنی کر کے دکھاؤ

تمہارے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔“ وہ لب بھینچ کر غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔
”کیوں اب نیچر کے بجائے ادب کے عہد سے یہ فائر ہو چکے ہو۔“ اس کی دھمکی سن کر وہ بھی تپ گئی تھی۔

”نہیں، میں اب بھی جھیر کا گلی کے مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں، جسے ایڈمنسٹریشنل منیجر صاحب کی بہن الو بنا کر گجرات میں چھپی بیٹھی ہے۔“ بڑے دھیرج سے کہتا وہ اسے بھڑکا رہا تھا اور وہ بھڑک بھی گئی۔

”میں ایسا کچھ بھی نہیں کر کے آئی کہ مجھے چھپ کے بیٹھنا پڑے اور جھیر کا گلی کا ماسٹر جا کر لوڑ ٹوپہ سے اپنے لیے لڑکی ڈھونڈے یہی اس کے حق میں بہتر ہوگا کیونکہ گجرات کی ریل نواز حسن کا خواب دیکھنا بھی اس کے لیے ناممکنات میں سے ہے۔“ سرد لہجے میں کہتی وہ اس کے دماغ کے سارے پیچ ڈھیلے کر گئی تھی۔

”یہ تمہاری بھول ہے۔“ وہ پر غرور سا ہو کر ہنسا تھا۔

”میں تمہارے لیے پوری دنیا کو الٹ پلٹ کر رکھ دوں گا گجرات کی خرگوشی۔“ فون اچانک ہی کٹ گیا تھا۔ ریل کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

”یہ کیا بلا ہے۔“ گہرے گہرے سانس لیتی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”ایسا کیا ہے مجھ میں کہ تم میرے لیے دنیا ہی تمہیں نہیں کر دو۔“

اس شام نینی اور اس کا میوزک کنسرٹ دیکھنے کا پروگرام سیٹ ہوا تھا۔ وہ لوگ جب وہاں پہنچیں تو شیران کو سامنے پا کر وہ دم بخود رہ گئی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے جذبے اس پہ آشکار کر بیٹھی تھی۔ اس لڑکی کا بونے نکلنے سے اسے چھوٹا سا ناگوار گزرا تھا سو وہ محفل چھوڑ کے چلی آئی تھی۔ وہ اس کے ہائی فائی سوئیڈ بونڈ دوست دیکھ کر شش و پنج میں تھی کہ شیران آخر کیا تھی ہے جو سلجھ ہی نہیں رہی اور اب ایک مرتبہ پھر وہ بری طرح الجھ کر رہ گئی۔ یہ اتنے بڑے بڑے

آواز میں کچھ محتاط سی ہو کر بولی۔

”یہ بات پھر بھی کریں گے پہلے میری بات سنو۔“ وہ ذہن میں مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہا تھا اس لیے ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”اس رات میوزک کنسرٹ میں جو کچھ تم نے دیکھا، وہ سچ نہیں تھا۔ وہ میرے دوست کی گرل فرینڈ ہے۔ اس کی کلاس میں کسی بھی مرد سے فری ہوا جاسکتا ہے۔“

”اور تمہاری کلاس میں کیا ہوتا ہے۔“ سوال انتہائی سرد مہری سے کیا گیا۔ کچھ ساعتیں خاموشی کی نذر ہوئیں۔

”ایک دو ماہ میں میرے گھر سے تمہارا پروپوزل آئے گا تو میری کلاس میں جو ہوتا ہے، تمہیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا تھا۔ ہزار دو ہزار پانچ ہزار پتا نہیں کتنے والٹ کا کرنٹ لگا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے بے ساختہ اچھلی تھی۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ..... ایسا سوچنے کی بھی بے وقوفی مت کیجیے گا۔ آپ کی وضاحت میں نے نا صرف سن لی ہے بلکہ یقین بھی کر لیا ہے لہذا آئندہ مجھے فون مت کیجیے گا۔“ وہ اپنے حواس بحال کر کے دھیرے سے بولی تھی۔

”میں نے بھی آپ کی بات تحمل سے سنی ہے۔ آپ مجھے روک نہیں سکتیں، اب تو زندگی آپ کے ساتھ ہی گزرے گی تب.....“

”اوشٹ اپ.....“ وہ اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولی۔ ”میرے اور آپ کے اسٹیشن میں بہت فرق ہے، ہم دونوں کا صرف تماشا بنے گا۔ حاصل وصول کچھ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی چند روز تک میری منگنی ہونے والی ہے۔“

کمرے کی چھت نہیں ساتوں آسمان اس کے اوپر گرے تھے، اب اچھلنے کی باری شیران کی تھی۔

”تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟“ غصے سے اس کا دماغ کھول گیا۔

”آئندہ فون مت.....“

دعوے کس بنیاد پہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

دو ہفتے بعد اس کا یوں اچانک کراچی چلے آنا سب کو ٹھنکا گیا تھا مگر وہ تھا ہی اتنا موڈی کہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے تھے، دوسری رات ڈنر کے بعد یہ عقدہ بھی کھل ہی گیا۔

”میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے مماء، پاپا حیرت اور خوشی سے کچھ دیر تو گنگ سے اسے دیکھتے رہ گئے پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

”تو اچانک آنے کی وجہ یہ تھی۔“ جہانگیر نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھا۔

”اب اس خوش نصیب کا نام بھی بتا دو۔“ خوشی حفسہ کے چہرے اور لہجے سے کھل رہی تھی۔

”رمل نواز حسن!“ نام بتا کر وہ پورا کا پورا ماں باپ کی طرف متوجہ تھا۔

”ہوں۔“ جہانگیر کسی گہرے دھیان سے چونک کر بولے تھے۔

”اور پروپوزل لے کر ہمیں کس صوبے کی طرف جانا ہوگا؟“

”گجرات۔“ وہ باپ کے اس قدر صحیح انداز سے پر حیران تھا۔

”تم اس لڑکی سے کہاں ملے ہو۔“

”ملا نہیں ہوں..... بس دیکھا ہے، میرا دوست ہے عادل نواز، اس کی بہن ہے۔“

”شیران یہ سیر و تفریح نہیں ہے زندگی بھر کا معاملہ ہے، اچھی طرح صوچ لو۔“ حفسہ نے اب نرمی سے کہا تھا۔

”میں سوچ کر کیا کروں گا مماء..... کیونکہ یہ میرے دل کا فیصلہ ہے۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں پہ نظر ٹکا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا..... کئی ثانیے وہ دونوں چپ سے ہو گئے جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔

جہانگیر نے ہی خاموشی کو توڑا تھا۔ ”ٹھیک ہے تم اپنے دوست سے اپنے پروپوزل کا ذکر کرو پھر وہ جو بھی

دن یا تاریخ کہے ہم چلے جائیں گے۔“ شیران نے نوٹ کیا کہ اس کے باپ کے لہجے میں بٹاشت غائب تھی۔

”تھینک یو پاپا اینڈ ماما!“ اس کے اندر ایک سکون سا اثر آیا تھا۔

”صبح بات ہوگی۔ گڈ نائٹ!“ کہتا وہ اٹھ کر چلا گیا۔ حفسہ اپنے شوہر کی طرف گھومی تھیں۔

”آپ کو اسے سمجھانا چاہیے تھا۔“

”اور وہ سمجھ جاتا۔“ جہانگیر نے ماتھے پہ کئی بل ڈال کر خاصے درشت لہجے میں کہا۔

”تمہارا اکلوتا بیٹا کسی سے عشق کر بیٹھا ہے، مائی سویٹ ہارٹ! فی الحال وہ کچھ بھی سمجھنے کے موڈ میں نہیں۔ پروپوزل لے کر جاتے ہیں، دیکھتے ہیں، وہ لوگ کیا رسپانس دیتے ہیں۔“ جہانگیر کی باتوں میں نفرت تھا۔

”وہ تو فوراً ہاں کر دیں گے۔“ حفسہ نے ہاتھوں پہ کریم لگاتے ہوئے نخوت سے کہا تھا۔

”یہی تو تمہاری بھول ہے.....“ وہ جیسے پاتال سے بولے تھے۔

”کیا مطلب، وہ ہمیں یعنی شیران جہانگیر کا پروپوزل ٹھکرا سکتے ہیں؟“ ان کے چہرے پہ حیرت در آئی تھی۔

”آف کورس ٹھکرا سکتے ہیں.....“ جہانگیر نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

”یہ زمین دار لوگ بڑے روایت پسند قسم کے ہوتے ہیں خصوصاً بیٹیوں کے معاملے میں اگر انہوں نے انکار کر دیا تو سوچو بیٹے کو کیسے بہلاؤ گی۔“

حفسہ کا دل پہلی مرتبہ ان دیکھے خدشات سے دھڑکا تھا۔

☆☆☆

وڈی حویلی میں عادل کے بیٹے کی رسم عقیقہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حویلی کو نئے سرے سے رنگ و روغن کرایا گیا تھا۔ اب نئے اور پرانے فرنیچر کی سیننگ کا مرحلہ جاری تھا۔ رمل بھتیجے کو گود میں اٹھائے

کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ناشتے کے بعد عادل نے چائے کا کپ اٹھایا ہی تھا کہ اس کے

موبائل پہ کال آئی۔

تازہ ترین خبروں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا.....
 خصوصی ٹینشن یہ تھا کہ عقیقے کے بکرے آچکے ہیں.....
 تمام مہمانوں کو دو دن بعد کا بلا بھی بھیجا جا چکا ہے اور
 آج سہ پہر کو عادل صاحب کے دوست کی ٹیمپلی
 کراچی سے آرہی ہے۔ آخری خبر یہ اس کا ماتھا ٹھنکا
 تھا۔ دل میں اٹھتے وسوسوں کو اس نے بمشکل دبایا تھا۔
 ”اچھا یک یک چھوڑو، مجھے اسٹرونگ سی
 چائے چاہیے۔“ وہ صحن میں ہی بچھے تخت پہ بیٹھ گئی
 اسے اپنی ماں کی مصروفیت میں ایک نیا پن سا نظر آ رہا
 تھا وہ جو بنی اس کے پاس سے گزریں تو رمل نے ان کا
 ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

”امی! کیا بات ہے، آپ اتنا دھیان سے گھر
 صاف کروا رہی ہیں۔“ لہجہ لا پرواہی رکھا۔
 ”عادل کے جاننے والے ہیں۔ ان کی فیملی
 آرہی ہے۔“

”تو ان کو عقیقے پہ ہی انوائیٹ کر لیتے۔“ ماں
 کے چہرے پہ نظر جما کر مشورے سے نوازا۔
 ”اور تم بھی اپنا حلیہ کچھ درست کر لو، وہ لوگ
 تمہارے رشتے کی بات کرنے آرہے ہیں۔“ اس کی
 رگوں میں خون کی جگہ جیسے جاڑا بھر دیا گیا تھا۔
 چائے پکڑ کر وہ مرے مرے قدموں سے اپنے
 کمرے میں آ گئی تھی۔

”تو یہ تمہارا ہی پروپوزل ہے۔“ وہ مٹھیوں کو بند
 کرتی اضطرابی حالت میں کھولتی مسلسل ہونٹ کاٹ
 رہی تھی اور جب انکار کیا جائے گا تو وہ کیا کر سکتا ہے۔
 یہ سوچ سوچ کر ہی اسے ہول اٹھ رہے تھے جو شخص آنا
 فانا رشتہ بھیج سکتا ہے تو خود کو رد کیے جانے پر اس کا
 رد عمل بھی فوری ہی ہوگا۔

☆☆☆

وہ عفرائیک کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔
 سامنے بڑے وقار اور اپنی اپنی جگہ دونوں ہی انتہائی
 خوب صورت مرد اور عورت نہایت مہذب انداز میں
 بیٹھے تھے۔ اس نے بھی دھیمے سے انداز میں انہیں سلام
 کیا جس کا جواب بے حد شائستہ لہجے میں دیا گیا تھا۔

”سنائیں! سر آپ کا ایڈونچر کہاں تک پہنچا؟“
 وہ خوش گوار سے موڈ میں فون سنتا ذرا فاصلے پر چلا گیا،
 ایڈونچر کا ذکر سن کر وہ اپنے دھیان سے چونکی تھی۔
 عادل کا کہا جملہ اس نے زیر لب دہرایا تھا، پتا نہیں
 کیوں مگر اس کی تمام توجہ عادل کو آنے والی کال نے
 اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ دوبارہ
 اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی
 اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

”بھائی! آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو چکی ہے۔“
 عادل نے اس کی بات سن کر ایک نا سمجھ میں آنے
 والی نظر اس پر ڈالی تھی کہ رمل اندر تک کانپ گئی۔
 ”میں آپ کے لیے دوسری چائے لاتی
 ہوں۔“ وہ چھوٹو کو اس کی گود میں دے کر ٹھنڈی چائے
 اٹھالے گئی تھی۔

جاتے جاتے چور نظر سے بھائی کو دیکھا جس کا
 چہرہ سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جب وہ تازہ چائے
 بنا کر لائی تو عادل اور امی کو آپس میں سر جوڑے باتیں
 کرتے دیکھ کر مزید الجھ سی گئی۔

”یا اللہ! کیا معاملہ ہے، پہلے تو ماں بیٹے میں
 راز و نیاز نہیں ہوتے تھے۔“ وہ ہلکا سا کھنکھاری۔
 ”بھائی! لیجیے گرم چائے۔“ عادل نے شکریہ
 کے ساتھ کپ پکڑتے ہوئے سرسری سا اسے دیکھا
 اب اس کے چہرے پہ کسی سوچ کا شائبہ نہیں تھا بلکہ
 بڑی آسودہ سی مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی کہ جیسے مسئلے کا
 حل نکلنے کے بعد والی کیفیت ہوتی ہے۔
 امی بھی کافی پرسکون سی ہو کر پوتے سے باتیں
 کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

”پتا نہیں میں کس مصیبت میں پھنس گئی
 ہوں۔“ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس
 کا موڈ عجیب چڑچڑاسا ہو رہا تھا۔

☆☆☆

رات دیر سے سوئی تو صبح آنکھ بھی لیٹ ہی
 کھلی..... کمرے سے باہر آتے ہی تاجی نے اسے

رمل کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں پسندیدگی کے اثرات ابھرے تھے۔

وہ دونوں اپنی شخصیت اور انتہائی قیمتی ملبوسات میں ایک امیر و کبیر خیملی سے لگ رہے تھے۔ کہیں سے بھی ایک گورنمنٹ ٹیچر کے والدین نہیں ظاہر ہوتے تھے ان کے چہروں کے خدو خال شیران سے مماثلت رکھتے تھے۔

کچھ دیر بعد عفر کے اشارے پر وہ معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی تھی کیونکہ نواز حسن گھر آ چکے تھے اور تھوڑی دیر بعد مہمانوں سے کافی کھل کر بات چیت کر رہے تھے۔

باتوں کے دوران جب انہوں نے اصل مدعا بیان کیا تو نواز حسن نے ان دونوں کی طرف یوں دیکھا جیسے ان کی ذہنی حالت پر شک کر رہے ہوں پھر جیسے تیسے خود کو نارمل رکھتے ہوئے بڑے محل سے جواب دیا۔

”میری ایک ہی بیٹی ہے اور میں اسے اپنوں میں بیاہنا چاہتا ہوں، اتنی دور اسے بھیجنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ معذرت کے ساتھ ہماری طرف سے انکار ہی سمجھیں۔“ وہاں موجود تمام افراد جیسے گنگ رہ گئے تھے۔ نہ سوچنے کی زحمت نہ انکار کی کوئی ٹھوس وجہ۔

”وہ تو آپ ٹھیک فرما رہے ہیں، اپنوں کا پہلا حق ہوتا ہے مگر دوری کی بات بڑی عجیب سی لگ رہی ہے کیونکہ اب تو بائی ایئر سفر ہوتا ہے۔“ جہانگیر کا لہجہ اصرار سے بھرا تھا کہ میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔

”آپ خوب سوچ سمجھ کر گھر میں صلاح مشورہ کر کے جواب دیجیے گا۔ ہم پھر بھی آنا چاہیں گے۔“ وہ بڑے سبھاؤ سے بات کر رہے تھے۔

نواز حسن نے بے ساختہ عادل کی طرف دیکھا جو کافی خراب موڈ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ زرین نے بھی چپ سا دھ رکھی تھی۔ نشست برخاست کرتے ہوئے حفصہ نے بھی دوبارہ آنے کا عندیہ دیا تھا۔ جواباً زرین پھیکا سا مسکرائی تھیں۔

”میں رمل سے ملنا چاہوں گی۔“ ان کی فرمائش غیر متوقع سی تھی۔ وہ حویلی کے پتوں بچ کھڑی تھیں چند

منٹوں بعد رمل ان کے سامنے تھی۔ حفصہ نے بے حد توجہ سے اس کا تنیکھا چہرہ دیکھا اور جیسے نظروں میں بھر لیا تھا۔ رمل نے ان کی آنکھوں کی گوئی کہانی پڑھ کر فوراً نظر چرائی اور اس کا نظر چرائی سارے رازوں سے پردہ اٹھا گیا تھا۔ اس کی گھنی خم دار پلکوں کے نیچے وہ بستی آباد تھی جس میں شیران کے خوابوں کا بسیرا تھا۔ حفصہ یہ دعویٰ پورے دثوق سے کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

”ان کی قدامت پسندی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ آج کے دور میں انہوں نے بیٹی سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا اور تڑاخ سے انکار کر دیا۔“ حفصہ کا لہجہ انتہائی تعجب آمیز تھا۔

”مما! آپ رمل کو بچ میں مت گھسیٹیں۔“ وہ ہلکی سا ہو کر بولا۔ جہانگیر نے اچھی سے بیٹے کی شکل دیکھی۔

”محبت کی جنگ اکیلے نہیں لڑی جاسکتی اور نہ ہی اکیلے جیتی جاسکتی ہے۔“ ان کا انتہائی دھیمہ اور نرم لہجہ بہت کچھ جتانے لگا تھا۔

”ہم ہزار بار بھی تمہارا رشتہ لے کر جائیں گے اور ہر بار انکار ہوگا جب تک رمل بچ میں نہیں آئے گی اگر وہ اس تمام قصے میں خود کو مانس کرے گی تو باقی صفر بچے گا۔“

باپ کی بات سن کر شیران کا دل جیسے ڈوبا تھا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے بس انہیں دیکھے گیا اس کا اس طرح دیکھنا انہیں اور ڈسٹرب کر گیا۔

”آتے وقت میں اس سے ملی تھی اور تمہیں تسلی کی بات بتاؤں۔“ وہ بیٹے کا چہرہ محبت سے تکتے لگیں جس کی آنکھوں میں محبت نے خوش امید کی دیے جلا دیے تھے۔

”اس کے چہرے پر میں نے تمہارا عکس دیکھا تھا۔“ حفصہ کے جملے نے سفر کے راستوں کو آسان کر دیا تھا اور سفر اس کے پیروں تلے شور مچا رہا تھا۔

☆☆☆

عقیقے سے ایک دن قبل بڑی حویلی میں جو گھمسان کارن پڑا تھا، یہاں کے مکینوں میں اس کی

بھی ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے۔
دودن بعد عادل نے مری چلے جانا تھا۔
اللہ حافظ کہنے ان کے پاس آیا تو چارپائی کی
پانکتی پر ٹیک سا گیا۔

”قسمت روز روز مہربان نہیں ہوتی۔ وہ لوگ
کوئی نو دو لیتے نہیں ہیں، جدی پشتی جائیدادوں کے
مالک ہیں۔ کراچی کی بارسوخ، مہذب اور نامور
فیمیلوں میں ان کا شمار سرفہرست ہوتا ہے، آپ غصہ
تھوک کر سوچے گا۔“

”میری دھی کے نام بھی چار مربع زمین ہے
بھو کے ننگے خاندان سے تعلق نہیں رہتی۔ مجھے دولت
کا لالچ مت دو۔“ نواز حسن بھڑک کر بولے تھے۔
زرین بے قراری سے پہلو بدل کر رہ گئیں۔

”بات دولت کے لالچ کی نہیں ہے ابا! آپ
سوچیں تو سہی۔“ وہ آخر میں عاجزی سے بولا تھا۔
”میں رمل کا دشمن نہیں ہوں، بہت عزیز ہے وہ مجھے۔“
”اچھا تمہاری ساری باتیں اپنی جگہ ٹھیک
مگر اتنے گنوں والے لوگوں کو کراچی میں کوئی رشتہ
دینے پر آمادہ نہیں، جو وہ گجرات آ پہنچے ہیں۔“ نواز
حسن اب دور کی کوڑی لائے تھے۔ عادل اور رمل
دونوں نے شپٹا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”خفصہ آنٹی کو رمل جیسی گھریلو لڑکی بطور بہو
چاہیے۔“ اس نے جلدی سے بات کو سنبھالا تھا۔
”میری بیٹی ان کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں
کر پائے گی۔“ وہ حقے کو اپنے قریب کھرا کر مخصوص
ضدی لہجے میں بولے تھے۔

”خوش لباس جا اسے گرم کر کے لا۔“
ٹھنڈا گھونٹ..... پہلے سے بد مزہ بھاجی کو اور
بھی بد مزہ کر گیا۔ خوش لباس بھاگ کر آیا اور اپنی قمیص
کا میلادامن ہاتھ سے جھاڑا..... جس پہ رکھ کر وہ گرم
بھٹہ کھا رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ہوئے بے بے کی
طرف دیکھا، مگر وہ اپنی ہی کسی سوچ میں ڈوبی تھیں۔
”حقہ گرم کرنے کے بعد میرے اور رمل کے
لیے ڈھیر سارے بھنے بھوننا۔ آج پھر ہم شرط لگا کر

باقیات دو دن بعد بھی موجود تھی۔ جنگ ختم ہونے کے
بعد بارود کے ڈھیر میں چھوٹی سی کوئی چنگاری، کہیں
سے اٹھتا ہلکا سا دھواں، ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے بلے
تلے دبے کچھ زندہ سانس لیتے وجود، ان کا گھر آج
کچھ ایسا ہی منظر پیش کر رہا تھا۔

فنکشن ختم ہونے پر اسی شام چا جانے رمل اور
اکبر کا رشتہ پکا کرنے کی بات چھیڑی جسے باپ کے
بولنے سے قبل ہی عادل نے مسترد کر دیا اگرچہ نواز
حسن چپ تھے مگر ان کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔
”نواز حسن! اب بیٹی بھی غیروں میں بیانے کا

ارادہ ہے؟“ طنز سے بھرپور لہجے میں چچی نے تاک کر
نشانہ لگایا تھا۔

”فیصلہ اپنے ہاتھ میں لینے کی ہماری اوقات
نہیں ہے، جوڑیاں آسمانوں پہ جتی ہیں۔“ زرین نے
شوہر کی زبان کو ٹھٹھنے سے پہلے ہی بند کر دیا۔

”چاچا! میں چاہتا ہوں کہ جو غلطی مجھ سے ہوئی
ہے، وہ آپ نہ کریں، پھوپھی بتول کی بیٹی اکبر کے
لیے مانگ لیں۔ اس کے نام تو آٹھ مربع زمین ہے
خواہ مخواہ شریکوں میں چلی جائے گی۔“ اس نے اپنی
طرف سے بات ختم کر دی تھی۔

”آگے ہمیں کیا کرنا ہے، یہ ہم خوب جانتے
ہیں۔“ چاچی کے چہرے کے زاویے بگڑے ہوئے
تھے۔ ان کے برعکس چاچا کے چہرے کے تاثرات
اور ہی کہانی سن رہے تھے ان کے جانے کے بعد نواز
حسن زرین پر برس پڑے تھے۔

”میری بات کان کھول کر سن لو، میں بیٹی کا رشتہ
کراچی..... ہرگز ہرگز نہیں کر سکتا۔ تم یہیں کہیں پڑھا
لکھا لڑکا تلاش کرو، میرے بھتیجے میں تو تمہیں سو عیب
نظر آتے ہیں۔“

اور پھر دونوں کے درمیان وہ مکالمہ بازی
شروع ہوئی کہ رمل کو ہی آ کر مفاہمت کروانی پڑی۔

☆☆☆

آج عادل عفر اکولا ہو چھوڑنے جا رہا تھا.....
ابھی وہ سب اپنے اپنے خراب مزاجوں کے برعکس

”کھائیں گے۔ کیوں بیٹا جی۔“
وہ اپنے دھیان سے چوکی تھی۔
”آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔“ اس کے چہرے
پر الجھن سی رقم تھی اور اسی الجھن نے عادل کا حوصلہ
بڑھایا تھا۔

☆☆☆☆☆

اپنے سیل فون پر اس کا نمبر دیکھ کر وہ کال کاٹ
دیتی تھی پہلے دو دن اس نے فون آف رکھا۔ اس کی
طرف سے ایک ہی سبج آرہا تھا۔ کال ریسیو کرو.....
یہ کام وہ نہیں کر سکتی تھی اسے بھر بھری مٹی کی طرح اپنے
ہی ہاتھوں ڈھے جانا گوارا نہیں تھا۔

دسمبر کے شروع ہوتے ہی وہ لاہور آگئی تھی۔ ابھی
چار روز پہلے شیران کی میملی لاہور ہی آئی تھی اور ایک بار پھر
نواز حسن نے انہیں ڈھکے چھپے لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔
زرین کا ان کے ساتھ زبردست جھگڑا ہوا تھا۔

وہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھیں۔ عادل بھی
باپ سے ملے بغیر ہی چلا گیا۔ عفرانے رمل کو اپنے
پاس ہی روک لیا تھا۔

ایک چھدری شاخوں والے درخت پہ چڑیانے
نیا نیا گھونسلہ بنانا شروع کیا تھا۔ اس کا درخت کی
طرف جاتا نکا اس کی چونچ سے گرنا تو رمل کا دل جیسے
مٹھی میں آجاتا۔ وہ بے دھیانی میں ہی چڑیا کی تنگ
ودودیکھ رہی تھی۔ سردیوں کی دوپہر بتا کسی ہار سنکھار
کے اترا ہوا چہرہ لیے بے وفاسی دھوپ کو خالی خالی
آنکھوں سے تنگ رہی تھی۔

”رمل! بے بے کہہ رہی ہیں تمہارا فون کیوں
بند ہے۔“ عفرانے براآمدے کے سرے تک آکر
اس سے پوچھا۔

”بس ایسے ہی۔ شاید چار جنگ ختم ہوگئی ہو۔“
”میں بھجوانی ہوں دھیان سے چارج کر لیتا۔“
کیا سوچ رہی ہو؟“ عفرانے اس کا خاموش سا چہرہ
دیکھ کر پوچھا۔

”چڑیا کو گھونسلہ بناتے ہوئے دیکھ رہی
ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی تو عفرابھی مسکراتی ہوئی سر
جھٹک کر اندر چلی گئی۔ دو منٹ بعد ملازمہ اس کا فون

”اگلے ویک اینڈ تک اس معاملے پر ٹھنڈے دل
سے سوچے گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ نواز
حسن نے بس خاموش نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے
سامنے اس کے جھکے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اللہ
کے سپرد کیا۔ رمل بھتیجے کو گاڑی میں اس کی ماں کے سپرد
کر کے آئی تو بھابی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

”کیا خیال ہے آج کلکڑوں کی لڑائی نہ کروائی
جائے۔ پریکٹس ہو جائے گی۔“ نواز نے کن اکھیوں
سے زرین کی طرف دیکھا۔ جو سیاٹ چہرے کے
ساتھ مکمل ناراضی کا اظہار کر رہی تھیں۔ رمل نے
مسکرا کر محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”ٹھیک ہے۔ پہلے بھٹے شرط لگا کے کھائے
جائیں گے۔“ وہ چوکس اور بٹاش سا ہو کر بولے تھے۔
”خوش لباس پھر مرغوں کو بھی تیار کر کے لانا۔“
یہ جملہ ادھر ادھر دیکھے بغیر کہا گیا تھا۔

دوسری جانب بھی جیسے چپ کا روزہ رکھ لیا گیا
تھا جسے توڑنا محال تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ اگر وہ چہرہ ہی
نہ دیکھا جائے تو پھر آنکھوں کی بینائی کس کام کی تھی۔
بلاوجہ ہی رمل کی آڑ سے انہوں نے زرین کے
ٹھس سے انداز کو بھی بھرپور توجہ سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

”اوکے..... مگر تجھے کیسے پتا چلا کہ میں جلد ہی
ایک سیاح کا باپ بن جاؤں گا۔“ شیران نے تملاکر
گل دان واپس رکھ دیا۔

”تجھ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“

”ہیں..... یہ تو میری بیوی کی زبان کیوں بول
رہا ہے۔“ باقر نے تعجب سے آنکھیں پھیلائیں۔
”کیونکہ ہم دونوں ہی نہ چاہ کر بھی تمہارا ساتھ دینے
پہ مجبور ہیں۔“ بے کسی آہ بھر کر کہا گیا۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ گویا وہ اپنے فیصلے پہ جما ہوا تھا۔ عجب بے بسی اور بے چینی سی اس کے رگ و پے میں اتر رہی تھی۔

”وہیں رکو، میں آرہی ہوں۔“ وہ اپنے لہجے سے خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کچن کے بیرونی راستے سے ملازمہ کو بتا کر پانچ منٹ بعد اس کے سامنے تھی۔ ڈرائیونگ ڈور کا شیشہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ گھوم کر دوسری طرف سے فرنٹ ڈور کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی انجانے راستوں کی طرف گامزن تھی۔ اندر اس قدر خاموشی تھی جیسے دو اجنبی سفر کر رہے ہوں۔

”ناراض کیوں ہو..... میں نے تو تمہاری طرف دیکھا تک نہیں۔“ اس نے بے اختیار شیران کے حد درجہ سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

”ایک لڑکی کو ہراساں کر کے پتا نہیں کہاں لے جا رہے ہو تو کیا اس واقعے پر خوشی سے بھنگڑے ڈالوں۔“

وہ تیکھے لہجے میں سلگ کر بولی۔ مگر وہ کچھ بھی کہے بنا بڑے سکون سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی پی سی کے سامنے ہی رک گئی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کی معیت میں چلتی وہاں تک آ چکی تھی جہاں وہ یقیناً اپنے اور اس کے لیے میل بک کروا چکا تھا۔ وہ عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ چیر کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ اس کا چہرہ ٹٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

کئی ثانیے اس کی جھکی پلکوں کو تنکے کے بعد وہ نیل پہ دونوں کہنیاں جما کر آگے کی طرف جھک کر مدھم لہجے میں بولا۔

”جب رستہ سارا دلدل ہے تو تم کیسے پیچھے قدم ہٹا سکتی ہو۔“ رمل نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر بے ساختہ اس کی طرف دیکھا..... اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شیران نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”یہ مت کہنا کہ میں نے قدم نہیں رکھا تھا۔“ وہ ساکت سی رہ گئی۔ اس کے لہجے کا یقین رمل کے انکار کی بنیادیں تک ہلا گیا تھا۔

”مجھے اپنی انا اور ضد کا مسئلہ مت بناؤ۔“ کافی

اسے تھما گئی۔ اس نے آن کیا، بیٹری فل تھی۔ شکر ہے بھا بھی نے آن نہیں کیا۔ ایک ٹھنڈی سی آہ لیوں کو چھو گئی۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسی کی کال آرہی تھی۔

”کس قدر ڈھیٹ ہے یہ شخص.....“ کسی کام سے باہر آئی ملازمہ اسے مڑ مڑ کے دیکھ رہی تھی..... چارونا چاراسے کال ریسیو کرنی پڑی۔

”ہیلو.....“ آواز انتہائی مدھم تھی۔

”دل پہ ہاتھ رکھو۔“ اس کا بو بھل ہوتا لہجہ شدید ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔ رمل کی بے ترتیب دھڑکنوں نے دسمبر کی سہ پہر میں بھی ارتعاش سا برپا کر دیا تھا۔ چڑیا کی چونچ سے دو تین تنکے اکٹھے گرے تھے۔

”اگر تمہاری دھڑکنوں میں میرے نام کا شور نہ ہوا تو میں خاموشی سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔“ اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی جگہ پہ جم سی گئی۔

”اور اگر میں کہوں کہ نہیں ہے تو.....“ وہ اپنے منتشر حواس سمیٹ کر بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔

”میں دو دن سے تمہارے دروازے کے سامنے دن گزار رہا ہوں۔ اگر اس وقت تمہارا فون آن نہ ہوتا تو میں اس وقت گھر کے اندر ہوتا۔“

انتہائی سرد لہجے میں کہتا وہ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکا چکا تھا۔ وہ حواس باختہ سی بند گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ باہر آئیں گی یا میں اندر آؤں یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔“ وہ تصور کی آنکھ سے اس کی بوکھلائی ہوئی شکل دیکھ کر بہت محظوظ سا ہو کر بولا تھا۔

”آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ وہ جیسے ہوش میں آ کر دھاڑی تھی۔

”دماغ کے ساتھ دل بھی باغی ہو گیا تو ٹھیک ٹھاک تماشا لگ جائے گا۔ اس لیے باقی باتیں آئیں سامنے ہوں گی۔“ وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ اس کا ہنسا رمل کے تن بدن میں چٹکیاں لے کر رہ گیا۔

”یہ ناممکن ہے۔“ وہ خشک سے لہجے میں بولی۔

”میں گاڑی سے باہر آ چکا ہوں۔“ رمل کے سائیں..... سائیں کرتے کانوں نے گاڑی کا

دیر بعد وہ اپنا خشک ہوتا حلق تر کرتے ہوئے بمشکل کہہ پائی تھی۔

”کیا..... کیا کہا تم نے.....“ وہ اپنا غصہ ضبط کر کے پوچھ رہا تھا۔ ”اگر میرا دماغ الٹ گیا تا تو میں یہاں تمام ٹینکوں سمیت الٹا دوں گا۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ میں انا کی خاطر.....“ وہ انتہائی شاک کی لہجہ میں جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گیا۔ رمل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صورت حال کو کس طرح سنبھالے۔

”پاپا کہتے ہیں، محبت کی جنگ اکیلے لڑی جاسکتی ہے جیسی نہیں جاسکتی۔“ کچھ بل خاموش رہنے کے بعد وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا..... اور جیسے اس کی آنکھوں میں جھانک کر گزر گیا تھا۔

”پلیز رمل..... میرا ساتھ دو۔ صرف تمہارے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے میں ٹھکرا دیا جاتا ہوں۔“ وہ مانگنے والوں کی طرح ٹھہر گیا تھا جھک گیا تھا۔ وہ اس کے قرب کی آنکھ اور اپنے دل کی وارفتگی سے گھبرا کر دھیرے سے بولی تھی۔

”میں اپنے بابا کے سامنے نہیں آسکوں گی۔“ اس کے لب کپکپا کر رہ گئے۔ اس نے ہاتھ پھینچ لیا۔

”معذرت کے ساتھ آپ میرا خیال دل سے نکال دیجیے۔“ ضبط کا دریا پار کر گئی تھی۔ ”میں آپ کے گھر میں ایڈجسٹ نہیں کر پاؤں گی۔ آپ کی اور میری کلاس میں بہت فرق ہے۔“

اب بولنے کی باری اس کی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

”مجھے تمہاری معذرت نہیں چاہیے۔“ شیران نے بے قراری سے پہلو بدلا۔ ”تمہیں میری زندگی میں شامل ہونا ہوگا۔“ اس کا لہجہ بھاری اور بو جھل سا ہو رہا تھا۔

”میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔ ایسا ناممکن ہے۔“ رمل کی ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں۔

جنگل کا رقص اس کی آنکھوں میں بے خودی کی کیفیت لیے ہوئے تھا۔ محبت نے پھر سے درختوں کی چوٹیوں پہ دیے جلا لیے تھے۔ شیران کا دل اس کے چہرے پہ دھڑک رہا تھا۔ وہ نظر چراچرا کے تھک چکی تھی۔

”اب چلیں، دیر ہو رہی ہے۔“ اس کی سوچ کی سوئی گھر میں اٹکی ہوئی تھی۔

”تھوڑی دیر اور..... پھر چلتے ہیں۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتی رمل کو نظروں کی گرفت میں لے کر بولا تھا۔ ”میری شکل اتنی بری بھی نہیں ہر طرف سے مجھے دیکھا جا رہا ہے اور جو میرے عین سامنے بیٹھی ہے، وہ ہر طرف دیکھ رہی ہے سوائے میرے..... میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔“

وہ اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا کر اسے اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ رمل کے ہونٹوں پہ درآئی مسکراہٹ بے ساختہ تھی اور اس نے بڑی گہری توجہ سے بھرپور نظر شیران پہ ڈالی..... وہ چہرہ واقعی دیکھے جانے اور چاہے جانے کے قابل تھا۔

”جو آپ کی طرف دیکھ رہی ہیں آپ انہیں دیکھیں۔“ وہ مزے سے بولی تھی اور اسے چھیڑنی نظروں سے دیکھا۔

”محض کہنے کی بات ہے، ورنہ اس رات میوزک کنسرٹ میں مجھے کسی کا چھوٹا تمہیں غصے میں مبتلا کر گیا تھا۔“ رمل کی مسکراہٹ کٹی تھی۔

”وہ میری غلطی تھی۔ اس رات میں نے کافی غلطیاں کی تھیں۔ جن کا خمیازہ میں بھگت رہی ہوں۔“ بات کے اختتام پر اس کی آواز انتہائی دھیمی تھی اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ایک دبا دبا سا کرب چہرے پہ نمایاں تھا۔ شیران نے اضطرابی کیفیت میں اس کی ٹھنڈی آہوں کو اپنی گرم مٹھیوں میں بند کر کے دسمبر کی خنکی کا لمس چکھا تھا۔ اب وہ دونوں خاموش تھے اور ان کی ان کہی باتیں دسمبر کی بھیگی شام اپنی زبان میں سن رہی تھی۔

☆☆☆

نواز حسن، زرین کو منا کر گھر لے آئے تھے اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دہی سے آکر اس پروپوزل کے بارے میں کوئی اچھا فیصلہ کریں گے۔ وہ تین ماہ کے لیے دہی جا رہے تھے۔ عادل کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا تھا۔ اکبر کی شادی کی ڈیٹ رکھ دی گئی تھی۔ نواز حسن

نے یہ دونوں خبریں زرین کے گوش گزار کیں۔ وہ چپ سادھے دیوار پہ کسی نادیدہ شے کو گھور رہی تھیں۔
”نواز! تمہارے انکار کی وجہ صرف دوری ہے یا کچھ اور.....“ وہ دبے دبے لہجے میں بولی تھیں تو انہوں نے ٹھٹھک کر بیوی کا چہرہ دیکھا پھر گردن جھکالی تھی۔

”میں نے لڑکے کے متعلق ساری چھان بین کروائی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے اچھا ہے مگر.....“
”مگر کیا.....؟“ زرین نے بے قراری دکھائی۔

”اسے سیاحت کا شوق ہے گھر سے مہینوں غائب رہتا ہے۔“ نواز کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ زرین کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ان کے دل میں کئی منزلہ عمارت کے گرنے کا بوجھ اور شور مچ گیا تھا اور چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ کتنی ہی دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوئی تھیں۔

”بس یہ ہی وجہ ہے.....“ ان کا گرم لہجہ جھلسا دینے والا تھا۔ نواز مسلسل نظریں چارہ ہے تھے۔
”یہ وجہ کم نہیں ہے میں جانتی ہوں۔ بھلا مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔“ وہ متوحش سی ہو کر بول رہی تھیں۔

”مگر اس سے اچھا رشتہ میری بیٹی کے لیے نہیں آئے گا۔ اس لیے وسوسوں کے جنگل میں مت بھٹکو۔ وہ میری بیٹی ہے مگر آج کی لڑکی ہے شوہر کے ساتھ چلنے کا، رہنے کا ڈھنگ اسے آتا ہوگا۔ شاید اسے بدلنے کا ڈھنگ بھی وہ جان لے۔“

انہیں پتا نہیں کیا ہوا کہ انہوں نے سامنے بیٹھی زرین کو اچانک اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

☆☆☆

پوتے کے بخار کا سن کر زرین سے رہا نہیں گیا وہ ڈرائیور اور تاجی کے ساتھ لاہور کے لیے دوپہر کو ہی نکل گئی تھیں۔ رمل کو بھی فلو اور بخار تھا۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ تمام کام پنپنا کرتا جی کی ماں حویلی کے پچھواڑے چلی گئی تھی۔ گیارہ بارہ سالہ تاجی اس کے پاس ہی تھی۔ شدید دھند کے باعث زرین کا آج لاہور ہی میں قیام تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے

انہوں نے رمل سے بات کی تھی۔ آج یکم جنوری تھی۔ سیر دی عروج پہ تھی۔ وہ کمبل میں دھکی ڈراما دیکھ رہی تھی۔ بیج ٹون بجی۔ اکثر شیران کے بیج آتے رہتے تھے مگر اس نے بھی جوابی بیج سینڈ نہیں کیا تھا۔ اس نے بیج پڑھا اور وہ کمبل سے کرنٹ کھا کر نکلی تھی۔

تب ہی تاجی کمرے میں آئی۔

”تاجی خوش لباس آیا ہے کہہ رہا ہے عادل صاحب کا کوئی مہمان ہے۔ اس نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔“ رمل کی آنکھوں کے سامنے زمین آسمان گھوم گئے تھے۔ وہ حقیقتاً چکر کر بیڈ پہ گر سی گئی۔ پھر دو گھونٹ پانی پی کر کچھ اپنے حواس بحال کیے۔
”اچھا ٹھٹھک ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔ اس قدر خراب موسم میں کون ہو سکتا ہے۔“ اس نے سیاہ شال اوڑھی۔

”تم ادھر کمرے میں ہی بیٹھو۔ بیرونی دروازہ کھولنے سے پہلے مجھ سے پوچھنا ضرور.....“ وہ اسے تاکید کرتی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ دل تو کر رہا تھا کہ ایسے شوٹ کر دے۔ وہ پاؤں پختی دروازے تک پہنچی تھی مگر اس کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ رہا تھا۔ دروازہ کھولنے کی ہمت اس نے جمع کی۔ سامنے کاؤچ پہ بڑی شان سے ٹانگ پہ ٹانگ دھرے بیٹھا اس کا خون کھولا گیا۔ رمل نے اپنے پیچھے فوراً دروازہ بند کیا تھا اور تیزی سے ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کو لاک کر کے وہ اس کی طرف بڑھی۔

”یہ کیا پاگل پن ہے۔“ ایک بخار دوسرے ٹینشن، اس کا چہرہ لال بھسوکا ہو رہا تھا۔

”اس سرد ترین موسم میں کچے گھڑے پہ تیر کر آ رہا ہوں۔ اک نظر پیار سے دیکھ لو..... پھر خفا ہو لینا۔“ وہ سامنے بیٹھا ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

رمل کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔
”بس دیکھ لیا اب جاؤ.....“ وہ تپے تپے لہجے میں بولی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ رمل کے وجود میں جیسے الاؤ سادھک رہا تھا۔

”نئے سال کی پہلی شام کو ہماری ملاقات مبارک.....“ وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

گا۔“ دل بے چین سا ہوا۔ اس نے فوراً اپنے فون پہ میسج سینڈ کیا۔

”لاہور مت جانا۔ یہیں کسی ہوٹل میں رات گزار لینا۔“ اور سر پہ کمبل تان کر سونے کی ٹاکام کوشش کرنے لگی۔ میسج کا جواب نہیں آیا تھا اور کھلی آنکھوں میں بھلا نیند کیسے سا سکتی تھی۔

بیس منٹ بعد اس کی کال آ گئی۔

”اتنی فکر تھی تو وہیں روک لیتیں۔“ متبسم سا ہو کر کہا گیا۔

”گجرات میں مہمان نوازی کا رواج نئے سال کی پہلی شب کو ختم کر دیا جاتا ہے۔“ ایک طویل خاموشی کے بعد جواب دیا گیا۔

”ویسے ہو کہاں.....“

”اس چھوٹے سے سوال کے ہزاروں جواب دے سکتا ہوں، مگر اتنی دور سے نہیں۔ ابھی پاس بیٹھ کر.....“ اس کے بلکے مدھم لہجے کا سنہری پن کھرے میں چاند کی طرح چمکا تھا۔

”فی الحال تو ایک ہوٹل میں ہوں، تمہارے ملازم شاید میلے لباس نامی شخص نے بتایا تھا۔“

”خوش لباس.....“ وہ فوراً ٹوک گئی۔ رمل کے کان میں اس کا جان دار سا قہقہہ پڑا تھا۔

”اگر گجراتیوں کی خوش لباسی کا یہ حال ہے تو پھر بد لباسی کا عالم کیا ہوگا۔“ اس کے قہقہے تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ رمل نے دل ہی دل میں خوش لباس کا کچھ مرنکا لایا تھا۔

”ویسے بندہ اچھا ہے۔ اب تو اکثر اس سے ملاقات رہے گی۔“ اس کا سر سراتا سا لہجہ سن کر وہ بدحواس ہو کر اٹھی تھی۔

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔“

”میں کیا کروں گا؟ تم اس کی ٹینشن مت لو۔“ بڑے عقل اور سکون سے جواب دیا گیا۔ اس نے آگ بگولا ہو کر فون آف کر دیا تھا۔ خود کو سمجھتا کیا ہے۔ وہ اسے کس طرح باز رکھے۔ اس کا بے بسی سے برا حال تھا۔

☆☆☆

”تمہاری ان حرکتوں کی وجہ سے کسی دن میرا دل بند ہو جائے گا۔“ وہ لوہی مانند جلتے لہجے میں گلابی سی ہو کر بولی اور ذرا سی پلمیں اٹھا کر اسے دیکھنے کی جسارت کی۔ مقابل کی پر حدت آنکھیں برفانی بستوں میں آگ جلانے کے تمام ہنر جانتی تھیں۔

”بس اب یہاں سے جاؤ۔“ وہ پلمیں جھکاتی ریشمی لہجے میں بولی۔

”چائے کا ایک کپ ہی پلا دو اور اتنی ٹھنڈ میں تمہارے علاوہ اس شہر میں مجھے کون پناہ دے گا۔“

بڑی عاجزی سے بے امان لہجے میں کہا گیا فقرہ رمل کے دل میں اپنی کی طرح گڑا تھا۔ وہ عجیب صورت حال کا شکار تھی۔ بٹھا بھی نہیں سکتی تھی اور بھیجنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”پیارے کہو گی تو چلا جاؤں گا۔“ اس کی ہنستی ہوئی آنکھیں خم دار پلکوں سے الجھ رہی تھیں۔ لپٹ رہی تھیں۔

اس قدر سرخ گلابی کیوں ہو رہی ہو۔“ بڑا رنگ دار سا سوال، خوشبودار لہجے میں پوچھا گیا۔

پلیز شیران.....“ وہ منت بھرے لہجے میں گڑ گڑائی.....

”تمہارے لبوں نے میرے نام کو چھو کر مجھے مغرور سا کر دیا ہے۔“ وہ اس کے سرخ پڑتے چہرے کو وارفتی سے دیکھ کر بولا تھا۔

”میں چلتا ہوں۔“ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”بیٹھو، میں چائے بھجواتی ہوں۔“ رمل نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

”چائے پھر بھی سہی.....“ وہ اس پہ الوداعی نظر ڈالتا کمرے سے جا چکا تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس بھر کر خود کو پرسکون کرنے لگی۔ کمرے میں آ کر اس نے ناجی کو سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ ابھی تک دل نے سینے کے اندر اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ شل ہوئی ٹانگوں کے ساتھ بیڈ تک آئی۔ گزرنے والے پل خواب کی مانند لگ رہے تھے۔ وہ بستر پہ گری گئی۔

”اس قدر شدید دھند میں وہ کیسے سفر کرے

ہمیشہ دولت پہ اپنی فیملی کو فوقیت دی ہے۔ اپنی انتہائی مصروفیت میں بھی گھر کو ٹائم دیا ہے۔ شیران اب لا ابالی عمر گزار چکا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی میرے ساتھ بزنس میں میری ہیلپ کروائے گا۔“

جہانگیر نے عقل اور سبھاؤ سے اپنی بات ختم کی تھی۔ اب ان کی سوالیہ نظریں نواز حسن کی جانب تھیں جو ان سے نظریں چرا رہے تھے۔

☆☆☆

”وہ کچھ زیادہ ہی وجیہہ اور خوش شکل ہے ایسے مردوں کی زندگی میں لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔“

”یہ انکار کی ٹھوس وجہ نہیں ہے۔“ زریں تڑپ کر بولی تھیں۔

”جب اپنی بیٹی کی بات آتی ہے تو پوری دنیا ناقابل بھروسہ ہو گئی ہے اور تمام مردوں میں بے وفائی کی دقت تمہیں نظر آنے لگی ہے۔ تم خوب صورت چہروں سے ڈرنے لگے ہو۔ اپنے ہی وسوسوں کی آگ تمہیں جلا رہی ہے جھلسا رہی ہے۔“ وہ زبان میں نیزے پر دوکر بول رہی تھیں جو نواز حسن کو بے طرح چھید رہے تھے۔

”میں تمہیں.....“ عفر ا اور عادل کے اندر آنے سے الفاظ منہ کے اندر ہی کہیں دب گئے۔ زریں نے آنکھوں میں اتری نمی چھپانے کے لیے سر جھکا لیا تھا۔

”انکل! ایک بات کہوں۔“ عفرادھیرے سے بولی۔

”جی بیٹا! کہیے.....“ ان کی نظروں میں ابھن تیر رہی تھی۔

”جس کی زندگی کے فیصلے پہ آپ لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں اس سے بھی پوچھ لیں۔ وہ کیا چاہتی ہے۔“ عفر ا کا انداز ان تینوں کو چونکا گیا۔

”میرے خیال میں وہ سمندر دیکھنا زیادہ پسند کرے گی فیصلہ تو آپ کو ہی کرنا ہے۔ مگر میری بات پہ بھی سوچے گا۔“ وہ اپنی بات ختم کر چکی تھی۔ وہ سمندر دیکھنا چاہے گی۔ نواز کے ذہن میں یہ فقرہ جیسے چپک گیا تھا۔ وہاں موجود تمام افراد اپنی اپنی سوچوں کے جال بن رہے تھے۔

☆☆☆

وقت کے تھال میں موسم کے سکے گرتے جا رہے تھے۔ دھند کی پناہوں سے نکل کر پھول ابھی سورج سے شکوہ کناں ہی تھے کہ خزاں نے آوارہ ہوا کو درختوں کی شاخوں کا پتا بتا دیا۔ جھڑتی کلیاں، چمراتے پتے سر راہ پڑے درختوں کی خالی چوٹیوں کو حسرت سے تکتے رہ گئے۔ سوکھی شاخیں ہوا کی سرسراہٹوں سے دامن بچانی پھر رہی تھیں۔

ایک ایسی ہی ہری بھری شام کو کراچی پیغام بھیجا گیا تھا کہ نواز حسن شیران جہانگیر سے ملنا چاہتے ہیں کناروں کو گھڑوں سے بھر کر مارچ کے آخری دن گجرات میں ہونے والی صبح نے شام تک شیران کا انتظار دریائے چناب کے ساتھ کھڑے ہو کر کیا تھا۔

سر شام حویلی کی منڈیروں پہ نادیدہ ہاتھوں نے نہ نظر آنے والے دیپ جلا دیے تھے۔ نواز حسن اسے دیکھ کر گنگ سے رہ گئے اور کتنی ہی دیر دیکھتے رہے۔

”برخوردار! کیا کرتے ہو۔“

”ابھی تو کچھ نہیں، مگر کچھ عرصے بعد پایا کا بزنس ہی سنبھالوں گا۔“ اس نے نہایت مودب ہو کر شائستگی سے جواب دیا تھا۔

”میں نے تو سنا ہے کہ سارا سال سیر سپاٹوں میں گزار دیتے ہو۔“ سادہ لہجے میں کہی گئی بات سیدھی ہرگز نہیں تھی۔ شیران نے شپٹا کر بے چینی سے ان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

”ایک سیاح شادی کے بعد بھی سیاح ہی رہتا ہے سارے رشتے اس کے لیے بے معنی سے ہوتے ہیں۔ محبت تو اسے سفر سے ہوتی ہے گھر میں رہ جانے والے بس اشیاء میں شمار ہوتے ہیں۔“

نواز حسن بغیر لگی لپٹی کے اسے آئینہ دکھا رہے تھے یا خود کو۔ وہ مسلسل جوتے کی نوک پہ نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ جہانگیر کے لیے جواب دینا اب ناگزیر تھا۔

”نواز صاحب! شیران میرا بیٹا ہے میری ہی طرح رشتوں اور محبتوں کو فوقیت دینے والا ہے۔ جہاں تک اور جتنا میرا کاروبار ہے میں تو مہینوں گھر اور پاکستان کی شکل بھی نہ دیکھ پاتا..... مگر میں نے

رمل کی بات پکی کرنے کے بعد گھر میں کافی تبدیلی آئی تھی۔ نواز حسن کی گھر سے غیر حاضری مہینوں سے نکل کر دنوں پہ محیط ہو چکی تھی۔ اب رمل اور بھابھی لکڑوں کو پچھواڑے پر یکٹس کرواتے تھے۔ سب سے انوکھی بات کہ خوش لباس کے لباس پہ ایک دھبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ بارات گجرات میں لگے پنڈال میں آئی تھی۔ دلہن نے رخصت ہو کر لاہور جانا تھا۔ لڑکی والوں نے صبح ناشتہ لے جانے کی رسم پوری کر لی تھی۔ بارات لانے سے قبل دولہا کے گھر میں ہنگامہ خیز ماحول تھا۔ باقر کے چکلے سب کے چہروں پر گلاب کھلا رہے تھے۔

”اگر تیری جگہ میں ہوتا تو وہ منہ لے کر کبھی نہ جاتا جس کی بنا پہ مجھے ٹھکرایا گیا تھا۔ پہلے سرجی کرواتا۔“ وہ دولہا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ آج شیران اس کی ہر بات کا جواب مسکرا کر دے رہا تھا۔

بارات کا استقبال بینڈ باجے والوں نے سہانے ساز چھیڑ کر کیا۔ شیران کے سینے میں انکی ہوئی سانسیں نکاح کے بعد بحال ہوئی تھیں۔ آج حصہ کا دل ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ جہانگیر بیٹے کے چہرے پہ بھی خوشیوں کو نظر لگنے کے ڈر سے نظر چرا کر دیکھ رہے تھے۔ رخصتی کے ہوتے ہوتے رات کے نو بج گئے۔ نواز حسن کے آنسوؤں نے باراتیوں کی آنکھیں بھی نم کر دی تھیں۔

وہ لوگ تقریباً بارہ بجے گھر پہنچے تھے کہ رسموں کے بعد دلہن کو کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بیڈ روم کی آرائش و سجاوٹ دیدنی تھی۔ رمل مسحوری چاروں اور دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ آئی ہوئی اس کی خالہ زاد بیڈ پہ نیم دراز ہو گئی۔

اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے شیران کو حصہ نے راستہ میں ہی روک لیا۔

”میں نے ساتھ والے روم میں تمہارا ضروری سامان رکھوا دیا ہے۔“

”کیا مطلب.....“ وہ بھونچکا رہ گیا۔

”ان کی رسم ہے کہ دلہن کی کزن آج رات اس

کے ساتھ رہے گی۔“

”پہلے دلہن کو دولہا کے ساتھ بٹھانے کی رسم نہیں تھی اب رخصتی کے بعد پہرے دار ساتھ کر دی۔“ وہ تے لہجے میں جھنجھلا کر بولا۔

”اب کیا کریں یہ ان کے اپنے رواج ہیں۔“

”خیر چھوڑو میں اب جارہی ہوں۔ تم زیادہ ٹینشن مت لو.....“ وہ اسے نظروں سے سمجھانی اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں تو وہ پیر پختا اپنے بیڈ روم تک آیا۔ اس نے ہلکی سی دستک کے بعد دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کی کزن ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں جائے باہر.....“ وہ کھڑی ہو کر بولی۔

”پلیز، کچھ دیر کے لیے آپ باہر تشریف لے جائیں مجھے ان سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ

شائستگی سے بولا۔ وہ انگشت شہادت سے کپٹی کی رگ دبا رہا تھا۔ چونکہ غیر برادری کا معاملہ تھا سو اس کی کزن دولہا بھائی کا تنا تنا سا انداز دیکھ کر مجبوراً باہر کی طرف بڑھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ آہستگی سے گھونگھٹ لیے ہوئی اپنی دلہن کے سامنے بیٹھ گیا۔

”سارا دن ترسا ہوں، تمہاری ایک جھلک ہی نظر آ جائے مگر نہیں جی دولہا کے ساتھ میکے میں دلہن کو بٹھانے کا رواج نہیں۔“

اس کا لہجہ دھیمہ تھا مگر جڑھتا ابلتا ہوا سا تھا۔

اور اب.....“ وہ اس کا گھونگھٹ سر کا کر جیسے بات مکمل کرنا بھول چکا تھا۔ اس کا سجا سنورا ساروپ دیکھ کر اس کی روح تک خیرہ ہو گئی تھی۔ ایک ان دیکھا

بوجھ کججاری پلکوں پہ آن ٹھہرا تھا۔

”رمل!“ وہ اس کی بھیگی ہتھیلی لبوں کے قریب لا کر مہندی کی خوشبو کو اپنے اندر اتار رہا تھا۔ نظروں کے تصادم پہ دونوں کے دل آنکھوں میں دھڑکے تھے۔

”ہمارے ہاں یہ رواج نہیں چلتا۔ میں آپ کی کزن سے کہہ دیتا ہوں۔“ اس کی آواز سرگوشی نما تھی۔

”نہیں شیران پلیز.....“ وہ ایک دم التجا پر اتر

آئی۔ ”یہ ہماری رسم ہے۔“

”اور تمہاری اسی رسم کو بندہ چورا ہے میں سولی پہ چڑھا دے۔“ وہ اچانک بھڑک کر بولا تھا۔ آواز خود بخود اونچی ہو گئی۔

”آپ ابھی سے ہمارے رسم و رواج کی توہین کرنے لگے ہیں۔“ دلہن نے اس کے تپتے ہاتھوں سے اپنی بھیگی پھٹی چھڑانا چاہی۔

”اب میں تم پہ اختیار رکھتا ہوں تمہارا شوہر ہوں۔ سحرات کی گلیوں میں بھٹکنے والا محبوب نہیں ہوں۔“ اس کے لہجے اور آنکھوں میں آوارہ گرد سیاح کی شبیہ پورے قد سے اتر آئی تھی۔ رمل نے نظروں کا زاویہ ایک سیکنڈ میں بدلا تھا۔ تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی۔

”اب تم جاؤ۔۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ جیسے دروازے کی دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔ ”اگر میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا تھا تو پھر دلہن کا روپ کیوں بھر لیا تھا۔ اس بیڈ روم کو دیکھو۔ کیا یہ تمہاری کزن کے لیے سجایا اور مہکایا گیا ہے۔ تمہیں مجھے پہلے سے بتا دینا چاہیے تھا۔“

وہ انتہائی غصے میں بھی اسی پہ ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا۔

”اب جاؤ۔ دیکھ تو لیا ہے۔“ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ رمل کا دل جیسے کسی نے بے دردی سے مسل ڈالا تھا۔

”اسے دیکھنا کہتے ہیں۔“

وہ اس پہ جلتی سی نظر ڈال کر سرعت سے اٹھا۔ دروازے کے پاس دو شخص بل بھر کور کا تھا۔ اس کا پلٹ کر نہ دیکھنا۔ اس کی بھرپور خفی کا اظہار تھا۔ رمل کا دل یک لخت ٹھنڈا بخ ہو کر دھڑکا تھا۔ دروازہ کھٹاک سے بند ہوا تھا جان بوجھ کر اس نے سرداشتعال کا مظاہرہ کیا تھا۔

☆☆☆

صبح جب وہ لاؤنج میں آیا تو اس کے سرال والے ناشتا لانے کے ساتھ تناول بھی فرما چکے تھے۔ پر پل کام سے مزین سی گرین اسٹائلش سے سوٹ میں وہ

دل میں اتر جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ رمل نے بے اختیار سا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔ مگر وہ اسے یکسر نظر انداز کر رہا تھا۔ سب سرالیوں کے ساتھ خوش گپیوں کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ مگر دلہن پہ اک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ اپنے لیے چھائی سرد مہری دیکھ کر رمل کا دل بھگ سا گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھلا کر مہمانوں کو رخصت کر دیا گیا۔

”دوسرے دن دلہن کا میکے والوں کے ساتھ جانے کا رواج نہیں ہے آپ کے ہاں۔۔۔۔۔۔“

اس کی سرد آواز بڑی عجب کہانی سنارہی تھی۔ ایک سنسناہٹ سی رمل نے اپنے پورے جسم میں پھیلتی محسوس کی تھی۔ جہاں گیر اور حصہ بھی اپنی جگہ ششدر سے کھڑے رہ گئے۔ انہیں ابھی کراچی ایر پورٹ کے لیے نکلنا تھا۔ کل رات کو ویسے کا فنکشن تھا۔ رمل کا خفت سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر ان دونوں نے اسے تنبیہ کرنی نگاہوں سے گھورا۔ جہاز میں برابر بیٹھ کر سفر کرتے ہوئے بھی وہ لا تعلق ہی رہا تھا۔ شیران ولا دیکھ کر اس کی آنکھیں صبح معنوں میں کھل گئی تھیں۔

☆☆☆

ویسے کی اتنی شان دار تقریب کراچی میں شاذ و نادر ہی دیکھی گئی تھی۔ اس کے تمام میکے والے آئے تھے۔ جن میں خوش لباس بھی تھا۔ آج شیران کی نظروں میں والہانہ پن سا تھا۔ نواز حسن بیٹی کا محل نما گھر دیکھ کر متحیر سے تھے۔ شیران نے خوش لباس کا تعارف باقر سے کرایا تھا مگر باقر اس کے چہرے کی تھکن سے ابھن کا شکار ہو رہا تھا۔

”دولہا کے چہرے پہ تازگی نظر نہیں آرہی۔“ بالاخر اس سے رہا نہیں گیا۔

”کیونکہ ساری تازگی دل کی طرف آچکی ہے۔“ وہ رمل کو نظروں کے حصار میں لے کر بولا۔ انداز ٹالنے والا تھا۔

حصہ نے ان کا بیڈ روم لاہور سے زیادہ فسوں خیزی سے سیٹ کروایا تھا۔ شیران اندر آیا تو وہ صوفے پہ بیٹھی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے با مقابل بیٹھ گیا۔

کتنی ہی دیر بنا پلک جھپکے اسے دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہرا سانس اندر کی طرف کھینچ کر گہیر گہرے لہجے میں بولا تھا۔
”میں تمہاری ذات سے بے طلب نہیں ہوں..... مگر کیا کروں۔“ ٹھنڈی آہ گرم لبوں پہ آ کے کسمائی۔

مجھ میں اور محبت میں عجب سی ٹھن گئی ہے رمل شیران..... ”ناجی میں ہی کہا گیا تمہارا جملہ مجھے میری نظروں میں بے وقعت سا کر دیتا ہے۔“
دل کے سوکھے دھانوں میں اس کے لہجے کی نرمی نے بھی گرم بارشوں کا سماں پیدا کر دیا تھا۔
رمل کی خشک آنکھیں اس کی طرف اٹھیں تو وہ پورے کا پورا صحرا ہو گیا تھا۔ وہ بھی رمل تھی۔ غصہ اس کی بھی ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروا لیے تھے۔
”میں اب سونا چاہوں گی۔“

وہ اب اس کے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے پیچھے کرسی ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں عین سامنے ایک دوسرے کو آ رہا رہتی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پلکیں نہ جھپکانے کی ایک شیطانی لگ گئی تھی۔ پھر جھپک کر نگاہ اس نے ہی چرائی تھی اور مڑ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ نگاہوں کو کیا معلوم دل کی حالت۔ وہ سر جھٹک کر جیسے اپنے حواس سمیٹنے لگا۔ اس نے انتہائی دیدہ زیب پھولوں کی سجاوٹ دیکھ کر جلتی شمعوں سے نظر چرا لیا تھا کہ وہ انہیں پھونک مار کر بجھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

☆☆☆

حفصہ پر دھیرے دھیرے اس کی خوبیاں کھل رہی تھیں۔ وہ بہت پھرتیلی تھی ابھی کچن میں زیو کے ساتھ لگی ہوئی تو کچھ دیر بعد مالی کے پاس کٹنگس میں مصروف..... بھی صفائی والی کے سر پہ..... تو بھی حفصہ کے ساتھ کہیں بھی جانے کے لیے تیار..... وہ اپنے اندر بہار کا موسم رکھتی تھی۔ اس کے وجود میں رونقیں ہلکورے لیتی تھیں۔ ان دونوں کے رشتے کی لاتعلقی حفصہ کے علم میں تھی مگر بات کرتے ہوئے

عجب سی جھپک آڑے آ جاتی۔
آج حفصہ نے بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔
”وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔ ضدی بھی بہت ہے اگر تم.....“ وہ جھکی نظر سے..... لفظوں کو مناسب ترتیب دیتی جھپک کر بولیں۔ ”اگر تم اسے ذرا سادل سے لگا کر محبت کی آنچ دو گی تو پکھل جائے گا۔ انتہائی بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہے ہو دونوں.....“
اپنے تئیں اسے سمجھا کر وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئیں۔ رمل کی نظریں زمین پر گڑی تھی اور جسم کا سارا لہو جیسے چہرے پہ سمٹ آیا تھا۔

☆☆☆

اسے کراچی آئے ایک ماہ ہو چکا تھا جہانگیر نے اس کے چہرے کی ادا سی بھانپ کر شیران سے کہا کہ وہ اسے گجرات لے کر جائے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ مان گیا تھا۔ واپسی کا سارا سفر خاموشی سے کٹا تھا۔ بڑی حویلی میں ان کا شان دار استقبال کیا گیا تھا۔ عفر اور عادل بھی لاہور سے آ گئے تھے۔

آج دسمبر کی پہلی بارش ہو رہی تھی۔ وہ اس کے بیڈ روم میں کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک سال پہلے کی شام اس کی یاد کے دریچوں پہ اتر آئی تھی۔

”چائے لیجیے۔“ اس کی نرم آواز پہ وہ پلٹا تھا۔ آج رمل کا چہرہ بہار کی مانند تروتازہ تھا۔ دسمبر اور جاڑے کے موسم میں بہار کیے رنگ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی تراوٹ بھر گئی تھی۔ اس نے کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بیڈ پہ بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

”خوش لباس نے کہا ہے کہ میں اس کی طرف سے تاجی کا پروپوزل بھیجوں۔“

”کیا.....؟“ وہ ہونقوں کی طرح اسے تک رہی تھی۔

”جی.....“ وہ ہنسی کو کسی طور کنٹرول نہیں کر پا رہا تھا۔
”تاجی اسے گھاس تک نہیں ڈالے گی۔“ وہ بھی ہنستے ہوئے کھلے ڈالے سے لہجے میں بولی۔

”سنا ہے کہ ملازموں کے اطوار بھی مالکوں جیسے ہوتے ہیں۔“ رمل کے چہرے سے مسکراہٹ بھاپ بن

جہانگیر کو پتا چل گیا تھا کہ کانوں سے دھواں کیسے نکلتا ہے۔
 ”الحق.....“ اس قدر بے تکلی بات پہ ضد لگا کے
 بیٹھا ہے ایسی رسموں میں لڑکیاں کیوں قصور وار ٹھہرائی
 جانی ہیں اور یہ جاہلانہ اور فرسودہ رسمیں اسلام کے
 منافی ہیں۔ انہیں ختم ہونا چاہیے اسٹوپڈ کہیں گا۔ ان
 کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اسے پکینگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ان
 دونوں کے درمیان لائق عروج پر تھی۔ آج اتنی دسمبر
 تھا۔ کل تمام رات وہ گھر سے غائب رہا تھا۔ اذانوں
 سے قبل لوٹا تھا۔ شاید اس کی پکینگ مکمل ہو چکی تھی۔ اس
 نے سائڈ ٹیبل سے موبائل والٹ اور گاڑی کی چابی
 اٹھائی۔ دھیان اسی پہ مرکوز تھا۔ کہہ نہیں سکتی کہ مت
 جاؤ۔ وہ دل میں جھنجھلا کر اسے دیکھنے لگا۔ مگر نہیں جی
 گجراتیوں کی ناک بڑی اونچی ہے۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے سامنے آ گیا
 تھا۔ نہ حسرت نہ یاس نہ شوق شیران کا چہرہ نکلتی اس کی
 خالی نظریں اسے ہر جذبات سے عاری لگی تھیں۔ وہ
 اپنے جذبات چھپانے میں باکمال تھی۔ وہ کتنی ہی دیر
 اس کے چہرے پہ جسے سردے تاثرات دیکھتا رہا۔
 ”کسی بھی منزل پہ پہنچ کر فون کر دینا کہ پہنچ گیا
 ہوں۔“

وہ اس کے قریب سے ہوتی ہوئی سائڈ ٹیبل کی
 دراز سے پتا نہیں کیا ڈھونڈنے لگی۔ وہ لب پہنچ کر رہ
 گیا اور کمرے سے باہر جا کر ملازم کو آواز دے کر
 سامان اٹھوانے کا کہا۔ گھر میں مکمل سکوت تھا۔ آنٹی
 اور انکل ابھی سو رہے تھے۔

رات وہ نئے سال کی پارٹی میں گئے تھے۔ تو دیر
 سے ہی لوٹے ہوں گے۔ رمل نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا
 سرکا کر اسے دیکھا تھا۔ گاڑی ڈرائیو سے ہوتی ہوئی
 بڑا سا گیٹ عبور کر گئی تھی۔ اس نے آنکھوں میں جمع
 ہونے والے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا تھا۔

☆☆☆

دونوں کے اٹھتے ہی زیو چائے لے آئی تھی۔

کراڑی تھی۔ شیران کی آنکھیں بڑی چھیڑنے والی لگ
 رہی تھیں۔ وہ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اٹھ کر
 کھڑکی بند کر دی اور بیڈ کی دوسری طرف لیٹ گئی۔

وہ دوسرے دن دریائے چناب کے کنارے
 بھی گئے تھے اور کچے گھڑوں کا سفران کے دلوں میں
 راستہ بنانے لگا تھا۔ ایک ہفتہ گجرات میں گزار کر وہ
 کراچی لوٹ آئے تھے۔

☆☆☆

وہ ڈنر پہ کافی دنوں بعد اکٹھے تھے۔ پچھلے ایک
 ماہ سے جہانگیر دہلی میں تھے۔ آج کل کچھ قریبی
 دوستوں کے ہاں شادیاں تھیں تو حفصہ اور رمل کے
 دن بھی بڑے پر رونق گزر رہے تھے۔ رمل کا چمکتا دمکتا
 چہرہ بار بار اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا رہا تھا۔
 ”چند دوستوں کے ساتھ میں کل مری جا رہا
 ہوں۔“ چائے پیتی رمل کے ہاتھ میں ہلکی سی
 کیکپا ہٹ در آئی تھی۔

”دوستوں کے ساتھ کیوں.....؟ بیوی کے
 ساتھ جاؤ۔“ جہانگیر نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔
 ”ابھی تو ہمارا پروگرام مری تک ہے۔ ہو سکتا
 ہے؟ وہاں جا کر کہیں اور نکل جائیں۔“ وہ ان کی بات
 ان سنی کر گیا تھا۔

”مطلب کیا ہے تمہارا کہیں آگے نکلنے کا۔
 اب تم شادی شدہ ہو۔“ حفصہ نے لہجے کی کڑواہٹ کو
 چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ”ابھی نئی نئی شادی
 ہوئی ہے۔ رمل تمہارے ساتھ جائے گی۔“ حفصہ کا
 لہجہ ہنوز خشک تھا۔

”سوری ماما!“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا اور وہ
 تینوں حیرت سے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ حفصہ نے
 رمل کو بھی اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ ”کیا یہ
 وہی شیران ہے جو پنجاب کی گلیوں کی خاک چھانتا
 تھا۔“ جہانگیر کی سپاٹ آواز اندیشوں سے بھر پور
 تھی۔ ”بس حاصل کر لیا تو محبت کا بھوت اتر گیا۔“

وہ مارے جھنجھلاہٹ کے بھنا کر رہ گئے۔ آج حفصہ
 کو نہ چاہ کر بھی انہیں تمام صورت حال بتانی پڑی تھی۔

پھر، پھر اہٹ سنائی دینے لگی۔ بے قراری سے اس نے اپنی نشست چھوڑی تھی۔

بیلی کا پٹر کے پرکھم گئے تھے۔ وہ اسے ویکم کہنے آگے آگیا تھا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گیا۔ بس ایک جرسی پہنی ہوئی تھی اور گرم شال اوڑھی ہوئی تھی۔ بیلی کا پٹر میں موجود افراد سے وہ مصافحہ کر رہا تھا۔

”سر! اپنی مسز کو فوراً روم میں لے جائیں اگر یہ بیمار پڑ گئیں تو آپ کا ایڈونچر گڑبڑ ہو سکتا ہے۔“ وہ شیران سے کافی بے تکلف لگ رہا تھا۔

وہ انہیں ہاتھ پلاتا ریل کی طرف بڑھاتا تھا اور اس کے رخ ہاتھ کو اپنے ہاتھوں کی پناہ میں لے لیا۔ پھر اس نے اپنے دستانے اتار کر اسے دے دیے تھے۔

جیکٹ لینے سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر اس کے ہوش کچھ ٹھکانے لگے تھے۔ شیران نے فوراً چائے منگوائی تھی۔ ریل کا انداز کتراتا اور

کسمساتا ہوا سا تھا تو اس کا جوش و خروش بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کمرے میں ان کی سانسوں کی آواز اور خاموشی کا راج تھا۔ بارہ بجنے میں کچھ ہی منٹ تھے۔

پھر تاریخ نے بدل جانا تھا۔

”اب تو تمہارے ساتھ ہوں اب کیوں ناراض ہو.....“ جواباً اس نے گھور کے دیکھا تھا۔

دونوں کے تصور میں گجرات میں اترنے والی نئے سال کی پہلی شام گھوم گئی تھی۔ آج وہ اسے پیچھے نہیں دھکیل سکتی تھی۔ آج اس کے پاس ایک خوب

صورت رشتے کا حق اور اختیار تھا۔

☆☆☆

رات شدید ہونے والی برف باری سے صبح ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ دونوں گولف کلب میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ٹھہر کر اس کا چہرہ دیکھنے لگتا تھا تو وہ جھینپ کر مسکرا دیتی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جہاں سے گزرتے، درختوں کی چوٹیوں پہ محبت برف جھاڑ کر دیے جلا دیتی تھی۔

☆

کونڈہ میں ہونے والی برف باری نے کراچی کا موسم بھی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ انہیں بہو کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کے ہی پتا چل گیا تھا کہ ان کا بیٹا جا چکا ہے۔ چائے پیتے وہ رات ہونے والی پارٹی ڈسکس کر رہے تھے۔ جہانگیر کا موبائل بجنے لگا۔

شیران کال کر رہا تھا۔ ”وعلیکم السلام۔ خیریت سے ہو۔“

”جی پاپا کے بچے، تم اب اٹھائیس ماہ کے نہیں ہو جو تمہاری ہر خواہش پوری کی جائے۔“ ان کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹے سے کس انداز میں اور کس لہجے میں بات کریں۔ ”اب تمہاری رات اٹھائیس برس ہو چکی ہے۔“

”پاپا! ساری میری غلطی نہیں ہے، اس کا بھی تو کوئی فرض ہے۔“

”اب یہ ڈرامے بازی ختم کرو اور کچھ ہوش کے ناخن لو بیٹا۔“

”جی.....“ وہ بس مشکل سے یہ ہی کہہ سکا تھا۔

”خفصہ اٹھو اور اپنی بہو کو جانے کے لیے تیار کرو بلکہ رضا مند کرو میں کچھ ارتجاعت کرتا ہوں۔“

اب انہوں نے خفصہ سے کہا اور وہ اپنے موبائل پر کسی سے بات کرنے لگے۔

”جی پی سی میں..... ہاں اشفاق صاحب بہو ہے۔ اب کیا کریں آج کل کے بچے ایڈونچر پسند کرتے ہیں ہاں ہاں.....“ وہ قہقہہ لگا کر رہے تھے۔

☆☆☆

شدید برف باری ہو رہی تھی۔ وہ میوزک کنسرٹ کی جگہ یعنی سیڑھیوں پہ بیٹھا تھا۔ جس کے ساتھ ایک کھلی جگہ پہ بیلی پیڈ تھا۔ پاپا کے فون نے اسے جو نوید سنائی تھی، اس نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت پہ ابھی تک حیران تھا۔ جیسے جیسے وہ اس سے دور ہوا، اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ مری کی برف باری میں اسے اپنے پاس دیکھنے کی شدید خواہش نے یا گل کر دیا تھا۔ پتا نہیں اسے وہاں بیٹھے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ تب ہی بیلی کا پٹر کے پروں کی

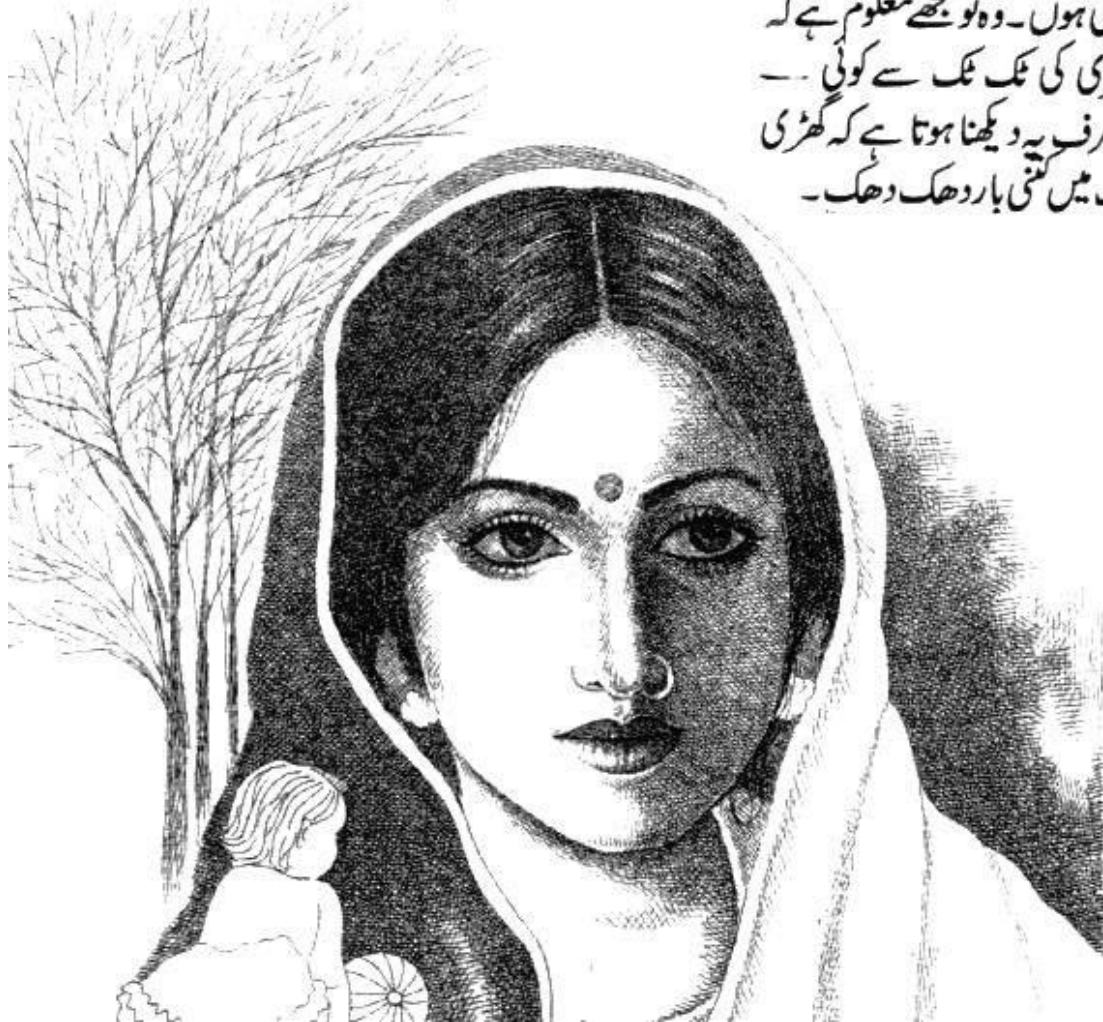
ہاجرہ دیکھان

پیرداشت

مگر کیا کروں، گنتے گنتے مجھے اونگھ آ جاتی ہے اور ہر بار کوئی تیس ٹک اور چالیس دھک دھک کے بعد مجھے گنتی پھر سے شروع کرنی پڑتی ہے۔ مگر گنتی شروع کرنے کی ایک یہی وجہ نہیں اور بھی بہت کچھ ہے جیسے کہ یادداشت جو عین وقت پر تو دھوکا دے جاتی ہے مگر رات کے اس پہر جب دونوں گھڑیوں کی ٹک ٹک میں دل کی دھڑکن ابھرتی ہے تو کچھ ایسی برق رفتاری دکھائی ہے کہ وہ سب بھی یاد آتا جاتا ہے جو ہمیشہ ہی بھولنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ لہذا میں مجبور ہوں رات کی نیند کو ترستی ہوئی پوری رات کمرے میں نہکتی ہوں!..... اس نے پہلو بدلا تو میں نے سنبھل کر اسے اس

”معاف کرنا بھی کہ تم کو اوپر والا کمرہ دے رہی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں تمہارے کمرے کے علاوہ جتنے بھی کمرے ہیں سب کے سب خالی ہیں۔ سمجھو اوپری منزل پر صرف تم اکیلی ہوگی۔ چاہتی تو میں یہی بھی کہ تم کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں بالکل اپنے بستر کے پاس ہی تمہارا بستر چھی لگوا لوں کہ دونوں سہیلیاں دن رات ایک ساتھ گزاریں۔ پرانے دنوں کی یاد تازہ کریں۔ مگر کیا کروں تمہاری تکلیف کا سوچ کر ارادہ بدل دیا۔

کیا ہے ناں کہ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ اصل میں رات گئے دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک میرے سر ہانے رکھی گھڑی کی ٹک ٹک سے ٹکرانے لگتی ہے اس قدر بلند آہنگ آوازوں میں ایک دوسرے سے ابھرتی ہیں کہ چاہ کر بھی سو نہیں پاتی۔ رات کے سنانے میں ایک عجیب و غریب ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے دونوں کی ٹک ٹک میں ریس لگی ہوئی ہے پھر میں دھیان بنانے کے لیے اپنی ہتھیلی کی نبض ٹٹول کر ایک انگلی کی پور کو اس پر ہلکا سا دبا کر دھڑکن گنتی کی کوشش کرنے لگتی ہوں۔ وہ تو مجھے معلوم ہے کہ دل کی دھڑکن کا گھڑی کی ٹک ٹک سے کوئی واسطہ نہیں۔ اصل تو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ گھڑی کی ساتھ بار کی ٹک ٹک میں کتنی بار دھک دھک۔



سمجھانہ سکی بس پھر کیا تھا ایک محاذ سا کھڑا ہو گیا ہم ماں بیٹے کے درمیان۔

لحمہ بڑے ہوتے اپنے لڑکے کی آنکھوں میں اپنے لیے ہر وقت شک و شبہات دیکھ دیکھ کر میں تنگ ہونے لگی تو اس کو بیرون ملک ایک بہت اچھے معیاری اسکول و ہوسٹل روانہ کرنا پڑا حالانکہ مجھے اس کے ساتھ کی بے حد ضرورت تھی۔ کون ہو سکتا تھا میرا ہمدرد میرا غم غوار میری اپنی اولاد کے سوا مگر مجبوری، اگر زبردستی ساتھ لگائے رکھتی تو یہاں پہلی افواہیں اس کی شخصیت کو مکمل توڑ پھوڑ کر رکھ دیتیں۔

کئی سالوں اس کی جدائی برداشت کی تب جا کر اس میں وہ دانائی عقل مندی آئی کہ اس نے اپنی ماں کی حقیقت اور افواہوں کے درمیان فرق کو محسوس کیا۔

☆☆☆

مجھے یاد ہے ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں یہ گھر چلا آیا۔ ورنہ شروع کے چند سال تو گرمیوں کی چھٹیاں بھی یہ ہوسٹل میں گزارتا تھا۔ کچھ ایسا ہی مجھ سے ناراض ہو کر گیا تھا تو اس بار کئی سالوں بعد جب یہ میرے گلے لگا تو اس کا جسم شدت جذبات سے کانپ رہا تھا میں نے جلدی سے اس کا ماتھا چوما طبیعت کے بارے میں بات کی تو پتا چلا کہ اس کے کسی دوست کی ماں نے دوسری شادی کر کے تمام بچوں کو در بدر کر دیا تھا، شاید یہ بات اسے احساس دلا گئی تھی کہ دوسری شادی میں نے نہیں اس کی باپ نے کی تھی اور اس کے بعد ہم ماں بیٹے کے درمیان صرف زمینی فاصلے ہی حائل ہوئے۔

پڑھائی مکمل کرنے کے بعد یہ آیا تو بے حد حلیم اور بردبار ہو چکا تھا۔ چلیں گزر گئے یہ دن بھی جیسے بھی گزرے۔

تو میں یہ بتا رہی تھی کہ بے آواز پنکھے نے میری نیند چھین لی اب صبح ناشتے کے لیے جب بھی لال انکارہ آنکھیں لے کے کمرے سے نکلتی ہوں تو بیٹا، بہو، پوتے، پوتی یہاں تک کہ گھر کے پرانے ملازموں کے سوالات سے بھی تنگ آ جاتی ہوں۔

اچانک تبدیلی کے بارے میں بتانا ضروری سمجھا۔
”یہ ابھی چند دنوں پہلے تک ایسا بالکل بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ میرا کمرے کی چھت پر لگا پنکھارات بھر آوازیں نکالتا تھا اور مجھے اس کی چیخ دھاڑ میں سونے کی عادت سی ہو گئی تھی پھر ایک رات میرا بڑا بیٹا رات گئے میرے کمرے میں آ بیٹھا، میں اس وقت عشاء کی نماز کے بعد کی تسبیح پڑھ رہی تھی لہذا وہ با ادب خاموشی سے بستر کے کونے تک کر بیٹھ گیا مجھے نہیں معلوم اس نے دو چار بار جو نظر اٹھا کر میرے پنکھے کو دیکھا تو کیا سوچا مگر اگلی ہی صبح میرے کمرے کا پنکھا بدل دیا گیا۔

اب پنکھا بے آواز چلتا ہے اور بی مینڈ کی کوز کام مطلب کہ گھڑیوں کو رات بھر لڑنے کی اجازت مل گئی ہے اب تم سے کیا پردہ، میں تم کو بتاؤں کہ یہ میرا بڑا لڑکا ایک زمانے میں مجھ سے بے حد خفا رہا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے باپ کی خودکشی کی وجہ ہوں۔ گو چاروں بھائی بہن میں سب سے بڑا تھا مگر جب میرے شوہر نے خودکشی کی تو فقط پندرہ سال کا ہی تھا مگر باپ کی موت نے جیسے اس کو اچانک بڑا کر دیا اور اپنے بڑے ہونے کی مجبوری کی وجہ یہ کسی نہ کسی کے سر توڑا لٹا ہی اور سب سے آسان ہدف تو میں ہی ہو سکتی تھی۔ اس کی جوان بیویہ ماں جو شوہر کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی تنہا مالک بن بیٹھی تھی۔ یہ میرا مالک بن جانا کوئی میرے ہاتھ میں نہ تھا۔ اتفاق تھا یا شوہر صاحب کی سوچی سمجھی تدبیر کہ وہ خودکشی سے چند ماہ پہلے ہی اپنی جائیداد، مال و دولت کا روبرو چاروں بچوں کے بالغ ہونے تک میرے حوالے رکھنے کی وصیت لکھ کر وکیل کو دے چکے تھے۔

یہ فیصلہ میرے سسرال والوں کو ایک آنکھ نہ بھایا اور شوہر کے چالیسویں تک میرے ارد گرد ایسی افواہیں گردش کرنے لگیں کہ جو بھی سنتا کانوں کو ہاتھ لگا لیتا تو یہ تو پھر بچہ تھا۔ باقی تینوں تو اس قدر چھوٹے تھے کہ ان باتوں کو سمجھ نہ سکے مگر یہ سمجھ دار ہو چکا تھا لہذا ان باتوں کے زیر اثر آ گیا۔ کچھ میں بھی نادان تھی کہ اپنے سب سے بڑے سپوت کو ایسے نازک وقت میں

”میں ٹھیک ہوں طبیعت بھی ٹھیک ہے ہاں
دوائیاں لے رہی ہوں۔“

کتنے ہی ایک جیسے سوالات پر اسی طرح سب
کو بہلاتی ہوں۔ مگر ان لوگوں کو میری بات پر یقین کم
ہی آتا ہے۔ خاص کر میری بہو تو ناشتہ کے دوران ہی
میری اکلونی بیٹی کو فون کر دیتی ہے اور وہ اللہ کی بندی
اپنے بچے کو اسکول چھوڑتے ہی اپنا گھر بار بند کر کے
ٹیک پڑتی ہے، میں ناراض ہوتی ہوں تو دونوں مل
کر کبھی تو مجھ پر ناراض ہوں گی اور کبھی آنسو بہانے
لگتی ہیں۔ تم ہی بتاؤ اتنی معصومیت پر ان لڑکیوں کی
اور کیا تعریف کروں۔

ان دونوں لڑکیوں کا حال تو یہ ہے کہ میرے
تین بیٹوں پر یہ اکلونی لڑکی، اپنے دو بھائیوں سے
چھوٹی اور ایک سے بڑی ہے اس کو شروع سے ہی سجنے
سنورنے کا بڑا شوق تھا، اللہ تعالیٰ نے ماشاء اللہ سے
حسن بھی لا جواب دیا مگر میں کیونکہ بیوہ تھی اور
معاشرے میں اکیلی تھی، اس کو اکثر روک ٹوک کرتی
رہتی جس کے باعث اس نے اسکول کے زمانے سے
ہی اپنی ایک دوست کے گھر زیادہ وقت گزارنا شروع
کر دیا۔ سچ پوچھو تو مجھے اس بات سے کبھی کوئی شکایت
نہیں ہوئی مگر مجھ سے یہ برداشت نہ ہوتا کہ جب
دوست کی ماں میری لڑکی کو مجھ سے پوچھے بغیر نت
نئے فیشن شوز اور عجیب و غریب میک اپ اسٹائل
کے پاس لے کر جاتیں، میں نے اب تک کی زندگی
میں یہ جانا ہے کہ ایسے لوگ بے شمار ہیں اور ہر جگہ بے
حساب دستیاب ہیں وہی جو دوسروں کی مطمئن خوش
گوار سیدھی سادی زندگی میں صرف بگاڑ لانے کے
لیے اپنی تمام تر توانائی لگا دیتے ہیں نجانے ان کو ایسے
ہونے یا ایسا کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ شاید
بگاڑ ہی ان کی خوشی کا باعث ہو۔

ارے ارے تم کیوں پہلو بدلنے لگیں سچ پوچھو
یہ چند جملے میں نے یونہی بس روانی میں کہہ دیے۔
میرا مقصد تم کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں۔ چلو چھوڑو، یہ
سنو کہ ان خاتون کی اپنی ہی لڑکی اکثر اوقات میری

بیٹی کے ساتھ جب ہمارے ہاں آتی تو جیسے اپنی
دوست سے زیادہ مجھ سے باتیں کرتی رہتی۔ لہذا میں
نے چند سال سب کچھ خاموشی سے دیکھنے اور اپنی لڑکی
اور اس کی دوست اور دوست کی ماں کی عادات
واطوار پر غور و فکر کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا۔ اس
وقت تک میرا بڑا بیٹا بھی کافی سمجھ دار اور بردبار ہو چکا
تھا پھر مجھے بیٹی کی دوست پر پیار بھی بہت آتا جب وہ
اپنی دوست کو یہ باور کرانے کے لیے کہ میں اس کی
ماں سے کہیں بہتر ماں ہوں۔ مثالوں کی بھرمار کر دیتی
میں نے جانا کہ وہ بچی اپنی ماں سے بہت مختلف ہے،
یہاں تک کہ اس کا بڑا بھائی بھی۔

یہ اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ تربیت الگ چیز مگر
ہر انسان کی اپنی بھی ایک شخصیت ہوتی ہے میری بیٹی کو
ہمیشہ سے جو شوق تھا، اس نے پڑھائی کے بعد پیشہ بھی
وہی اختیار کیا، بس میری تربیت نے اسے اپنے شوق
کو حد میں اور خاندان کے رسم و رواج کے دائرے
میں رکھنے میں مدد کی جہاں تک رہی بات دوستی کی تو
کچھ میں نے بھی رویے میں لچک پیدا کی اور اب
دیکھو کہ ہم دونوں خاندان ایک دوسرے سے کس قدر
مختلف ہو کر بھی اپنی لڑکیوں کی وجہ سے ایک دوسرے
کے رشتہ دار بن چکے ہیں۔

میری بیٹی، میری بہو کی مند ہی نہیں بھابھی بھی
ہے۔ دونوں کی دوستی کی گہرائی بڑھ گئی ہے اور مجھے
خوشی ہے کہ میں ایک روایتی انارپرست ساس نہیں بلکہ
ایک ہمدرد دوست کی طرح اپنی بہو کو عزیز ہوں اور یہ
اس کی ہی مہربانی ہے کہ اس نے میری بیٹی کو بھی اپنی
ماں کی اہمیت کو محسوس کرنے میں مدد دی ہے۔ اب ہم
دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کی شخصیت کو مکمل طور پر
سمجھ چکے ہیں اور محض مختلف ہونے سے محبت و انسیت
میں تو کمی نہیں آتی؟

☆☆☆

پچھلی رات میرا معصوم سا گول مٹول سات
سالہ نواسا میرے ساتھ خوب چاہ اور محبت سے لپٹا
جاتا تھا کہ میری دس سالہ پونی اپنے کزن کو مجھ سے

تو زندگی کے اس وار سے میں تو ایک دم ڈھے گئی مگر شوہر صاحب سے ضد لڑائی جھگڑا کرنا مجھے مناسب نہ لگا۔

☆☆☆

بہر حال گود میں اس منے سے گول مٹول کو لے کر تین دن بعد جب بابا جانی کے ہمراہ گھر پہنچی تو نوکروں نے بتایا کہ شوہر صاحب ملک سے باہر جا چکے ہیں اور چند دنوں بعد ہی ان کی دوسری شادی کی اطلاع بھی مل گئی۔ بابا جانی مجھے اور بچوں کو شوہر صاحب سے الگ کرنے پر تل گئے۔ میں نے احتیاط برتی شوہر صاحب کو سمجھایا جس کو چاہتے تھے اور جو کرنا چاہتے تھے سب کچھ ہو چکا لہذا بچوں کی خاطر مجھے اپنے آپ سے الگ نہ کریں۔ میرے لیے بابا جانی کی مالی معاونت اور آپ کا دیا یہ گھر کافی ہے۔ آپ اپنے بچوں سے بس ملنے کے دن طے کر لیں۔“

شروع میں تو بابا جانی نے مجھے یہ سب کرنے سے بہت ٹوکا مگر ایک یہی بات میں اپنی بابا جانی کی نہ مان سکی۔ یہ بہت مشکل دن تھا بلکہ زندگی کے مشکل ترین دن جب وہ شخص جس کے ساتھ میں نے اپنی روح تک کو بانٹ لیا تھا یوں اجنبی کی طرح گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کرتا..... پھر یہ دن بھی گزر گئے جیسے باقی گزرے تھے۔

پچھلے دنوں ہمیں ایک شادی کا دعوت نامہ ملا..... میں تم کو بتاؤں کہ میرے تینوں بچے یعنی میرے دو بیٹے اور درمیان کی بیٹی اب باری لگا کر کسی بھی دعوت میں جاتے ہیں۔ میرے بچھلا بیٹا کئی سالوں سے امریکہ میں مقیم ہے۔ اسے ہمیشہ قلق رہتا ہے کہ وہ ماں کی خدمت نہیں کر سکتا لہذا آئے دن فون کر کر کے اپنے باقی ماندہ بھائی بہن کو میرے لیے ہر دم بہت احتیاط کرنے کا کہتا رہتا ہے۔

میرا یہ بیٹا شکل و صورت میں بالکل اپنے نانا جان یعنی بابا جانی پر گیا ہے اور لاڈ بھی بابا جانی اس کے بہت اٹھاتے تھے۔ ہر وقت بابا جانی کے ساتھ لگا رہتا لہذا بڑے ہوتے ہوتے اس نے بابا جانی کا سارا

یوں لپٹتے دیکھ کر جوش میں آ گئی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی آئیں کریم کون میرے منہ کے پاس لا کر مجھ سے ایک نوالہ لینے کی ضد کرنے لگی حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ آئیں کریم وہ کسی سے بھی بانٹ نہیں سکتی، میں نے مسکرا کر اس کی حالت پر غور کیا کہ آئیں کریم پکھل کر اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو رنگین کر چکی تھی اور ٹائپ زمین پر گر رہی تھی وہ چاہ کر بھی اسے سنبھال نہیں پارہی تھی مگر مجھے اپنی آئیں کریم کھلانے پر صدق دل سے تیار تھی۔ مجھے اسے مایوس کرنا اچھا نہیں لگا اور میں نے پکھلتی آئیں کریم کون کو اپنی زبان نکال کر چکھا ہی تھا کہ میرا چھوٹا بیٹا دوڑتا ہوا آیا اور پوٹی کو جھڑک کر مجھ سے الگ کر دیا۔ اسے ڈر تھا کہ ہمیں آئیں کریم کھا کر میری شوگر نہ بڑھ جائے۔ بیٹے کے چہرے پر فکر مندی دیکھ کر میں مسکرائی۔

”کس قدر جیلا سا نوجوان ہو چکا ہے میرا لاڈلا.....“

مجھے اپنے سب سے لاڈلے چھوٹے بیٹے پر بہت پیار آیا۔ باپ کی خودکشی نے اسے بہت سہا دیا تھا دن بھر میری گود میں ہی گزارتا اور راتوں کو اس کے پاس سے ذرا سا ہٹتی تو گہری نیند سے بھی روتے روتے جاگ جاتا۔ گو باپ نے اپنی حیات میں سے کچھ زیادہ وقت نہیں دیا تھا اسے مگر ان کی غیر موجودگی کو اس نے ہی سب سے زیادہ محسوس کر لیا تھا۔ ارے اس کی پیدائش کے چکروں میں لگ کر ہی تو میں شوہر صاحب کے بدلتے تیوروں کو محسوس نہ کر سکی تھی۔ ہمیشہ سے سادہ مزاج کی تھی شوہر صاحب کو کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر اور ملک سے باہر جانا پڑتا تھا جب تک بچے نہ تھے میں ان کے ساتھ چلی جاتی مگر پھر بچوں کی وجہ سے مجھے تک کر گھر پر رہنا پڑتا۔ جس دن یہ پیدا ہوا شوہر صاحب کو تین بار اطلاع دلوائی۔ انہوں نے جیسے سنی ان سنی کر دی میں سمجھ نہیں سکی۔ میری اپنی ماں تو میرے بچپن میں ہی چل بسی تھیں۔ بابا جانی اپنی اکلوتی بیٹی کو ہر وقت سر آنکھوں پر بٹھائے رکھتے تھے۔ پہلی بار اپنے ہی پیار کی جو عدم توجہی سہی

ہوگا، پتا چلے کہ یہ اپنے بچوں کی لیا کر بیت لڑے ہوں گے۔ کیسے گریسی چالاکیاں اور کیا کیا بد معاشیاں نہ سکھاتے ہوں گے؟ پھر کیا معلوم ان کے اپنے ہی گھر میں کیا کردار سمجھا جاتا ہوگا۔

☆☆☆

یہ بات مجھے کئی سالوں بعد اپنے بڑے بیٹے کی شادی کے وقت معلوم چلی جب ان کی بیگم صاحبہ اپنی بڑی لڑکی کے ہمراہ ہمارے گھر پہنچیں اور یہ دعویٰ کیا کہ میرے شوہر صاحب نے بچپن میں ہی بڑے لڑکے کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لیا تھا اور میں اپنے بیٹے کی اگر کہیں اور شادی کروں گی تو یہ ان لوگوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی اور اس کا بدلہ مجھے ایک بار پھر بدنام کر کے لیا جائے گا۔ بھلا ہو میرے بڑے لڑکے کا جو اس طرح مضبوطی سے میرے حق میں جم کر کھڑا ہوا کہ ان کو دوبارہ ہم ماں بیٹے کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

تو ان کی بیٹی کی شادی میں مجھے بھی جانے کا بے حد شوق تھا مگر تینوں بگڑ گئے۔

”سردی عروج پر ہے آپ باہر نکلیں گی وہ بھی اتنی رات گئے تک تو آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔“

چاروں میں بھلے جتنا بھی جھگڑا ہو بس ایک اس بات پر سب ایک دوسرے کا خوب ساتھ دیتے ہیں۔

دراصل سردی تو بس ایک بہانہ تھی ان لوگوں کو نچانے کیسے دعوت نامہ ملے ہی میری زندگی کے ان کٹھن دنوں کا احساس ہونے لگا تھا جس سے بحیثیت خاندان ہم سب ہی گزر رہے تھے مگر شاید ان دنوں نے سب سے زیادہ میری صحت کو متاثر کیا تھا۔

لہذا میرا چھوٹا بیٹا میرے ساتھ رہ گیا اور بڑے دونوں اپنے بال بچوں سمیت شادی میں چلے گئے اور پھر بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں ہی شادی سے جلدی اٹھ کر آ گئے کہ ان کو میرے اکیلے ہونے کی بہت فکر تھی تو شادی میں دل نہ لگا بس رشتہ داری مجبوری تھی تو شرکت کرنا بھی ضروری تھا۔

یہ یوں نہ تھا دراصل ماں کے ساتھ ہوئی

کاروبار سنبھال لیا تھا جو کام بابا جانی مجھ سے لینا چاہتے تھے وہ اس نے اتنی کم عمری میں کر دکھایا تو مجھ کو بابا جانی کو دگنی خوشی مل گئی تھی۔

مجھے اپنے اس بیٹے پر ایسے ہی فخر ہے کہ اس نے آخری وقت میں بابا جانی کو وہ تمام خوشی دی جس سے وہ اولاد دینے نہ ہونے کے باعث اب تک محروم تھے۔ بس مزاج اس کا بابا جانی کی طرح دھیمہ نہیں بے حد تنکھا اور اکھڑ ہے اور یہاں موجود تینوں بھائی بہن کو میرے لیے ہر دم چاق و چوبند رکھتا ہے۔ لہذا دعوت نامہ ملنا تھا جیسے ہنگامی فون کالز پر مشوروں کی بھرمار ہونے لگی۔ میں نے تو بہت کہا کہ یہ تمہارے مرحوم باپ کے چہیتے فلاں بھائی کی سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی ہے جنہوں نے ہمارے خاندان کے ہر مشکل وقت میں ساتھ دیا۔

یہی تو وہ مہربان ہیں جنہوں نے شوہر صاحب کے انتقال کے بعد میرے خلاف افواہوں پر اپنی گواہی کی پھونک یا رمار کر ان کو زمانے بھر میں پھیلانے میں مدد دی تھی۔ یہ شوہر صاحب کی پھوپھی زاد تھے میں نے اپنے ویسے سے ہی ان کی والہانہ چالپوسی اور بیہودہ سرکشی پر کچھ زیادہ پسندیدگی نہیں دکھائی تو یہ بھی جیسے دل میں میرے لیے کئی ایک شکایتیں دبائے بیٹھے تھے۔ اکثر اوقات ہی ان کی طرف سے مجھ پر، میرے کردار پر چٹکے چھوڑے جاتے، مگر شوہر صاحب کی خودکشی نے تو جیسے ان کو مکمل آزادی دے دی۔ سارا ملبہ مجھ پر ڈال دیا بقول ان کے کہ شوہر صاحب نے دوسری شادی ہی میری بدزبانی اور سنگدلی کے باعث کی تھی۔ چلو یوں بھی سہی مگر جب افواہیں پھیلا کر میرے بڑے لڑکے کو مجھ سے مکمل باغی کر کے بھی ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوا اور جب یہ جان گئے کہ میں نے بہت بردباری سے لڑکے کو ان کی پہنچ سے دور کر دیا ہے تو یہ اپنے آپ کو میرے سامنے پیش کرنے لگے۔

مجھے تو یہی بات پریشان کرتی تھی کہ ایسے انسان کا اپنی بیوی اور بچوں کی شخصیت پر کیا اثر ہو رہا

محبت کو ٹھوکر لگانا یا ان کا تمہاری بے وفائی پر خودکشی کرنا..... یا پھر یہ سب بس ہو گیا۔
بس یونہی بے مقصد ایک کہانی کی طرح لکھنے والے نے لکھ دیا نہ کوئی مقصد نہ کوئی سبق۔

ہاں اس پوری کہانی میں صرف اور صرف میری برداشت کو بار بار آزمایا گیا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ چلو اب میری برداشت کے نہ تو زمانے رہے نہ ہی طاقت مگر پھر تم آ گئیں۔

ارے یہ تمہاری آنکھوں میں ڈر و خوف کیسا ہے۔
یقین کرو تم نے مجھے یہ سب بتا کر میری نظر میں

تمہاری اہمیت اور بڑھادی ہے۔
وہ جس کو میں بہت چاہتی تھی وہ تم کو بہت چاہتا رہا ہے تو بھلا بتاؤ کیا تم کو مجھ سے ڈرنے کی ذرا بھی ضرورت ہے؟ مجھے تو بے حد خوشی ہے کہ تم مجھے مل گئیں۔
تم نے بھی بے وفائی کی سزا کائی ہے اور تمہارے چہرے پر گزرے مشکل دنوں نے بے شمار گہرے نشان چھوڑ دیے ہیں۔ میں سمجھ سکتی ہوں تمہارا مجھ سے ملنے کا فیصلہ کوئی اس قدر آسان نہ ہوگا تمہارے لیے۔

میں نے کہاناں دن گزر رہی جاتے ہیں مگر ہر کسی میں میری جیسی برداشت کی طاقت نہیں ہوتی اور پھر تم کو برداشت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے تم کو حق ہے تم مجھے استعمال کر سکتی ہو یقین کرو میں برا بالکل بھی نہیں مان رہی.....

بس اتنا ہے کہ اب کی بار شاید برداشت کرتے کرتے میں ہمیشہ کے لیے گزر رہی جاؤں گی مگر میں ابھی سے اپنے بچوں کو وصیت کر چکی ہوں۔

تم بالکل بے فکر رہو۔ میں اپنے بچوں پر اور اپنی تربیت پر مکمل بھروسہ کرتی ہوں وہ مرتے دم تک میری بات کی پاسداری کرتے رہیں گے۔
وہ تمہارا میرے بعد بھی بہت خیال رکھیں گے۔
تم ان کی سگی ماں نہ سہی ان کے سگے باپ کی بیوی تو ہو۔

☆

زیادتیوں بردل اداس کر بیٹھے تھے۔ میں ماں ہوں ان سب کی اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ اب ان بچوں کو کیسے سمجھاؤں کہ زمانہ اپنے حساب رکھتا ہے جب تک انسان آگے نہیں بڑھتا وقت نہیں بدلتا پھر مکافات عمل اس کی اپنی ہی الگ نرالی چال ہے، آپ کے سامنے ہی ہوتا ہے سب کچھ، برا جو بھی جتنا بھی کر دے اگر خداوند تعالیٰ ہمت دے رہا ہے تو برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ کہ تمہارا وقت بدل سکے۔ مگر کبھی کبھی کسی کے ساتھ ہوا مکافات عمل دل دہلا دیتا ہے۔

جوشو ہر صاحب نے میرے اور اپنے ہی بچوں کی ساتھ کیا اس پر بھی ان کا اس طرح غم وغصے سے خودکشی کر کے اپنے آپ کو ختم کر لینے سے یقین کرو مجھے کبھی کوئی خوشی نہیں ملی۔

اکثر سوچتی کہ یہ کیا اور کیوں کیا انہوں نے؟
بس لوٹ آتے مجھ سے معافی بھی نہ مانگتے بس میرے ساتھ ایک بار پھر۔
اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ہی سوچ لیتے۔

کتنے ہی سالوں میں اس بھرم میں۔
اس زعم میں رہی کہ شوہر صاحب شرمندہ، دلبرداشتہ اور خود کو میرا اور بچوں کا قصور وار سمجھ کر اس دنیا سے سدھارے ہیں مگر اب تم نے بتایا تو جانا کہ دراصل غم وغصہ تو ان کو ان کی میرے ساتھ کی گئی بے وفائی کا نہیں بلکہ ان کے ساتھ کی گئی بے وفائی کا تھا۔

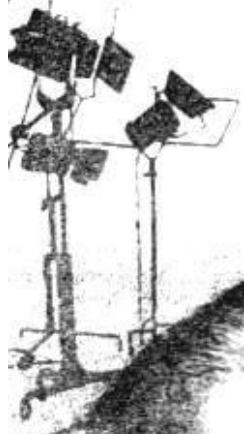
کتنی حیرت انگیز بات ہے شوہر صاحب مرتے دم تک مجھے وہ حیثیت نہ دے سکے جو میں نے بحیثیت ایک بیوی ان سے چاہی تھی اور اس سے زیادہ افسوس اس بات پر کہ وہ مرتے مر گئے مگر تمہارے سامنے اپنی وہ حیثیت نہ بتائے جس کی ان کو تم سے خواہش تھی۔

یہ محبت کا کیسا عجیب گورکھ دھندہ ہے ناں.....
مجھے افسوس ہوا سن کر کہ تم اپنی جوانی اور حسن کے زیر اثر ایک محبت کرنے والے شخص کو گنوا بیٹھیں۔

وہ شخص جس نے تمہاری خاطر اپنے بیوی بچوں کو گنوا یا پتا نہیں اصل مکافات عمل کیا تھا؟ تمہارا ان کی

عاصمہ نورین

لکھنے کی ساری دنیا



میرے بنائے کھانوں کی دھوم مچاتا رہتا تھا۔ خاص طور پر اماں بی کے گھر، یہ ہمارا معاہدہ تھا اماں بی کے گھر کہ فیاض بھی میرے کھانے میں نقص نہیں نکالے گا۔“

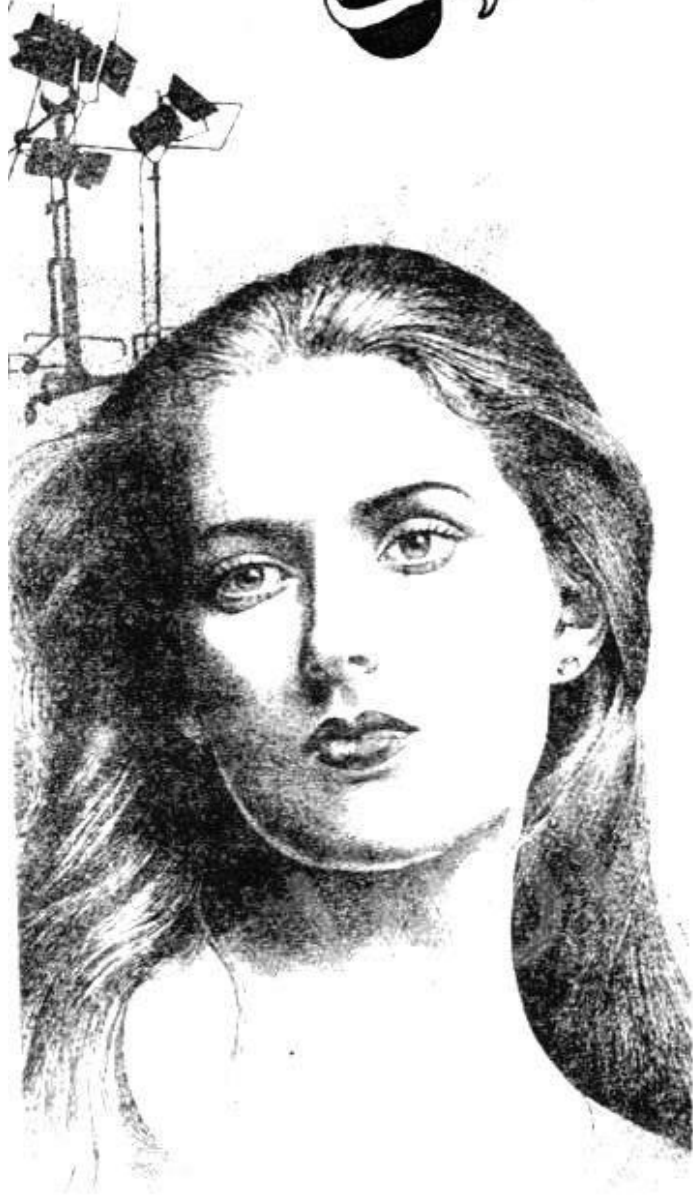
”جی جناب! میں ہوں فی۔ زی۔ جی! آپ نے بالکل صحیح پڑھا فی۔ زی۔ Fi Zee..... کیا کہا؟ یہ نام میرا اصل نہیں ہے؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا بھائی؟ خیر سچ تو یہی ہے کہ میرا نام فرحانہ پروین تھا۔ اماں ابا نے رکھا تھا جس زمانے کی میں پیداوار تھی اس وقت ایسے ہی نام رکھے جاتے تھے ناں! شادی کے بعد میں نے فرحانہ فیاض کر لیا کیونکہ فیاض کے ساتھ لگ کر پھر سننے میں تھوڑا بہتر لگ رہا تھا نام۔

ویسے تو مجھے فیاض کا نام بھی نہیں پسند تھا لیکن کیا کروں، شروع سے فیاض کی منگ تھی میں اور فیاض کے لائے ہوئے سمو سے اور جلیبیاں کھا کھا کر مونی تو ند والے فیاض کو دل دے بیٹھی، پتا ہی نہ چلا، خیر میں بتا یہ رہی تھی کہ میرا نام اب فی۔ زی ہو گیا ہے فرحانہ فیاض سے اور فیاض کو بھی یہ نام پسند آیا ہے۔ بظاہر گاؤں دی سے لگتے ہیں فیاض پر اندر سے کافی ماڈرن ہیں سمجھا کریں ناں!“

کچھ دنوں سے ہم دونوں کے ساتھ ایک ہی مسئلہ ہو رہا ہے کہ ہمیں کھانے کا ذائقہ نہیں آ رہا۔ پتا نہیں کیوں؟ زبان کے، معدے کے، جگر کے سب کے سب ٹیسٹ جوڈاکٹر نے کیے کروا بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن میں حسرت سے کھانے کی چیزوں کو بس دیکھے جانی ہوں۔ دیکھنے سے آنکھیں بھری جاتی ہیں لیکن زبان پر رکھتے کے ساتھ ہی ہر چیز گویا چمڑے کا پرانا بوسیدہ ناگوار مہک والا ٹکڑا بن جاتی ہے۔ جس کو زہر مار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن پیٹ بھرنے کے لیے لقمہ نگلنا ہی پڑتا ہے۔ کیا کروں اور بالکل ایسی ہی حالت فیاض کی بھی ہے۔

وہ دن بھر کا تھکا ہارا ڈیوٹی سے آتا ہے اور میں

لکڑی کی کھال کی کہانی



”جی جناب! میں ہوں فی۔ زی۔ جی! آپ نے بالکل صحیح پڑھا فی۔ زی۔ Fi Zee..... کیا کہا؟ یہ نام میرا اصل نہیں ہے؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا بھائی؟ خیر سچ تو یہی ہے کہ میرا نام فرحانہ پروین تھا۔ اماں ابا نے رکھا تھا جس زمانے کی میں پیداوار تھی اس وقت ایسے ہی نام رکھے جاتے تھے ناں! شادی کے بعد میں نے فرحانہ فیاض کر لیا کیونکہ فیاض کے ساتھ لگ کر پھر سننے میں تھوڑا بہتر لگ رہا تھا نام۔

وہی تو مجھے فیاض کا نام بھی نہیں پسند تھا لیکن کیا کروں، شروع سے فیاض کی منگ تھی میں اور فیاض کے لائے ہوئے سمو سے اور جلیبیاں کھا کھا کر موتی تو ند والے فیاض کو دل دے بیٹھی، پتا ہی نہ چلا، خیر میں بتا رہی تھی کہ میرا نام اب فی۔ زی ہو گیا ہے فرحانہ فیاض سے اور فیاض کو بھی یہ نام پسند آیا ہے۔ بظاہر گاؤں دی سے لگتے ہیں فیاض پر اندر سے کافی ماؤرن ہیں سمجھا کریں ناں!“

کچھ دنوں سے ہم دونوں کے ساتھ ایک ہی مسئلہ ہو رہا ہے کہ ہمیں کھانے کا ذائقہ نہیں آ رہا۔ پتا نہیں کیوں؟ زبان کے، معدے کے، جگر کے سب کے سب ٹیسٹ جوڈاکٹر نے کہے کروا بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن میں حسرت سے کھانے کی چیزوں کو بس دیکھے جاتی ہوں۔ دیکھنے سے آنکھیں بھری جاتی ہیں لیکن زبان پر رکھتے کے ساتھ ہی ہر چیز گویا چمڑے کا پرانا بوسیدہ ناگوار مہک والا ٹکڑا بن جاتی ہے۔ جس کو زہر مار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن پیٹ بھرنے کے لیے لقمہ نگلنا ہی پڑتا ہے۔ کیا کروں اور بالکل ایسی ہی حالت فیاض کی بھی ہے۔

وہ دن بھر کا تھکا ہارا ڈیوٹی سے آتا ہے اور میں نے ٹیبل پر کھانا چنا ہوتا ہے لیکن فیاض کا بھی یہی عالم ہوتا ہے۔

”فی۔ زی جی کسی چیز کا بھی ذائقہ نہیں، آپ کی کوکنگ کو کیا ہو گیا ہے۔“ حالانکہ یہی فیاض ہوتا تھا

میرے بنائے کھانوں کی دھوم مچاتا رہتا تھا۔ خاص طور پر اماں بی کے گھر، یہ ہمارا معاہدہ تھا اماں بی کے گھر کہ فیاض بھی میرے کھانے میں نقص نہیں نکالے گا۔“

سچ بتاؤں تو کوکنگ مجھے پسند بھی نہیں تھی، مجھ سے کھانا نہیں پکایا جاتا تھا۔ میری اور میری دیورانی کی ڈیوٹی تھی سالن بنانے کی۔ ایک دن وہ بناتی اور اگلے دن میری باری ہوتی تھی۔ وہ سیدھی سادی سی اللہ

سالن والے ڈونگے میں مارا، پاس بیٹھی اپنی سب سے چھوٹی بیٹی جواماں بی کی بہت لاڈلی تھی اس کو بلاوجہ کس کر گال پر طمانچہ رسید کیا۔

”کھانا کھاؤ مارہ! بندے نہ کھاؤ۔“

یہ کہا تو بیٹی کو تھا لیکن در پردہ سنایا اماں بی کو تھا۔ اس دن دسترخوان پہ سب موجود تھے۔ یہ بات سن کر سب چپ سے ہو گئے۔ شریف لوگ تھے میرے سرال والے بھی۔ میں نے یہ سب کرنے کے بعد کن اکیوں سے اماں بی کی طرف دیکھا، وہ آنسو بھری آنکھیں لے کر اپنی پلیٹ پر جھک گئیں اور زیر لب کہہ رہی تھیں۔ ”میں نے تو بس۔“

اس سے آگے نہ میں نے سنا نہ مجھے دلچسپی تھی۔ خیر اس کے بعد میں نے الگ گھر کی مہم تیز کر دی اور دو ہی ماہ میں ہم الگ ہو گئے۔ اماں بی ہمارے الگ ہونے پر بے حد رنجیدہ تھیں۔ میں نے کئی بار انہیں چھپ چھپ کر روتے بھی دیکھا۔ وہ میرے بچوں سے بھی بے حد محبت کرتی تھیں۔ لیکن اب بچے بڑے ہو گئے تھے۔ میرے لیے ان کو اکیلے ہینڈل کرنا مشکل نہیں تھا۔ لہذا میں نے اپنا نفع دیکھا اور الگ ہو کر اپنی دنیا بسالی۔ جس میں فی۔ زی حاکم، فیاض محکوم اور بچے تو ویسے ہی میرے تھے۔

اماں بی ہمارے الگ ہونے کے بعد زیادہ جی نہیں پائیں اور اگلے جہان روانہ ہو گئیں۔ ان کی وفات پر بھی مجھے کوئی خاص دکھ نہیں ہوا۔ میرا کون سا کوئی کام رکنا تھا۔ سب ویسا ہی چلتا رہا لیکن اس کے بعد بس یہ عارضہ مجھے اور فیاض دونوں کو لگ گیا ہے۔ اب جتنے بھی جتن کر لوں، مجھے کھانے کا ذائقہ ہی نہیں آتا۔ جتنے مرضی مشہور باورچی کے ہاتھ کا کھانا کھا لوں مجھے اور فیاض کو کھانا بد مزہ ہی لگتا ہے۔ اب تو بچے بھی اس سب سے تھکنے لگے ہیں۔ لوگ بھی کہتے ہیں کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دونوں کو ایک ہی بیماری ہو جس کا کوئی نام ہی نہ ہو، وہم ہے آپ دونوں کا۔

آپ کو کیا لگتا ہے؟ یہ وہم ہے.....؟

☆

میاں کی گائے خوب مزے دار چیزیں پکاتی اور میری باری والے دن سب گھر والے بس بے ذائقہ سا کچا پکا کھانا کھاتے۔

اماں بی، میری ساس بے چاری ضعیف ہو چکی تھیں۔ فیاض اور میرے دیور کی تنخواہ اور میرے سر کی پنشن ملا کر ہمارا گزارا بہت عیاشی سے تو نہیں بس ہو رہا تھا۔ اماں بی نہایت کفایت شعاری کے ساتھ گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔ کبھی سالن میں کسی چیز کی تنگی نہیں ہونے دی انہوں نے، میں دال میں آٹھ نمائے ڈالتی وہ گلی میں ریڑھی والے سے فوراً دو کلو نمائے کر دے دیتیں۔

اکثر سب کو کہا بھی کرتی تھیں کہ جب وہ جوان تھیں تو مالی حالات زیادہ اچھے نہیں تھے۔ اس لیے وہ اب اپنی بہوؤں کو ہر چیز وافر مقدار میں مہیا کرتی ہیں تاکہ اچھا کھانا پکا کر شوہر اور بچوں کو کھلائیں۔ مگر مجھے سردی، گرمی پچن میں جانا زہر لگتا۔ مسالا بھوننے کی زحمت ہی نہ کرنی۔ پیاز نمائے الگ الگ تیر رہے ہوتے اور میں سالن کا ڈونگا بھر کر دسترخوان پر بیچ دیتی۔

اماں بی کے کہنے سکھانے کے باوجود میں نے اپنی روش کبھی نہ بدلی بلکہ بچوں کے بعد تو میں اور شیر ہوئی کیونکہ فیاض مکمل میری مٹھی میں تھا۔ بچوں کے بہانے میں اکثر بازار سے چیزیں منگوا لیتی یا ہم باہر چلے جاتے کسی بہانے سے اور رول پرائٹھے، کڑا ہی یا کچھ چٹ پٹا کھا کر آتے، بس پھر گھر میں نہ پکانے کا دل ہوتا نہ کھانے کی بھوک اس لیے چیزیں بیچ کر کچھ بھی بنا لیتی۔

اماں بی دبی دبی آواز میں احتجاج بھی کرتیں تو میری گھوری اور چیزیں بیچنے کے عمل میں اور تیزی آ جاتی۔ ایک بار تو حد کردی تھی میں نے بھی، اماں بی نے سالن چمکتے کے ساتھ ہی کہا۔

”فرحانہ دھیے! سالن وچ کوئی ذائقہ ہی نہیں

آؤندا پیا.....“

بس یہ سننے کی دیر تھی۔ میں نے زور سے چمچ

عفت سحر طاہر

رنگِ رستمیرے

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لائیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیسٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے بچی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈروم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

زمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

زمین کی سہیلی بجل کہتی ہے کہ تمہیں عبادوسیم پوچھ رہا تھا۔

زمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا سے جانے کی اجازت





دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔
 زمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ عظیم برتھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ بجل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔ راستے میں بجل رانا سعید سے عبادوسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے زمین کی دوستی کرادے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یحییٰ الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں بجل بتاتی ہے کہ عبادوسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریجہ کی ویسے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکد اور ڈپریسڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔
 بجل زمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آ جاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عبادوسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عبادوسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ زمین کو برا لگتا ہے۔

نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تھے سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔
 زمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ زمین، بجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔
 عبادوسیم کے ساتھ ایک بھر پور دن گزار کر زمین خوش خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ زمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔

زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر بجل کے نمبر پر کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آ جاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔
 زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، زمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔
 عبادوسیم، رانا سے ملتا ہے تو زمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔

مارہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عبادوسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مارہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔
 حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔

نزہت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔
 حریم عباد سے کھٹی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آ جاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریئر کے ہو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ زمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

مارک ڈیجیٹل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔ زمین گھر میں نہیں ہوتی۔
 حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبی بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔

عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد زمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔

عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ اس کے قریب آنے پر وہ وہاں سے واپس آ جاتی ہے۔ عبد کی پرکھ کہ وہ پورا اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آ جاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر زمین شادی کی ہامی بھر لیتی ہے۔ نصرت پھپھو اور زلفی خوش ہو جاتے ہیں۔ بجل فون کر کے زمین کو لاتی ہے۔ وہاں عباد و سیم موجود ہوتا ہے اور اسے پروپوز کرتا ہے۔ زمین خوش خوشی گھر آتی ہے۔

رات میں حریم حریم سے کہتی ہے کہ شادی کا کارڈ پسند کر لو۔ وہ کہتی ہے پہلے لڑکا تو پسند کر لوں۔ پھر اسے بتاتی ہے کہ عباد و سیم نے اسے پروپوز کیا ہے۔ دروازے میں کھڑی اماں یہ سن کر بے سدھ ہو کر گر پڑتی ہیں۔

بجل کے سمجھانے پر حریم کو احساس ہوتا ہے کہ وہ غلطی پر ہے، اس نے اپنی زندگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ حالات کو انتہا پر آتے دیکھ کر حریم شوہر سے کہتی ہے کہ وہ میرب سے دور نہیں رہ سکتی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اسے آخری چانس دے رہا ہے، اس کے بعد اسے یہاں سے جانا پڑے گا۔

وہ میرب کے لیے شائنگ کا کہتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آؤٹ لیٹ پر آ جاتا۔ زیادہ واپس پہنچتا ہے تو کیتھی کی ساتھی ویٹرس اسے بتاتی ہے کہ اس کا امپیشل کسٹمر آیا ہے۔

زیادہ کیتھی کو بتاتا ہے کہ اس کے بھائی نے پسند کی شادی کر لی ہے اور اماں باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور بھائی کی منگیتر اس کے سر منڈھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بڑی مشکل ہے جان بچا کر آیا ہوں۔

پال کیتھی سے کہتا ہے کہ اسے اب مارک کے مستقبل کی پلاننگ کرنی چاہیے۔ وہ اکتا کر وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔ مارک اس سے راستے میں معافی مانگتا ہے، کیتھی کے انکار پر ثبوت ملنے کا کہتا ہے۔

کیتھی زیادہ سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ عباد اماں باپ سے معافی مانگ کر گھر واپس آنے کا کہتا ہے۔

مارہ، حریم کو آؤٹ لیٹ پر دیکھ کر برہم ہو جاتی ہے۔ نزہت بھی اس پر ناراض ہوتی ہے۔ حریم میرب کو لے کر اپنے والدین کے گھر آتی ہے۔

حریم میرب کو لے کر اپنے والدین کے گھر جاتی ہے۔ اماں کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوتا ہے کہ حریم کا شوہر پہلے سے شادی شدہ ہے۔ وہ بچی کو بیمار کرتی ہیں کہ اس میں زمین کی شاہت ہوتی ہے۔

مارہ کو دیکھنے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ وہ اماں پر ناراض ہوتی ہے لیکن وہ کہتی ہیں کہ اپنی پھپھو کے سراب سے باہر نکل آؤ۔

نزہت بیٹے پر ناراض ہوتی ہیں کہ اسے حریم کے میکے کیوں بھیجا۔ مارہ اسے اپنے آنے والے رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتا ہے کہ اسے اب زندگی میں آگے بڑھ جانا چاہیے۔ مارہ باہر جانے کا پروگرام بناتی ہے لیکن وہ منع کر دیتا ہے کہ اسے حریم اور میرب کو لینے جانا ہے۔ مارہ شدید غصے میں گھر آتی ہے جہاں اس کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آئے ہوتے ہیں، وہ ان سے بدکیزی کرتی ہے۔ فوزیہ بیٹی کو ڈانٹتی ہیں، وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

کیتھی کے گھر والوں کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے۔ وہ اسے لے کر غائب ہو جاتے ہیں۔ زیادہ ہر جگہ اسے تلاش کرتا ہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلتا، مارہ خود کشی کر لیتی ہے۔

میسویں قسط

حریم کی جان حلق میں اٹک گئی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرب کے بارے میں کس سے پوچھے۔ اس نے پاگلوں کی طرح عورتوں سے میرب کا حلیہ بتا کر اس کے بارے میں پوچھا لیکن سب نے انکار ہی کیا تو

وہ کچھ خیال آنے پر بھاگتی ہوئی ایک سیلیٹر کی طرف بڑھی، نیچے کی طرف مسلسل چلتی خود کار سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے گراؤنڈ فلور پہنچی۔ اس کے ذہن میں یہ خوش گمانی آئی شاید میرب سیڑھیاں اتر کر ڈرائیور کے پاس پہنچ گئی ہو۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں اور اڑی رنگت کے ساتھ مال سے باہر نکلی اور تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تو یہ دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن سست پڑ گئی کہ ڈرائیور اکیلا ہی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ڈرائیور فوراً مودب ہو کر سیدھا بیٹھا۔

”میرب کہاں ہے۔“ حریم ڈرائیور کی طرف کھڑکی میں جھک کر بے تابی سے پوچھنے لگی تو وہ حیران ہو گیا۔
 ”میم۔ میرب بے بی تو آپ کے پاس تھیں میرے پاس تو نہیں آئیں۔“
 ”یا اللہ۔“ حریم نے بے اختیار سا ہوتے ہوئے پیشانی کو ہاتھ سے چھوا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ ڈرائیور گھبرا کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔

”خیریت میم! کیا ہوا ہے؟“
 ”میرب کہیں نہیں مل رہی میں اس کے لیے آکس کریم لینے گئی تھی واپس آئی تو وہ نہیں تھی میں دوبارہ اندر جا کر دیکھتی ہوں۔“
 وہ ان ہی قدموں پر واپس پلٹ گئی ڈرائیور نے کچھ سوچ کر اپنا موبائل نکالا اور پریشانی کے عالم میں کسی کو کال ملانے لگا۔
 کال ختم کرنے کے بعد وہ بھی تیزی سے شاپنگ مال کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

زیاد اس کی بتائی جگہ پر پہنچا تو وہ رندھے ہوئے لہجے میں اسی پلے ایریا میں مردوزن کے جھوم میں گھری ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ زیاد جھوم کو چیرتے ہوئے اس تک پہنچا۔
 ”کہاں ہے میرب؟“

زیاد کو دیکھ کر وہ بے اختیار اس کی طرف لپکی۔
 ”وہ نہیں مل رہی زیاد۔ میں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا ہے۔“ حریم کو ٹوٹ کر رونا آیا۔
 زیاد اسے لے کر جھوم سے باہر نکل آیا

”آخری بار تم نے اسے کہاں چھوڑا تھا؟“ زیاد نے پوچھا۔
 ”وہ جھولا جھول رہی تھی اس نے آکس کریم کھانے کی ضد کی تو میں اسے جھولے پہ چھوڑ کر آکس کریم باریک گئی تھی بس واپس آئی تو وہ.....“ حریم بات ادھوری چھوڑ کر رو دی۔ پریشانی کے عالم میں زیاد اس کا ہاتھ تھام کر کر اور پلے روم کی طرف بڑھا اس نے پورے اپر فلور پر اپنے دل کی تسلی کی خاطر ایک بار پھر میرب کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

لیکن ان کی تلاش بے سود رہی۔ میرب کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا حریم کی ٹانگیں اس کا بوجھ سہارنے میں ناکام ہو گئیں تو وہ پاس بڑی کرسی پر ڈھیر ہو گئی اس نے میز پر پریشانی ٹیک دی اور رونے لگی۔
 ”بے وقوفی مت کرو حریم! اٹھو اور چل کے گاڑی میں بیٹھو، مجھے میرب کو تلاش کرنا ہے۔“

زیاد نے سختی سے کہتے ہوئے اسے بازو سے تھام کر اٹھایا اور خود کار سیڑھیوں کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر آ گئے وہ حریم کو باہر گاڑی میں بٹھانے جا رہا تھا تھا بھی پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو چونک کر مڑا۔

☆☆☆

”کام ہو گیا ہے میڈم جی۔“ وہ ابھی اسٹور پہ پہنچا ہی تھا کہ کال آ گئی۔

”کہاں چھوڑا ہے بچی کو؟“ دوسری طرف سے کڑھکی سے پوچھا گیا۔

”وہیں جی۔ جہاں آپ نے کہا تھا۔“ زلفی شیطانیت سے مسکرا کر بولا

”شاباش۔ بہت اچھا کیا، تمہیں جلد ہی تمہارا انعام مل جائے گا۔“ اطمینان سے کہا گیا۔

”بہت شکریہ میڈم جی! ایک بات پوچھنی تھی، آپ کی دشمنی کیا ہے اس بچی کے ساتھ یا حریم کے ساتھ؟“

زلفی نے تھوڑی بے تکلفی دکھاتے ہوئے دل میں انکا سوال پوچھنا چاہا۔

”تم اپنے کام سے کام رکھو، زیادہ بولو گے تو تھوڑے سے بھی جاؤ گے۔“ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد دوسری

طرف سے غرائی ہوئی آواز آئی تو زلفی گڑبڑا گیا۔

”سوری جی..... وہ ویسے ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں۔“

”تم اپنے ذہن کو زیادہ سوچنے کی زحمت مت دو، جس کام کے پیسے ملتے ہیں اتنا ہی کرو اور اتنا ہی سوچا کرو

ورنہ پیسے کے لیے کام کرنے والے بہت ملتے ہیں میں کسی اور کا انتظام کر لیتی ہوں۔“ خشک لہجے میں کہا گیا۔

”نن..... نہیں جی..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ زلفی پریشان ہونے لگا۔

”اور یہ یاد رکھنا۔ کسی کو کسی بھی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔“

”میں تو بس جتنا آپ کہتی ہیں اتنا ہی کرتا ہوں نہ کچھ زیادہ نہ کم۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”ہم۔ گڈ۔ ابھی آدھے گھنٹے تک پیسے مل جائیں گے تمہیں۔“ کال کٹ گئی لیکن زلفی کا ناپنے کو دل کر رہا

تھا اس بار اسے پورے پچاس ہزار ملنے والے تھے۔

وہ پھلوں سے لدا پھندا گھر پہنچا تو نصرت نے گال پہ انگلی رکھ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے۔ باوا کے اسٹور کی ساری کمائی ان اللوں تللوں پہ اڑانے کا تہیہ کر لیا ہے کم بخت!“

”ایک۔ پیسہ بھی اسٹور کی کمائی کا نہیں ہے اماں! یہ تمہارے بیٹے کی کمائی ہے۔ محنت اور خون پسینے کی۔“

زلفی نے اتر کر کہا تو نصرت کی آنکھیں پھٹیں۔

”نہ۔ تو تیرا کون سا الگ سے کاروبار چل نکلا ہے جہاں سے یہ من و سلوی اتر رہا ہے؟“

”ایک دوست پر اپنی کاروبار کرتا ہے اماں! اسی کے ساتھ لوگوں کو کرائے کے مکان اور خریدنے کے

لیے زمین پلاٹ وغیرہ دکھاتا ہوں اگر سودا طے پا جائے دونوں پارٹیوں میں تو مجھے بھی طے شدہ معاوضہ ملتا

ہے۔“

زلفی کا ہوم ورک پورا تھا، ڈھٹائی سے جھوٹ بول گیا تو نصرت نے تشکر کی سانس لی۔

”اللہ تیرا شکر ہے۔ میرے بچے کو بھی عقل آئی کہ اپنے مستقبل کی فکر کرنی ہے۔“

”بس اماں! دیکھتی جاؤ تم عیش اپنے۔“ زلفی مسکرایا۔

”میں تو بس اس انتظار میں تھی کہ تب تو گھر چلانے کے قابل ہو اور کب میں تیری دہن بیاہ کر لاؤں۔“

نصرت بے حد خوش تھیں۔

”اماں! یہ اپنی حریم کا کچھ پتا چلا کن حالات میں ہے؟“ کھانے کے دوران زلفی نے سرسری سا لہجہ اپنا کر

معلومات لپٹا چاہیں تو نصرت بھڑکیں۔

”دفع دور۔ اب کہاں سے اپنی“ رہ گئی ہے وہ کلموی۔“

”سیدھی سی ایک بات پوچھی ہے اس میں بھی رولا ڈال لیا ہے تم نے اپنا۔“ زلفی جھلایا۔

”اے۔ تو مجھے کیا پتا۔ رل رہی ہوگی کہیں سڑکوں پہ۔ ایسیوں کی اخیر یہی ہوتی ہے۔“ نصرت نے بددعا یہ

انداز میں تجزیہ پیش کیا تو زلفی کوفت سے سر ہلا کر رہ گیا۔

اندر ہی اندر وہ فون والی عورت اور حریم کے رشتے یہ ہی انکا ہوا تھا۔

”کوئی تو بڑا معاملہ ہے جس کی وجہ سے اتنا پیسہ خرچ کر رہی ہے میڈم۔“
لوگ نفرت کے رشتوں کو محبت کے رشتوں سے زیادہ خلوص سے نبھاتے ہیں

☆☆☆

وہ گنگناتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی تو رابعہ نے پسندیدگی سے اسے دیکھا۔

”شکر ہے۔ تمہارے بھی ہونٹوں پہ مسکراہٹ نظر آئی۔“

”اچھا۔“ وہ ہنستے ہوئے ان کے پاس صوفے پر آ بیٹھی۔ ”کیا کریں۔ دنیا خوش ہونے ہی نہیں دیتی۔“

”خود کو دنیا کے نہیں بلکہ دنیا کو خود کے تابع کرنا چاہیے میری جان! بالکل ویسے ہی جیسے کوئی انسان گاڑی چلا

رہا ہو تو گاڑی پہ اپنا پورا کنٹرول رکھتا ہے تاکہ گاڑی کو اس کی مرضی پہ چھوڑ دیتا ہے۔“

رابعہ نے پیار سے اس کے رخسار کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”یہ باتیں صرف کہنے میں ہی آسان لگتی ہیں۔“ وہ

تنگنی سے بولی۔

”دنیا سے ہار مان لینا بزدلی کی نشانی ہے، انسان کو زندگی سے اپنی خوشیاں وصول کرنا آنا چاہیے ورنہ لوگ تو

دوسروں کو روند کر آگے نکل جاتے ہیں۔“

”خیر۔ ہارتو میں نے بھی نہیں مانی کچھ نہ کچھ تو زندگی سے وصول کر کے ہی رہوں گی۔“ اس نے مصمم ارادہ

ظاہر کیا۔ آج کل وہ پہلے سے بہت مطمئن نظر آتی تھی جیسے زندگی گزارنے کا کوئی پلان وضع کر لیا ہو رابعہ نے دل

ہی دل میں اپنی بیٹی کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کی تھی۔

”روبی کی طرف بھی چکر لگائیں کب سے تمہیں یاد کر رہی تھی۔“

”ارے۔ اب کہاں وہ ہمیں یاد کرتی ہیں، ان کا لاڈ لا بیٹا جو آ گیا ہے، ڈھونڈ رہی ہوں گی اس کے لیے کوئی

چوتھی بیگم۔“

مارہ نے مسکراہٹ دبائی وہ رابعہ کے شاذل کے ساتھ لگاؤ سے خوب واقف تھی اس لیے جان بوجھ کر کہا تو

حسب توقع وہ برا مان گئیں۔

”یہ کیا ہر وقت تم اس کی شادیاں کتنی رہتی ہو۔ وہ کون سا سر پہ لا د کے بیٹھا ہے تین بیویاں۔ جا چکی ہیں

اسے چھوڑ کر۔“

”بس پھر۔ اس سے اندازہ لگالیں کہ کوئی بھی عورت اس بندے کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی۔“ مارہ نے

آگے جھک کر میز پر سے ٹی وی کاریمورٹ اٹھاتے ہوئے انہیں چھیڑا تھا وہ گویا تڑپ ہی تو انہیں۔

”کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ ان غیر ملکی آزاد خیال لڑکیوں کو کہاں گھر بسانے آتے ہیں۔ اس بے چارے

نے تو بہت کوشش کی کہ کسی ایک۔ ہی کے ساتھ ذہن مل جائے۔ پر وہ کہاں رہتی ہیں پاکستانی بلکہ مسلمان شوہر

کے اصول و قواعد کے مطابق۔“

”تو اس ”پاکستانی مسلمان“ کو کس نے کہا تھا کہ تین بار ان ہی آزاد خیال لڑکیوں کو آزمائے۔“ مارہ نے

چینل سرفنگ کرتے ہوئے منہ بنایا۔

”ماں تو ٹھوکر کھا کر انسان کو عقل آ جاتی ہے نا۔ اب اسی لیے تو مشرقی لڑکی ڈھونڈ رہا ہے جس کے ساتھ

ساری زندگی گزار سکے۔“ رابعہ نے بھانجے کی سائڈ لی تو مارہ مسکرا دی۔

”چلو۔ دیکھتے ہیں کہ شاذل عباس کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے کون سی مشرقی لڑکی یہ قربانی دیتی

ہے۔“ ”ایویں۔ قربانی۔“ رابعہ تملائیں۔ ”عیش کرے گی جو بھی شاذل کی زندگی میں آئے گی۔“ مارہ ان کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”اف۔ کس قدر سائیڈ لیتی ہیں آپ اس بندے کی۔ اسے تو گویا آپ کی طرف سے سات خون معاف ہیں۔“

”فضول باتیں مت کرو اور چکر لگا لینا روٹی کی طرف۔ کتنے ہی دن ہو گئے ملاقات نہیں ہوئی۔“ رابعہ نے اسے پابند کرنا چاہا۔

”دیکھوں گی۔ ابھی تو آؤٹ لیٹ پہ بھی جانے کو دل نہیں کر رہا کچھ دن فرصت کو انجوائے کرنے دیں ماما جانی!“ اس نے جان چھڑائی۔

”روٹی تم سے بہت پیار کرتی ہے۔“ رابعہ نے بات شروع کی۔

”ہاں۔ میری خالہ جو ہوئیں۔ میں بھی ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔“ ٹی وی پہ نظریں جمائے مارہ نے بے توجہی کے ساتھ جواب دیا پھر ایک دم خیال آنے پہ ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”فارگا ڈسک۔ اب اپنے بھانجے کی تعریف نہ شروع کر دیجیے گا۔ وہ ٹاپک کلوز کر دیا تھا اس روز میں نے۔ ڈھونڈنے دیجیے روٹی خالہ کو چاندی بہو۔“ اس کے قطعی انداز پر رابعہ گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ دونوں تیزی سے منیجر کے آفس کی طرف بڑھے ایک ویٹرنے انہیں منیجر کے بلاوے کی اطلاع دی تھی وہ دونوں آفس میں داخل ہوئے تو سامنے ہی کرسی پر بیٹھی میرب کو چاک بار کھاتے دیکھ کر دونوں کی جان میں جان آئی زیادہ تیزی سے آگے بڑھ کر میرب کو اٹھالیا۔

”آپ کی یہ بچی ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں بیٹھی ہوئی آئس کریم کھا رہی تھی۔“ ”اسے وہاں کوئی چھوڑ کر گیا ہوگا۔ میں نے تو اسے اوپر پلے ایریا میں جھولے پر بٹھایا تھا۔“ حریم نے بے تابی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے ایسے ہی ہو کیونکہ اتنی چھوٹی بچی تھرڈ فلور سے گراؤنڈ فلور پر اکیلی نہیں آ سکتی۔“ منیجر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو زیادہ ان سے پوچھا۔

”اس ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں یقیناً سی سی ٹی وی کیمرہ لگا ہوگا، اس سے ساری حقیقت سامنے آ جائے گی۔“

”جی بالکل۔“ منیجر نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں ابھی فونج نکلو اتا ہوں۔“ منیجر نے اس کا وزیٹنگ کارڈ دیکھتے ہوئے تعاون پہ آمادگی ظاہر کی تھی۔

”میں ان لوگوں کو گاڑی میں چھوڑ کر آتا ہوں آپ اتنی دیر میں پچھلے ایک گھنٹے کی فونج نکلوائیں۔“ زیادہ منیجر کو تلقین کرتے ہوئے میرب کو اٹھائے ایک ہاتھ سے حریم کا ہاتھ تھامے آفس سے نکل آیا۔

ڈرائیور نے میرب کو ان کے ساتھ دیکھا تو شکر بجالایا۔

”اللہ کا شکر ہے میرب بے بی مل گئیں۔ بڑی بیگم صاب کی تو تین بار کال آچکی ہے۔“ ”وہیں اندر ہی تھی۔ ریسٹورنٹ میں چلی گئی تھی۔“ زیادہ نے تادیبی نظروں سے حریم کو دیکھا تو وہ خائف سی ہو کر دبے لہجے میں بولی۔

”میں نے سوچا، کہیں میرب آکر گاڑی میں نہ بیٹھ گئی ہو اس لیے آکر ان سے پوچھا تھا۔“ زیاداس کے صفائی پیش کرتے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔

”تم ان دونوں کو گھر لے جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ ڈرائیور نے سر ہلا کر جلدی سے اپنی نشست سنبھالی۔

”تم یہاں کیا کرو گے۔ ساتھ ہی چلو آئی یا راض ہوں گی مجھ پر۔“ حریم برا فروختہ تھی۔

”میں کال کرتا ہوں ان کو کہ میرب یہیں تھی۔ کچھ نہیں کہیں گی تمہیں۔ مجھے ابھی یہاں سی سی ٹی وی فوٹیج نکلا کر دیکھنی ہے، پتا تو چلے کہ میرو کس نے ریسٹورنٹ میں بٹھایا اور آکس کریم دلائی۔ بقول میرو کے اسے ایک انگل نیچے لے کر آئے تھے۔“ زیاد نے اسے تفصیل بتائی تو وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور میرب کو اپنی گود میں بٹھالیا۔ وہ گاڑی کو دور تک جاتے دیکھتا رہا پھر لمبے ڈگ بھرتا شاپنگ مال کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

”جلدی سے تیار ہو جاؤ بھئی۔ میں آ رہا ہوں۔“ شاذل نے کال کی تو عجلت میں تھا

”کیوں بھئی۔ تمہارے آنے کی اتنی خوشی..... کہ اب میں تیار ہی ہو کے بیٹھ جاؤں؟“ مارہ نے تیوری چڑھائی۔ وہ آج آؤٹ لیٹ سے چھٹی پر تھی۔

”افوہ۔ سمجھا کر ونا۔ ڈیٹ ہے میری آج ایک لڑکی کے ساتھ۔“ وہ شرمانے کی اداکاری کر رہا تھا۔

ایکسکیز میسٹر! ڈیٹ تمہاری ہے، میرا وہاں کیا کام ہے؟“ مارہ نے گویا برامانتے ہوئے پوچھا۔

”اوہو۔ تم نہیں سمجھو گی تمہارا ہی تو سارا کام ہے وہاں، بس دس منٹ میں جلدی سے ریڈی ہو جاؤ میں گھر سے نکل رہا ہوں۔“

”تو نکل جاؤ۔ میرا تو کہیں بھی جانے کا قطعاً کوئی موڈ نہیں۔“ مارہ نے اسے ہری جھنڈی دکھاتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

”وہ تم جانو اور تمہارا کام۔ میں بس دس منٹ میں آ رہا ہوں اور پھر جیسی بھی ڈرینگ میں ہو میں اٹھا کے لے جاؤں گا۔“ شاذل نے قطععی لہجے میں کہا اور پھر وہ ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی لیکن شاذل نے لائن ڈسکنیکٹ کر دی۔ مارہ نے غصے سے فون آف کر کے بیڈ پر پھینکا۔

”الو کا۔ خود کو سمجھتا کیا ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔“ مارہ کو شاذل کے لا بالی پن پہ غصہ آئے جا رہا تھا۔

”حد ہو گئی یعنی کہ..... تمہاری ڈیٹ ہے تو مجھے وہاں پر باڈی گارڈ بنا کر لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ تپ رہی تھی۔

مگر جب تھوٹکی دیر میں شاذل آیا تو اس نے مارہ کو منا کر ہی دم لیا۔

”میری وہاں کیا ضرورت ہے۔ بس یہ بتا دو؟“ چیخ کر کے شولڈر بیگ اور سن گلاسز سنبھالتی وہ لاؤنج میں آگئی تھی تپ کر پوچھا۔

”تمہاری ہی تو ضرورت ہے۔ میں بھلا پاکستانی لڑکیوں کے بارے میں کیا جانتا ہوں۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

”تو میں نے کون سا بی ایچ ڈی کی ہوئی ہے ان معاملات میں اور یہ کون سی لڑکی ہے جسے تم نے آتے ہی پھنسا لیا ہے بلکہ ڈیٹ کے لیے تیار بھی کر لیا ہے؟“ مارہ کی جلی کٹی سن کر شاذل نے زوردار قہقہہ لگایا

”ابھی پھنسا یا نہیں بلکہ پھنسانے کی تیاری ہے ہو سکتا ہے آج کی ملاقات میں وہ قابو میں آجائے۔“ وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مارہ نے گہری سانس بھر کر تاسف سے سر ہلایا۔

”ہاں بھی۔ دس سالہ امریکی تجربہ ہے اس کام کا تمہارے پاس۔ بیسٹ آف لک۔“
 ”یو جیلز پینل۔ امریکہ میں تو گوریاں مرنی تھیں مجھ پر۔“ وہ نہت کو بتا کر اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔

”روز کے روز مہالیا کرتے تو وہ بے چاری بھی بچ جاتیں۔“ ماہرہ نے طنز کیا تو وہ ہنسنے لگا۔
 ”اتنا اچھا سینس آف ہیومر ہے تمہارا، تمہارے ساتھ تو پوری عمر گزاری جاسکتی ہے۔“
 شاذل کی بات سن کر ماہرہ کا دل ڈوب سا گیا۔
 ”غلط بھی ہے تمہاری۔ مجھے آج تک اس لحاظ سے کبھی کسی نے پسند نہیں کیا۔“
 ”کچھ لوگ آنکھ کے اندھے ہوتے ہیں اور کچھ عقل کے اندھے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں دونوں لحاظ سے ٹھیک ہوں۔“ شاذل نے اطمینان سے کہا۔
 ”اچھا چھوڑو یہ سب اور یہ بتاؤ کہ مجھے لے کر کہاں جا رہے ہو۔“ ماہرہ نے ماحول کی سنجیدگی کو بدلنے کے لیے ہلکے ہلکے انداز میں پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

”تم بتاؤ جہاں تم کوئی، وہاں لے جاؤں گا۔“
 ”دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ جہاں تمہاری ملاقات طے ہے، ظاہر ہے وہیں جائیں گے۔“
 ماہرہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
 ”ارے ہاں۔ وہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا، میں تمہیں اپنی مرضی کی جگہ پر لے جاتا ہوں۔“
 وہ سنہلے ہوئے بولا تو ماہرہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”مجھے تو یہ سب تمہارا ڈرامہ ہی لگ رہا ہے۔“
 ”بہت ہلکا لے رہی ہوں مجھے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں کہ کوئی لڑکی آنے والی ہے؟“
 شاذل نے گویا برامانے ہوئے کہا۔
 ”چلو۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں، ہاتھ نکلن کو آرسی کیا؟“ ماہرہ نے شانے جھلکے۔
 تھوڑی دیر میں ایک مشہور ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچ کر وہ اس کے ساتھ گاڑی سے نیچے اتری۔
 ”پہلے ہاتھ تو کرلو۔ محترمہ پہنچی بھی ہیں کہ نہیں۔“ ماہرہ نے اسے مشورہ دیا۔
 ”ہمارا پہنچنا زیادہ ضروری تھا۔“ وہ مسکرایا۔

اس کی بات سن کر ماہرہ نے اسے گھورا اور ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ویٹر نے انہیں ان کی ٹیبل تک پہنچایا۔

”تم نے پہلے سے ٹیبل ریزروڈ نہیں کروائی ہوئی تھی؟ لڑکیوں پہ اچھا اثر پڑتا ہے۔“
 ماہرہ نے مینیو کارڈ اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔
 ”میں نے سوچا تھا کہ پہلے تم سے تمہاری پسند کے ریسٹورنٹ کے بارے میں کنفرم کر لوں ٹیبل تو مل ہی جاتی ہے۔“ وہ دونوں بازو میز پر نکاتے ہوئے دلچسپ نظروں سے ماہرہ کو دیکھ رہا تھا تھا اس نے چونک کر نظریں اٹھا میں اور شاذل کو دیکھا پھر کوئی خیال آنے پر اس نے مینیو کارڈ میز کی سطح پر رکھا اور سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”سچ بتاؤ۔ کوئی اور آ بھی رہا ہے کہ نہیں یا تم مجھے جھوٹ بول کر یہاں لائے ہو؟“
 ”سچ بتاؤں تو صرف اور صرف تم ہی ہو۔ تم ہی کو انوائٹ کیا ہے اور تمہارے ہی لیے یہ ڈیٹ ہے۔“
 شاذل نے خفیف سا ہمو کر کہا تو وہ گہری سانس بھر کر ریسٹورنٹ میں ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے کہ خود پر قابو پا

”ناراض ہو؟“

”اس فضول حرکت سے کون ناراض نہیں ہوگا؟“ ماہرہ نے اسے گھور کر دیکھا۔
”میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں اور سیدھے طریقے سے تم میسر نہیں ہوتیں۔“ وہ معصومیت سے بولا۔
”چلو اٹے طریقے ہی سے سہی۔ آج میسر ہوں تو بات کر کے بات ختم کر لیتے ہیں۔“ ماہرہ نے یک لخت
پرسکون ہوتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، میں تم سے گھما پھرا کر کوئی بھی لمبی چوڑی بات نہیں کرنا چاہتا۔ صاف اور سیدھی سی بات ہے کہ میں
تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مانا کہ تین نامکام شادیاں کر چکا ہوں لیکن کوئی بات چھپائی نہیں ہے کسی سے۔“ وہ
اپنے مخصوص صاف گوانداز میں بولا جبکہ وہ اس کی بات پہ چونکے بنا اسے اسی اطمینان و سکون کے ساتھ دیکھ رہی
تھی۔

”بس ہو گئی تمہاری بات؟“ وہ خاموش ہوا تو ماہرہ نے اطمینان سے پوچھا۔ اس کے انداز نے شاذل کو بے
آرام کیا۔

”بات یہ ہے شاذل عباس! کہ میں اس شادی وغیرہ کے چکر میں بالکل نہیں پڑنا چاہتی۔“
”تو.....؟ ساری عمر تو اے نہیں گزارو گی نا؟“ وہ خفا ہوا۔

”ہاں۔ نہیں گزرے گی لیکن فی الحال میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا۔ تم میری طرف سے آزاد ہو جہاں چاہو
شادی کر لو۔“

”فضول باتیں مت کرو یہ ایک خوب صورت پروپوزل تھا شادی کے لیے، جس کا تم اتنا فضول اور بورنگ
رہنمائی دے رہی ہو۔“

”میں ایسی ہی ہوں شاذل عباس! اسی لیے تو کہا ہے کہ تم اپنی مرضی کے مطابق کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ لو
اور اس سے شادی کر کے اپنی زندگی کو خوب صورت اور ایڈوانس بنالو، میں واقعی بہت بورنگ ہوں۔“ ماہرہ نے
صاف صاف لفظوں میں کہا، وہ اسے کوئی بھی امید نہیں تھمانا چاہتی تھی۔

”کیا تم ابھی تک زیادہ کا انتظار کر رہی ہوں؟“ شاذل نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ایک
دم بھڑک اٹھی۔

”اٹس نن آف یور بزنس۔ مجھے کسی سے بھی کوئی توقع نہیں ہے، میں اس شخص سے وابستہ تمام توقعات بھی
ختم کر چکی ہوں۔“

”میں تمہیں آفر کرتا ہوں ماہرہ! میری طرف تم بہت نیک اور اچھی توقعات رکھ سکتی ہو۔“ وہ شرارت سے
بولا۔

”شکریہ۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ بیزاری کی انتہا پر تھی۔
”کیوں اپنی زندگی کو دوسروں کی ٹھوکروں پر رکھ کر بیٹھی ہو؟ اپنے حصے کی خوشیوں کو دوسروں کا دکھ پال کر
برباد کرنا زری بے وقوفی ہے۔“ وہ سنجیدہ ہوا تو ماہرہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”اللہ کا واسطہ ہے، کھانا منگوا لو اب۔ تمہارے اس فلسفے سے تو پیٹ نہیں بھرنے والا میرا۔ جواب تو وہی
ہے جو میں تمہیں دے چکی ہوں۔ اس لیے وقت ضائع کرنے کا فائدہ نہیں۔“ شاذل اسے گھورے گیا تو وہ
مزید بولی۔

”اب اگر تمہارا پروپوزل منع کرنے کے بعد تم نے مجھے لچ کر وانے کا پروگرام کینسل کر دیا ہے تو بھی بتا
دو۔ ممانے آج بہت اچھا مینیوریڈی کروانا تھا گھر پہ۔“

”شٹ اپ۔“ کلتے ہوئے شاذل نے خفگی دکھائی اور وٹیر کو بلانے لگا۔ مارہ مسکراہٹ دباتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

”موسم بدل رہا ہے۔ سردی ہو گئی ہے، اچھی خاصی۔ تم نے کہا تھا، شاپنگ پہ چلیں گے آج فارغ ہیں تو سردیوں کے لیے کپڑے خرید لیں؟“ عائشہ نے لہجے کے دوران اس سے پوچھا تو وہ سادگی سے بولی۔
”نہیں..... ابھی نہیں۔“ زید نے بتایا تھا اکتوبر میں پاکستان میں گرمی ہوتی ہے۔“
”ہمارے کپڑوں کی شاپنگ کا پاکستان سے کیا تعلق ہے؟“ عائشہ نے حیرت کے مارے پوچھا تو آمنہ

مسکرا دی

”کیونکہ اس بار اکتوبر میں ہم پاکستان جا رہے ہیں ان شاء اللہ۔“

عائشہ نے تحیر سے اسے دیکھا۔

”یہ تم سے کس نے کہا ہے؟“

”تمہارے بھائی نے۔ اگلے ماہ تک ان شاء اللہ ہمارا پاکستان جانے کا پروگرام ہے، حیان نے کہا ہے کہ

وہ چلے گا میرے ساتھ۔“

”اس نے کہہ دیا اور تم نے مان لیا۔ وہ تو ایسے ہی کچھ بھی بولتا رہتا ہے۔“

”نہیں نہیں اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔“ آمنہ نے نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

”اتنی مشکلوں اور مصیبتوں سے بچ کے آئی ہو اور پھر سے اپنی جان مصیبت میں ڈالنے کی تیاری کر رہی ہو،

تھوڑا صبر کر لو اگر قسمت میں ہو تو تم زیادہ سے ضرور ملو گی۔“

”نہیں۔ اب میں بالکل بھی دیر نہیں کرنا چاہتی مجھے یوں لگتا ہے کہ ہر دن کے ساتھ وہ مجھ سے دور ہوتا چلا

جا رہا ہے۔“

”اگر اسے اتنا ہی تمہارا احساس ہوتا تو وہ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہو۔“

”ہو سکتا ہے اس نے کوشش کی ہو لیکن میرا موبائل چھین کر مجھے قید میں ڈالا جا چکا تھا وہ رابطہ کب اور کیسے

کرتا؟“

”موبائل تمہارا چھتا تھا، قید میں تمہیں ڈالا گیا تھا۔ زیادہ کی اتنی تو ذمہ داری بنتی تھی کہ اپنا موبائل آن رکھتا

تا کہ تم واپس آ کر اس سے رابطہ کر سکتیں۔“

عائشہ کو زیادہ پر سخت غصہ تھا۔

”یہ تو اب اس سے مل کر ہی پتا چلے گا کہ اس پر کیا بنتی۔“ آمنہ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم جو بھی کہو، مجھے تو تمہارا یہ فیصلہ بالکل بھی پسند نہیں آیا۔“ عائشہ کی بھوک اڑ گئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ حیان کا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے ورنہ وہ خود کو اور تمہیں بھی مشکل میں ڈالنے کا نہ سوچتا۔

جانتی ہو، اگر تم پر کسی کی نظر پڑ گئی تو تم دونوں کتنی بڑی مشکل میں گھر سکتے ہو۔“

”اللہ مالک ہے وہ یقیناً میرے لیے بہتر ہی کرے گا لیکن ایک بار اپنی قسمت کو آزمانا ضرور چاہتی ہوں۔“

”میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا ری ایکشن دوں تم دونوں ہی بے وقوف ہو اور پاگل بھی۔“

”تمہارے بھائی کا اس میں کوئی قصور نہیں، یہ میرا فیصلہ ہے وہ تو بس میری سکیورٹی کے خیال سے میرے

ساتھ جانے کا پروگرام بنا بیٹھا ہے۔“

”اسے بھی تمہاری ضد نے ہی مجبور کیا ہو گا ورنہ وہ کبھی بھی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

”تم جو بھی سمجھو لیکن اب تو یہ پروگرام فائل ہو چکا ہے، تم چاہو تو تم بھی اپنا نام لسٹ میں لکھوا سکتی ہو اور میرے ساتھ پاکستان چل سکتی ہو۔“ آمنہ نے اسے بھی آفر دی۔

”جی نہیں بہت شکریہ۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی شوق ہے دو پاگلوں کے بیچ میں اپنا سر پھنسانے کا۔“ عائشہ الجبھی ہوئی تھی، درحقیقت اسے آمنہ کا یہ فیصلہ بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا اور پر سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ حیان اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو گیا تھا۔

”تم بس یہ دعا کرو کہ زیڈ مل جائے مجھے۔“ آمنہ نے صدق دل سے کہا تو وہ آمین بھی نہ کہہ سکی۔

”اور اگر وہ مل گیا تو؟ تم واپس آؤ گی یا نہیں؟“ عائشہ نے پوچھا تو وہ بے اختیار لیکن دل سے مسکرا دی۔

”ان شاء اللہ۔ وہ ضرور ملے گا۔ اور جب ملے گا تب تمہیں بتاؤں گی کہ آگے کا کیا پلان ہے۔“

عائشہ ایک ٹک اس کی سنہری جلد میں گھلتے گلابی پن کو دیکھ رہی تھی۔

”مت ڈالو خود کو مصیبت میں آمنہ! اگر وہ کسی اور کا ہو چکا ہو تو؟“

وہ یہ کہنا نہیں چاہتی تھی لیکن بے دردی سے کہہ گئی آمنہ کا رنگ اڑا۔

”بد دعا تو مت دو۔“ عائشہ کا دل اس کی اڑی رنگت دیکھ کر پھل گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آتے ہوئے جھک کر آمنہ کو گلے لگا لیا۔

”آتم سوری۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اللہ تمہیں ہمیشہ۔ خوش رکھے۔“ اس کی بات سن کر آمنہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔ عائشہ اپنی جگہ پہ واپس آئی تھی۔

”ہاں ہے تم میری سب سے بہترین اور اکلونی دوست ہو اس دنیا میں۔“

”ہاں۔ مجھے پتا ہے۔“ عائشہ نے اتر کر گردن اکڑائی تو وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ اپنی دل دکھانے والی بات کا اثر زائل ہوتے دیکھ کر عائشہ کا احساس جرم کم ہونے لگا۔

”چلو جلدی کرو۔ ورنہ جلا د چھوڑے گا نہیں ہمیں۔“ لنچ ٹائم سے دس منٹ اوپر ہو چکے ہیں۔“ آمنہ کو دفعتاً وقت گزرنے کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی عائشہ نے بھی فوراً اس کی تقلید کی، وقت کی پابندی کے معاملے میں حیان اپنے باپ پر بڑا تھا۔ منٹوں سے حساب سے میسے کاٹنے کی دھمکی اس نے ہر ملازم کو دے رکھی تھی۔ اس دھمکی پر عمل درآمد چاہے کبھی نہ کیا ہو لیکن یہ دھمکی سب کو وقت کا پابند رکھے ہوئے تھی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے سڑک پہ آئیں۔

☆☆☆

وہ گھر لوٹی تو لاؤنج ہی میں نزہت اور وسیم صاحب کو پریشان سا موجود پایا۔ نزہت نے ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی بے قابی سے جھپٹ کر میرب کو حریم سے تقریباً چھین کر سینے سے لگا لیا۔ حریم کا دل اچھل کر حلق میں آیا۔

”پائے۔ میری بچی۔ کہاں سے ملی ہے؟“ نزہت نے میرب کو چومتے ہوئے پوچھا تو وہ جوان کے رد عمل پہ دنگ سی تھی سوال سن کر حواس میں لوٹی۔

”میں میرو کے لیے آکس کریم لے رہی تھی تو یہ جا کر ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئی۔ میں یونہی گھبرا گئی تھی۔“ حریم نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

”آج آگئے دو زیادو۔ بات کرتی ہوں میں اس سے۔ تم اس قابل ہر گز نہیں ہو کہ ہم اپنی بچی کو تمہارے حوالے کریں۔ پتا نہیں ان سب کو یہ دکھائی کیوں نہیں دیتا۔“ نزہت غصے سے بولیں۔

”اچھا۔ اب یہ فضول باتیں چھوڑو۔ بچی خیریت سے ہے نا۔ اتنا کافی ہے۔“ وسیم سیٹھی بات رفع دفع

کرنے کی غرض سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”دادو۔ انکل میرو کو لے گئے تھے۔ انہوں نے میرو کو چاک بار بھی لے کر دی۔“ نزہت کے چہرے کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں تھام کر میرب نے بھانڈا پھوڑنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

”ہاں۔ وہ آئس کریم والے انکل تھے بیٹا!“ حریم نے جلدی سے نکلڑا لگایا ورنہ نزہت تو بال کی کھال اتارنے بیٹھ جاتیں۔ میرب کو نزہت کے پاس چھوڑ کر وہ ان کی جلی کٹی سننے کے لیے لاؤنج میں بیٹھنے کے بجائے اپنے کمرے میں آگئی۔ کپڑے تبدیل کر کے ذرا دیر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹی تو گزرے تمام پریشان کن پل گویا آنکھوں کے آگے گھوم سے گئے وہ شاید غنودگی کی کیفیت میں تھی جب اس کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ حریم کا دھیان زیادہ کی طرف گیا اس نے موبائل اٹھاتے ہوئے مندی آنکھوں سے میسج باکس کھولا۔

”اب پتا چلا کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ نئے میسج نے حریم کے وجود میں سنساہٹ دوڑادی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

”ابھی تو صرف ٹریڈ دکھایا ہے پکچر تو ابھی باقی ہے“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ ہے کہ تم اور تمہاری بچی میری نظروں سے بالکل بھی دور نہیں ہو اور نہ ہی میری پہنچ سے۔“

اس انجان شخص کا میسج پڑھ کر حریم کا سانس سینے ہی میں اٹک گیا۔

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“

”تم نے تو میری ساری زندگی ہی بگاڑ کر رکھ دی ہے ہے اب دیکھو اور انتظار کرو کہ میں تمہارے ساتھ کیا

کرتا ہوں۔“ میسج پڑھ کر حریم ششدر رہ گئی۔

پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے میسج کیا۔

”میرے شوہر نے پولیس سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے بہتر ہوگا کہ تم خود ہی سامنے آ جاؤ۔“

”اگر تم نے اپنے شوہر کو ایک بھی لفظ میرے بارے میں بتایا تو اس بار تو تمہاری بچی مل گئی ہے اگلی بار اس کی

شکل دیکھنے سے بھی جانی رہو گی۔“

یہ اس کا آخری میسج تھا۔

حریم بے چین ہو کر بستر سے اٹھ گئی اس کا دل جیسے کسی نے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

”او میرے اللہ۔“ وہ آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے پٹی تو اندر داخل ہوتے زیادہ سے ٹکرا گئی۔

”کیا ہوا ہے؟ رنگ اڑا ہوا ہے ابھی بھی تمہارا۔ اب تو میرا مل گئی ہے حوصلہ کرو۔“

اور بس حریم کو لگا کہ اس کے سارے حوصلے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں وہ بے اختیار اس کے شانے سے لگ کر رو

پڑی۔

”میں فیل ہوں نکلتی اور بے کار ہوں۔ میں میرا دھیان نہیں رکھ سکتی میری وجہ سے اتنی مصیبت آئی۔“

زیادہ نرمی سے اس کی پشت تھپتھپائی۔

”میں نے ریسٹورنٹ کے کیمبرہ کی فوٹیج نکلا کر دیکھی ہے وہ خود سے نیچے نہیں آئی بلکہ ایک بلیک آؤٹ

فٹ میں ملبوس شخص نا صرف اسے اپنے ساتھ اٹھا کر نیچے لایا بلکہ اسے آئس کریم دلا کر ریسٹورنٹ میں چھوڑ کر چلا

گیا۔

زیادہ اسے بتایا تو وہ متوحش لہجہ میں بولی

”کون تھا وہ۔ تم نے اس کی شکل تو دیکھی ہو گی؟“

”نہیں۔ شکل کا تو بالکل بھی پتا نہیں چل سکا اس نے منہ پر ماسک لگایا ہوا تھا اور سر پر پی کیپ پہنی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کی شکل تو بالکل بھی نظر نہیں آئی۔“ زیادہ نے مایوسی سے کہا۔

”لیکن پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شخص میرو کو اغوا کرنا چاہتا تھا ہو سکتا ہے کہ یہ اسے ادھر اکیلی گھومتی ہوئی مل گئی ہو اور وہ اسے احتیاطاً ریسٹورنٹ میں بٹھا کر چلا گیا ہو اغوا کرنا ہوتا تو وہ چھوڑ کر کیوں جاتا؟“

وہ اپنا تجزیہ ظاہر کر رہا تھا جبکہ حریم کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ کر اسے بتائے کہ وہ شخص جان بوجھ کر میرب کو ساتھ لے گیا تھا اور اس کا مقصد حریم کو سبق سکھانا تھا لیکن اس شخص کی دھمکی نے حریم کی زبان پر نفل لگا کر بند کر رکھا تھا وہ سر ہاتھوں میں تھامتی بیڈ پہ گری گئی۔

”کیا ہوا۔ ممانے ڈانٹا ہے کیا؟“ زیادہ نے پوچھا تو کچھ نہیں بولی۔

”تمہیں ضرورت ہی کیا تھی ڈرائیور کے سامنے بات اٹھانے کی۔ مجھے کال کر لی کافی تھی۔ اس نے اپنی عقل کے مطابق فرض شناسی دکھاتے ہوئے فون کر کے فوراً گھر اطلاع کی۔“ وہ اس کے پاس بیٹھا۔

”چلو۔ اب چھوڑ دو ٹینشن لینا۔ آئندہ کے لیے دھیان رکھنا کہ میرو کو کہیں بھی تنہا نہیں چھوڑنا۔“

بازو اس کے شانے کے گرد پھیلایا تو حریم کو یوں لگا جیسے وہ کسی محفوظ پناہ میں آگئی ہو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زیادہ کو ساری بات بتا دے لیکن وہ محض آنسو پی کر رہ گئی۔

☆☆☆

اک چاند تنہا کھڑا رہا، میرے آسمان سے ذرا پرے
میرے ساتھ ساتھ سفر میں تھا، میری منزلوں سے ذرا پرے
تیری جستجو کے حصار سے، تیرے خواب، تیرے خیال سے
میں وہ شخص ہوں جو کھڑا رہا، تیری چاہتوں سے ذرا پرے
بھی دل کی بات کہی نہ تھی، جو کہی تو وہ بھی دبی دبی
میرے لفظ پورے تو تھے مگر، تیری سماعتوں سے ذرا پرے

☆☆☆

”تم نے آمنہ سے کہا ہے کہ تم اسے پاکستان لے کر جاؤ گے؟“ عائشہ نے حیان الشافع کی گاڑی میں بیٹھتے ہی رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا تو وہ جواب دیے بنا گاڑی اشارٹ کرنے لگا۔

”خاموشی کا مطلب ہے کہ تم نے واقعی اس سے یہ وعدہ کیا ہے۔“ وہ دانت کچکچا کر بولی۔ حیان نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

”تو تمہیں کیا تکلیف ہے جب اس نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو جانے دوا سے۔“ وہ رکھائی سے بولا۔

”اور وہ ایک وعدہ۔ جو تم نے مجھ سے کیا تھا اس کا کیا؟“

”فضول باتیں مت کرو میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“ حیان نے غصے سے کہا۔

”تم نے کہا تھا کہ اسے کبھی بھی پاکستان نہیں جانے دو گے۔“ عائشہ نے اسے یاد دلایا۔

”وہ بے وقوف نہیں ہے جو ہمارے پلان پر چلتی رہے۔ عقل مند ہے اپنے پلان خود بناتی ہے۔“ جھٹکے سے گیر بدلتے ہوئے حیان الشافع نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بنانے دیتے پلان اسے۔ تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی اس کا ساتھ دینے کی؟“ عائشہ کو اس کا ارادہ بالکل

بھی پسند نہیں آیا تھا۔

”یہ ساری باتیں اپنی پہلی کو سمجھاتیں ناں۔ اب میرا دماغ کیوں کھارہی ہو۔“ وہ بیزار ہوا۔
”اس سے تو ضرور ہی بات کرنی تھی اور کربھی لی لیکن زیادہ قصور تمہارا ہے تمہاری مدد کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

”اسی لیے میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ آسانی کے ساتھ کر سکے۔ مجبوراً نہیں۔“ حیان کے چہرے پہ ضبط کی سرخی پھیلی۔
”تم اسے ایسے کیسے جانے دے سکتے ہو؟“ عائشہ نے بے بسی سے پوچھا۔
”میں اسے روک بھی نہیں سکتا اچھا ہے اسے صحیح صورت حال کا پتا کر کے اپنے ماضی سے چھٹکارا پالینے“

”دو۔“

حیان نے تیزی سے اسٹیرنگ گھماتے ہوئے ایک نظر بہن کو دیکھا، وہ ناراض سے تاثرات لیے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ حیان گہری سانس بھرتے ہوئے احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ اسے ڈرائیونگ کے دوران احساس معاملات پہ بحث بالکل بھی پسند نہیں تھی توجہ نہ ڈرائیونگ پہ رہتی تھی نہ بات پہ۔ عائشہ بھی یہ بات جانتی تھی سوچپ ہو رہی۔

☆☆☆

تجھ سے پھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا اسی در کے ہو گئے
اے یاد یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے درد ہجر ہم بھی تو پھر کے ہو گئے
آج بہت دنوں کے بعد وہ بالکنی میں کھڑا چوہوئیں کے بھرپور چاند کو دیکھتے ہوئے تہی دایاں ہونے کے احساس کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ حریم کے ساتھ سمجھوتے کی راہ پر چل تو پڑا تھا لیکن جب بھی کیٹھی سے کیے وعدے یاد آتے تو پاؤں تلے جیسے جلتے کوئلے بجھے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔
کہاں کھو گئی ہو یار۔ زندگی بھر یہ اذیت شاید بھول نہ پاؤں کہ میں نے بچ راستے میں تمہیں گنوا دیا۔ تنہا کر دینا جانے کیا سلوک کیا گیا تمہارے ساتھ۔

وہ درد کی انتہا پر تھا۔ دن میں تو وہ خود کو فرصت کے لمحات میسر آنے ہی نہیں دیتا تھا کہ جو اسے خود اذیتی کا شکار کریں۔ لیکن بعض اوقات تنہائی اس کے دل کے زخموں کو ادھیڑ ڈالتی تھی۔ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں بہت کھرا تھا، اس لیے حریم کو اپنی زندگی اور گھر میں وہ مقام دے دیا جو اس کا حق تھا۔ لیکن یہ دل۔ اور یہ جذبات و احساسات۔ موڑنے نہیں مڑتے تھے۔

اب بھی ٹوٹ کر اس لڑکی کی یاد آ رہی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی۔ اس کی پہلی محبت۔ پہلی محبت؟ وہ ٹھٹھا۔ تو کیا دوسری بھی؟

کنیتی کا تصور تو وہاں ہو جہاں کوئی ”اور“ بھی ہو۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
تم تھیں۔ تم ہی ہو۔ تم ایک اکیلی۔

اسی وقت ایک دم سے کافی کا بھاپ اڑا تاگ اس کے سامنے آ گیا تو وہ چونکا۔
”آپ کی کافی۔“ حریم اداس آنکھوں کے ساتھ مسکرائی وہ اپنے لیے چائے لائی تھی۔
”تھینک یو۔“ اس نے مگ تھام لیا اور بالکنی میں رکھی کرسی پہ آ بیٹھا۔

”آ جاؤ۔“ زیاد نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ اس کے مقابل آ بیٹھی۔
 ”آج رات بہت اداس لگ رہی ہے مجھے۔“ روشنی بکھیرتے چاند کو ایک نظر دیکھ کر زیاد نے گویا اسے بھی
 ”شامل خیال“ کرنا چاہا۔

”آج چودھویں کی رات ہے بہت خوب صورت اور مکمل چاند ہے۔ لیکن شاید تمہارا دل اداسی کی زد میں
 ہے۔ میں نے تو یہی سنا ہے کہ جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے۔ موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے۔“
 حریم بھی خود کو پریشانی اور ٹینشن سے نکالنا چاہتی تھی اس لیے مسکرا کر بات بڑھائی۔ زیاد نے گہری نظروں
 سے اسے دیکھا۔

”ہمم۔“ سچ کہہ رہی ہو۔ شاید اندر کا موسم ہی اداس ہے۔ بھیگا ہوا نم سا۔“ وہ اس کی تائید کرتے ہوئے بولا
 تو حریم کے لبوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”تم نے بہت جلدی کی تھوڑا سا انتظار کرتے تو کیتھی واپس آ جاتی تم اس سے شادی کر سکتے تھے وہ بھی
 میرب کے لیے ایک اچھی ماں ثابت ہوتی۔“
 حریم کی بات سن کر زیاد کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔

”اچھی بیوی وہ ہوتی ہے جو شوہر کو فضول اور پڑ مردہ خیالات سے نکال کر فریش کر دے تاکہ تم جیسی بے
 وقوف ہوتی ہے۔ خود شوہر کو کسی اور کو دان کر دینے والی۔“ زیاد نے اس کی لاپرواہانہ گفتگو پر طنز کیا۔
 ”ایم سوسوری۔“ وہ خفیف سی ہو کر بولی۔ ”مجھے لگا کہ تم اپنی گزشتہ زندگی کو سوچ کر اداس ہو رہے ہو۔“
 ”اس میں کوئی شک نہیں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا میں ماضی کی گلیوں میں ہی پھر رہا تھا۔ بیوی کے رشتے
 سے تم مجھے اپنی طرف پلٹا سکتی ہو لیکن یہاں تو ایسا کوئی سین ہی نظر نہیں آتا ہے۔“ زیاد نے گہری سانس
 بھری۔

”میں غاصب نہیں ہوں، نامکمل زندگی کا دکھ جانتی ہوں۔ کیتھی تم سے بچھڑ گئی تھی لیکن تمہارے انتظار میں
 ہوگی۔“

”انتظار میں ہوتی تو وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرتی لیکن وہ تو مجھ سے دنیا کی بھیڑ میں کہیں کھو ہی گئی ہے۔“ زیاد
 بحرمانہ انداز میں بولا تو حریم کی رنگت فق ہونے لگی۔

”میں اسی لیے ماضی سے تمہارا پیچھا نہیں چھڑانا چاہتی تھی۔ تاکہ کل کو اگر کیتھی واپس آئے تو تمہیں اس کے
 حوالے کرتے ہوئے میرا دل نہ دکھے۔“ حریم نے الگ ہی بات کی تو وہ ششدر سا اسے دیکھنے لگا۔
 ”بے وقوف لڑکی! تم محبت کرنے سے ڈرتی ہو۔“

”نہیں۔ میں کسی کا حق مارنے سے ڈرتی ہوں۔“ حریم نے فی الفور کہا۔
 ”محبت کو پا کر کھونا ایسا ہی ہے کہ جیسے انسان اپنی زندگی کی سب سے قیمتی اور پیاری چیز کھودے، میں
 بہت چھوٹے دل کی لڑکی ہوں میری قیمتی چیز کھو جائے تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو
 آگئے تھے۔

اس کی باتوں نے زیاد کی سوچوں کا رخ بدل دیا اب وہ محظوظ انداز میں مسکرا رہا تھا پھر اس نے دلچسپی سے
 پوچھا۔

”اچھا اور کس بات سے دکھی ہوتی ہو تم؟“
 ”ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے۔ جیسے اماں مجھ سے زیادہ نرمین سے پیار کرتی تھیں تو مجھے بچپن میں
 بہت دکھ ہوتا کیونکہ میں اماں کی زیادہ فرماں بردار تھی لیکن پہلی اولاد ہونے کے ناتے نرمین نے اماں اور ابا دونوں

کی سب سے زیادہ محبت وصول کی۔“
 ”اولاد تو ساری ایک جیسی ہوتی ہے، کم یا زیادہ محبت والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ زیادہ نے کہتے ہوئے کافی کا گھونٹ بھرا۔

”بس کچھ بچے اپنی عادات و خصائل کی بنا پر والدین کے دل کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔“ حریم نے مختصراً جواب دیا۔

وہ خاموش ہوئی تو یوں لگا جیسے بات کرنے کو کچھ نہ بچا ہو۔ ان دونوں نے خاموشی سے اپنی کافی اور چائے ختم کی۔

زیادہ نے خالی مگ حریم کی طرف بڑھایا، مگ تھامتے ہوئے حریم نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر مضبوط لہجے میں کہا۔

”مجھے تمہیں ایک بہت ضروری بات بتانی ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر رک گئی۔ زیادہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا حریم نے تھوک نکل کر گلہ کیا اور پھر اس سے گویا وعدہ لیا۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ تم غصہ یا ناراض تو نہیں ہو گے؟“

”ناراض کیوں ہوگا؟ کیا تم نے کچھ غلط کیا ہے؟“

”ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔“ حریم نے اس سے نظر ملائے بغیر اعتراف کیا۔

”اب تم نے یہ بتا دیا ہے کہ کچھ غلط کیا ہے تم نے تو اب بات سنے بغیر کیسے وعدہ کر سکتا ہوں نہ ڈانٹنے کا۔“ زیادہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

”نہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ اسے سننے کے لیے تمہیں پہلے مجھ سے ناراض نہ ہونے اور نہ ڈانٹنے کا وعدہ کرنا پڑے گا۔“ حریم نے اپنے ہاتھوں کی لرزش سے قابو پانے کی کوشش کی۔

”چلو ٹھیک ہے، کیا یاد کرو گی وعدہ رہا نہ ڈانٹوں گا اور نہ ہی ناراض ہوں گا۔“ وہ ہنس دیا

حریم نے نے دونوں مگ نیبل پر رکھے اور اپنی پوری ہمت جمع کرتے ہوئے ذرا سی پلکیں اٹھا کر زیادہ کے مسکراتے چہرے کو دیکھا، اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ اس کی بات سن کر وہ دوبارہ بھی حریم کے لیے نہیں مسکرائے گا۔ شاید نہیں۔ کبھی نہیں۔

”یقیناً تمہیں کال کی تھی۔“ اس نے گہرا کراہیک دم سے کہہ دیا تو زیادہ کے تاثرات بدلے۔

”کیا کہا؟ کہاں، کب۔ میں نے تو ابھی اپنا موبائل چیک کر کے رکھا ہے مجھے تو کوئی کوئی کال دکھائی نہیں دی۔“

”ابھی نہیں۔ جب ہم فارم ہاؤس پر تھے۔“ حریم نے مجرمانہ انداز میں کہا

”تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ زیادہ نے بمشکل ضبط کیا۔

”میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔“

اس نے ساری زندگی کا فلسفہ ایک جملے میں سمو دیا تھا زیادہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔

”اس کا نمبر میں نے بلاک لسٹ میں ڈال دیا تھا۔ تاکہ تم نہ دیکھ سکو۔“ وہ آنسو بہاتے ہوئے اعتراف

کر رہی تھی۔ اور زیادہ دم بخود سا منزل کو اپنے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

کار کی سہولتی زندگی

کی کہانی تحریر ہے..... روز و شب مقید ہیں۔ ناز برداریاں ہیں محبت کی، بند پلکوں کے پیچھے بنے گئے ادھورے خوابوں کے عکس سارے روشن ہیں بہت روشن..... یوں جیسے تاروں بھری شب، چودھویں کا چاند یا جیسے کسی مندر کنارے بنے تالاب میں ڈھیروں ٹٹمٹاتے ہوئے دے..... جیسے دیپ مالا..... مگر.....

کہانی کار کوئی اور نہیں میرا شوہر ہے۔
اور المیہ یہ ہے کہ میں اس کہانی کا دوسرا نہیں
تیسرا کردار ہوں.....“

☆☆☆

”میں پر سیا بخاری ہوں۔ ذہانت اور خوب صورتی کا حسین امتزاج۔ مقابلے کو جیت لینے والی، ہر امتحان کو سر کر لینے والی، زندگی سے بھرپور زندہ دلی کی جیتی جاگتی تصویر..... مجھے مات نہیں پسند۔ میں نے کبھی ہار نہیں دیکھی میں بلا کی ذہین ہوں ہمیشہ جیت جاتی ہوں۔ مجھے پہلے نمبر پر رہنا پسند ہے اور میں ہمیشہ پہلے نمبر پر ہی رہتی ہوں چاہے کتنا ہی مشکل امتحان کیوں نہ ہو.....“

تیز روشنی نے میری بند پلکوں پر دستک دی تھی میں نے مندی مندی آنکھوں کو بمشکل کھولنے کی کوشش کی۔ ممانے میرے بیڈروم کے گلاس ڈور پر پڑے بھاری دبیز پردے ہٹا دیے تھے گلاس ڈور کے اس پار کا پورا منظر دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ تیز چھتی ہوئی روشنی میرے نیم تاریک کمرے کو روشن کر گئی تھی۔ ممانے کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹا تھا کار پیٹ پر بکھرے کشنز کو صوفے پر ترتیب سے رکھنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئی پھیں تب تک میں

پیار کی ہر ایک رسم جو متروک تھی میں نے جاری کی عشق لبادہ تن پر پہنا، اور محبت طاری کی محبت روح کو چھو لے تو دل کی نگری سچ جانی ہے محبوب کا خیال بھی دل کا آنگن مہکا دیتا ہے۔ گہری بہت گہری محبتیں مجسم نہ ہوں تو بھی وجود رکھتی ہیں۔ محسوس ہوتی ہیں۔ محبت کی آنکھوں سے چھلکتی رہتی ہیں مالکانہ حق رکھتی ہیں کسی ملکہ کی سی شان لیے دل کے محل میں چہار سو گھومتی چکراتی رہتی ہیں۔

”کہانی کار نے بہت خوب صورتی سے محبت کی کہانی ترتیب دی تھی لفظوں کو عقیدت و احترام کی بنت دے کر بڑے دل سے کار گیری کی گئی تھی ہر ورق پر سچے نئے الفاظ مہکتے جذبات پر کہانی وہی پرانی..... محبت کی.....“

میں سوچ میں پڑ گئی بھلا یہ ادھوری محبتیں ہی کیوں اتنی با اثر ہوتی ہیں؟ سچے جذبوں کی تپن سے دھک رہی ہوتی ہیں۔ کبھی کسی کی مکمل محبت نے تو تاریخ کے پتوں پر اپنا عکس نہیں چھوڑا۔ ہمیشہ ادھوری محبتیں ہی امر ہوتی ہیں۔ لیلیٰ مجنوں، ہیرا رنچھا، سوہنی مہینوال، شیریں فرہاد سب کے سب ادھوری محبتوں کے امر کردار.....

شاید ان محبتوں کو بھی منزل مل جاتی تو کردار بھی وقت کی دھول کی نذر ہو جاتے۔ ان کی ادھوری محبتوں نے ان کرداروں کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ ادھوری محبتیں مکمل محبتوں سے زیادہ با اثر ہوتی ہیں محبت کو منزل مل جائے تو جذبات میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے مگر ادھوری محبتیں زندگی بھر دکھتا ہوا نگارہ بنی رہتی ہیں اور محبت کی راہوں کا مسافر ان کی تپش سے جلتا رہتا ہے.....

میرے سامنے بھی نیلے رنگ کی ڈائری میں محبت

تھے، مصروف سے انداز میں مجھے جگا کر وہ جاچکی تھیں۔
میں جواب تک سوئی جاگی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ بمشکل
پوری آنکھیں کھول کر گھڑی پر نگاہ ڈالی تھی ایک ایک بجنے
کو تھا یعنی پورے دو بجے حیات احمد نے یہاں موجود ہونا
ہے اور میں جانتی تھی وہ کس قدر وقت کا پابند ہے۔ تیزی
سے اٹھ کر میں نے واش روم کا رخ کیا تھا۔

☆☆☆

بلو جینز پر لیسن کلر کی گھنٹوں تک آتی شرٹ پہن کر

تھوڑی بہت ہوش میں آچکی تھی۔

”پریرا! دوپہر ہونے کو آئی ہے۔ اب اٹھ جاؤ بیٹا،
ماتا کہ تمہارے سمسٹر کل ختم ہوئے ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو
نہیں کہ سارا دن سو کر گزار دو۔ حیات کب سے تمہیں کال
کر رہا ہے پتا نہیں کتنی گہری نیند سوتی ہو تم، بتا رہا تھا کہ تم
لوگوں کا بیچ کا پروگرام ہے۔ ایک گھنٹے تک تمہیں پک
کرنے آئے گا، اٹھ کر فریش ہو جاؤ شاباش۔“

ممانے سائنڈ ٹیبل سے خالی مگ اور گلاس اٹھائے



میں نے گلے میں ملٹی کلر اسکارف پہنا تھا کانوں میں سلور ٹوپس ڈال کر اپنے سیاہ تراشیدہ بالوں کو حسب معمول کھلا چھوڑ دیا تھا۔ دو بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ میں ریڈی ہو کر لاؤنج میں چلی آئی ممالاؤنج کے ساتھ بنے بچن میں میرے لیے فریش جوس نکال رہی تھیں۔ تب ہی وہ چلا آیا تھا ہمیشہ کی طرح تازہ دم، وہ نارمل ڈریسنگ میں تھا شاید آفس سے سیدھا آرہا تھا۔

”السلام علیکم“ ہمیشہ کی طرح حسب عادت بلند آواز سے سلام کر کے وہ صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور اب پوری طرح میری طرف متوجہ تھا۔

”یار! کتنا سونی ہو تم کب سے تمہیں کال کر رہا ہوں مجال ہے جو ایک کال بھی پک کی ہو تم نے، حد ہمارے“ میں ذرا کی ذرا شرمندہ ہوئی تھی۔

”ہاں بس وہ کل سمسٹرز کی ٹھکن کی وجہ سے نیند گہری آگئی۔“ میں بے چارگی سے بولی تو وہ مسکرا کے رہ گیا..... ماما جوس لے آئی تھیں۔

”آپ نے کیوں زحمت کی آنٹی! اس کی ہم بس نکلیں گے اب۔“

اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، وہ سدا کا وقت کا پابند تھا..... ممانے گلاس اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

”بی لوف فریش ہو جاؤ گے آفس سے آرہے ہوتا؟“

”جی آفس سے آرہا ہوں ہمارے ابا حضور۔ کہاں چھٹی کرنے دیتے ہیں۔“ ماما کے استفسار پر وہ بے چارگی سے بولا تھا۔

”ٹھیک ہی تو کرتے ہیں، روز روز چھٹیاں دیں گے تو ہو گیا پھر کام۔“ ممانے مبینوی آنکھیں دکھائی تھیں۔

”جی جی، صحیح فرمایا آپ نے۔“ اس نے گردن ہلا کر ماما کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ وہ غلٹ میں جوس ختم کر رہا تھا۔

”جلدی کرو پرپسا۔“ گلاس رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا.....

تب ہی لاؤنج کے بائیں طرف بنی اوپر منزل کو جاتی سیڑھیوں پر دھانی رنگ کا آپچل لہرایا تھا سینئر نیبل سے چابیاں اٹھاتے ہوئے وہ ذرا کی ذرا اٹھا تھا.....

بس چند ثانیے..... اگل ہی لمحے ماما کو خدا حافظ کر کے مجھے جلدی آنے کا کہتے ہوئے مڑا تھا اور تیزی سے

باہر نکل گیا تھا۔ میں بھی گلاس رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”پچی جان!“ میں نے عقب سے آتی آواز پر مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی شاید جھک کے رک گئی تھی۔ سبز رنگ کی لمبی قمیص اور چوڑی دار پا جاسے پر دھانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ ماما سے مخاطب تھی۔

”آؤ بیٹا وہاں کیوں کھڑی ہو، آ جاؤ۔“ حسب معمول ماما کے لہجے میں شہد گھلا ہوا تھا۔

گاڑی کے تیز ہارن پر مجھے خیال آیا کہ باہر کوئی میرا منتظر کھڑا ہے۔ ماما کو اللہ حافظ کہہ کر میں نے تقریباً بھاگتے ہوئے لاؤنج کا دروازہ عبور کیا تھا۔

حیات احمد اسی کالونی کے اگلے بلاک میں رہنے والی میری اکلونی خالا کا اکلوتا بیٹا.....

سارا بچپن اکٹھے گزرا تھا۔ اسکوٹنگ بھی ایک ہی جگہ سے ہونے کی وجہ سے میرے اور اس کے کئی مشترکہ دوست تھے۔ حیات سے چھوٹی ایل، ہم دونوں سے ہی

عمر میں کافی چھوٹی تھی اس لیے وہ ہمارے گروپ میں شامل نہیں ہو پائی تھی۔ ہمارے مشترکہ دوستوں کا

گروپ اکثر دبیشٹر لنچ یا ڈنر رینج کرتا رہتا تھا۔ آج بھی میرے سمسٹرز کے ختم ہونے کے بعد ہم سب نے اکٹھے

لنچ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کافی دنوں بعد سب سے مل کر وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ایک بھر پور دن

دوستوں کی سنگت میں گزار کر شام چھ بجے حیات مجھے واپس گھر ڈراپ کر گیا تھا۔

ممائی وی پر آنے والے کسی کو کنگ شو میں کھوئی ہوئی تھیں۔ میں سلام کر کے ان کے پاس ہی صوفے پر براجمان ہو گئی۔

”علیکم السلام۔ حیات اندر نہیں آیا؟“ ممانے لاؤنج کے داخلی دروازے پر نگاہیں دوڑائی تھیں۔

”نہیں تھک گیا تھا۔ گھر ہی چلا گیا۔“ میں نے صوفے کی پشت سے سر نکالتے ہوئے کہا۔

ممانے پھر سے اپنی توجہ ٹی وی کی جانب مبذول کر لی تھی۔ شیف کوئی اسپیشل قسم کی بریانی بنانا سکھا رہا تھا۔

بریانی کی کئی اقسام تو ماما خود بہت اچھی بناتی تھیں۔ اب نہ جانے یہ کون سی خاص بریانی تھی جو ماما

بھی نہیں..... نو عمری سے ہی وہ جھجکنے لگی تھی۔ حیات کی موجودگی میں وہ نیچے آنے سے گریز ہی کرتی تھی۔ فطرتاً وہ شرمیلی طبیعت کی مالک تھی۔ کچھ کم گو اور سنجیدہ بھی..... میں اور حیات جی بھر کے ہنگامہ پرور، تو بھلا کیسے بنتی اس کی ہمارے ساتھ.....

ہم جس کلاس سے تعلق رکھتے تھے وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی دوستی عام بات تھی ہمارے دوستوں کے گروپ میں بھی لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی شامل تھے۔ ”میں نے بھی نہیں دیکھا کہ حیات کسی لڑکی کو دیکھ کر اس طرح ٹھنکا ہو گو کہ وہ کیفیت لمحہ بھر کی تھی مگر میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں بلا کی ذہین لڑکی ہوں..... جو نتیجہ میں نے حیات کی اس ایک نگاہ سے اخذ سے کیا تھا۔ وہ محض میرا وہم نہ تھا، حیات احمد کے ساتھ ساتھ میں بھی اس لمحے میں مقید ہو گئی تھی۔ کچھ کچھ تھا اس ایک نگاہ میں، کچھ بہت خاص۔ کچھ غیر معمولی.....

وہ لمحہ مجھے الجھا گیا تھا.....

☆☆☆

میرا ایک بہت اہم اسائنمنٹ تھا میٹھ کا..... جو مجھے کل لازمی سب مٹ کروانا تھا بہت سے پوائنٹس کلیئر نہیں ہو رہے تھے اور میٹھ کا ماسٹر حیات احمد نہ جانے کہاں غائب تھا۔ تیسری بار میں نے پھر اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ ”آ رہا ہوں یار! بولا تو ہے آ رہا ہوں فری ہو کر۔ ذرا صبر نہیں ہے تمہیں۔“ وہ بری طرح سے چڑ گیا تھا شاید بڑی تھا کسی کام میں.....

”اچھا ٹھیک ہے۔ ویٹ کر رہی ہوں آ جانا۔“ میں نے مرے مرے انداز میں کہہ کر فون بند کیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ میرے سامنے موجود تھا وضاحتوں کے ساتھ۔

وہ ایسا ہی تھا، تھوڑا نرم گرم سا مزاج تھا اس کا غصہ آتا بھی تھا تو بس دس منٹ کا فطرتاً وہ نرم مزاج کا ہی بندہ تھا۔

”بڑی تھا، میں آفس کا کچھ کام تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فری ہوا ہوں۔ حد سے زیادہ بے صبری ہو تم..... دکھاؤ، کیا حل کروانا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

اتنے انہماک سے دیکھ رہی تھیں۔ کچن سے کھڑ پڑکی آوازیں آرہی تھیں وہ کچن میں موجود تھی، کچھ دیر بعد وہ چائے کے ساتھ چند لوازمات لیے چلی آئی تھی۔ ”ہیلو پرینا! کیسی ہو؟“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”بالکل ٹھیک۔ تم سناؤ۔“ میں نے بھی مسکراہٹ چہرے پر سجائی تھی۔

”ٹھیک ہوں..... چائے لوگی تم؟“ اس نے مگ میری طرف بڑھایا۔ ”نہیں کسی چیز کی منجائش نہیں ہے، فریش ہو کر آتی ہوں۔“

میں نے معذرت کر کے اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ اس نے ایک گم ماما کو پکڑا یا تھا اور دوسرا خود اٹھا کر بریانی کے دم میں گم ہو گئی تھی.....

☆☆☆

آفرین بخاری تایا جان کی تین عد صاحب زادیوں میں سے سب سے بڑی تھی۔ فریٹ کزن اور ہم عمر ہونے کے باوجود ہماری دوستی نہیں تھی ہمیشہ ایک تکلف سیائل رہا ہمارے درمیان..... ہاں وہ ماما کی بچی سیلی تھی۔ اس کے سارے شوق بھی ماما جیسے تھے کوئنگ، بیکنگ، ڈریس ڈیزائننگ، فائن آرٹس اور میری دلچسپیاں بالکل مختلف..... سوئمنگ، ہائیکنگ، کیمپنگ، اسپورٹس، لڑکیوں والے شوق مجھ میں ذرا بھی نہیں تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ میری ماما کا پرتو تھی۔ تب ہی ماما کی اور اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔

تایا جان کی کچھ سال پہلے ڈیجھ ہو گئی تھی۔ تب سے ماما اور بابا ہی آفرین، نرمین، شرمین اور تائی جان کا خیال رکھتے تھے۔ اگرچہ میرا کوئی بھائی بہن نہیں تھا میں اپنے والدین کی اکلونی اولاد تھی، اس کے باوجود میری اپنی کزن سے ویسی دوستی اور بے تکلفی نہیں تھی جیسی ہونی چاہیے تھی، وجہ شاید یہی تھی کہ میرا مزاج تھوڑا الگ تھا۔

میرے سارے اوٹ پٹانگ شوق حیات ہی پورے کرتا تھا کیونکہ میرے اور اس کے شوق ایک جیسے تھے۔ بچپن میں تو ایک آدھ یار ہمارے ساتھ آفرین بھی کھیل میں شامل ہو جاتی تھی مگر اب تو بالکل

تین سال سے لندن گیا ہوا تھا کچھ ماہ پہلے ہی لوٹا تھا۔
لندن سے آنے کے بعد پہلی بار حیات اور
آفرین کا آمناسا منا ہوا تھا۔

حیات کا اس قدر متوجہ ہونا اور پھر ایک لمحے کو کھو
ساجانا مجھے حیران کر رہا تھا۔ توجہ کا ایک لمحہ دل پر اثر کر
گیا تھا اس سے پہلے بھی حیات نے دبوسی آفرین کو
قابل توجہ ہی نہیں جانا تھا۔

میز سے چائیاں اٹھاتے وہ ایک لمحہ کے لیے نظر
کاٹھہر جانا کمال کر گیا تھا۔ ایسا کمال کہ دوسری بار بھی
اس کے آنے اور جانے پر نگاہوں نے پلٹ جانے
سے انکار کر دیا تھا۔ نگاہ کا ٹھہر جانا اور بات ہے اور دل
کا ٹھہر جانا اور.....

مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ نگاہیں من پسند چیز
پر ہی ٹھہرتی ہیں جس شے پر دل مائل نہ ہو وہاں سے
نگاہیں بغیر کے پلٹ آتی ہیں۔ پتا نہیں حیات احمد کا
دل ٹھہرا تھا یا نگاہ..... مگر کچھ غیر معمولی سا تھا جو مجھے
محسوس ہو رہا تھا.....

میں نے دل کو ٹٹولا تھا۔ مجھے حیات سے محبت
نہیں تھی۔ دوستی تھی، بچپن کا ساتھ تھا، انسیت تھی ہاں
مگر محبت نہیں تھی..... پھر بھی میں اپنا اور آفرین کا
تقابلی جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔

وہ سرو قد تھی گندم کی سنہری بالیوں جیسی رنگت،
ہلکے سے سنہری مائل بال، نازک سراپا اور اوپری لب کا
کٹاؤ دل فریب تھا۔

میرا قد درمیانہ تھا مگر میں بلا کی حسین تھی گوری
رنگت پر گہری سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، گھنے سیاہ تراشیدہ
بال اور تھکے نقوش، میرا حسن شعلہ جوالا تھا سمندر کی
بھری ہوئی موجوں جیسا اور اس کا ٹھنڈے میٹھے پانی کے
چشموں جیسا مدھم سر دل میں بہتی ندیوں جیسا.....

میرے حسن کی چکا چوند سامنے والے کی نگاہیں
چند ہیادیتی تھی مگر آفرین کے چہرے پر بلا کی ملاحیت
تھی اس پر نگاہ ٹھہر جاتی تھی..... ہاں تب ہی تو حیات
احمد کی نگاہ ٹھہر گئی تھی..... آفرین بخاری پر.....

☆☆☆

میں نے خاموشی سے فائل سامنے کر دی تھی۔ وہ
پورے دھیان سے مجھے اپنے مخصوص انداز میں سمجھا رہا تھا
جب سیڑھیوں پر ہونے والی آہٹ پر ہم دونوں نے چونک
کر سر اٹھایا تھا۔ میں نے تو دوسرے ہی لمحے دوبارہ فائل پر
نگاہ مرکوز کر لی تھی مگر حیات کی نگاہ ٹھہر گئی تھی.....

وہ آفرین تھی۔ ہاتھ میں بڑی سی پلیٹ یقیناً
بریانی کی تھی کیونکہ بڑی دیر سے بریانی کی دلفریب
مہک اوپر سے مستقل آرہی تھی۔ جھکی نظر اور سنج
قدموں سے زینہ اتر کر وہ کچن میں مڑ گئی۔

حیات نے واپس اپنی توجہ سوالوں کی جانب کی تھی
اور سلسلہ وہیں سے جوڑا تھا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ وہ
بڑی دل جمعی سے میرا سائنٹس مکمل کروا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد آفرین نے کچن سے نکل کر واپس
سیڑھیوں کا رخ کیا تھا اور حیات احمد کا قلم ایک بار پھر
رکا تھا۔ میں نے حیرانی سے حیات کی کھٹی ہوئی
نگاہوں کا تعاقب کیا تھا۔

آج آفرین نے ہلکے زرد رنگ کا سوٹ پہنا ہوا
تھا اس کے بال سیاہ نہیں تھے ہلکا سا سنہری پن لیے
ہوئے تھے گھنے بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی کمر تک آتی
تھی اس کے ہر قدیم کے ساتھ اس کی چوٹی نازک سی
کمر پر بل کھا جاتی تھی۔

مجھے نہیں پتا کہ حیات احمد کا دل سنہرے بالوں
کی چوٹی کے کس بل میں اٹکا تھا۔ ہاں مگر اٹک گیا
تھا..... وہ زینہ عبور کر گئی تھی ہوئی نگاہیں بھی پلیٹ
آئی تھیں مگر پھر وہ تسلسل نہیں رہا تھا۔ وہ کئی بار اٹکا تھا
یوں جیسے اس کا دھیان بار بار کہیں اور بھٹک رہا ہو جس
توجہ سے وہ مجھے سمجھا رہا تھا، وہ اب نہیں رہی تھی۔

باقی کے سوالات حل کروا کر وہ چلا گیا تھا.....
میرے لیے سوچ کا نیا دروا کر کے.....

☆☆☆

ایسا نہیں تھا کہ حیات نے آفرین کو پہلی بار
دیکھا تھا۔ بچپن کا ساتھ تھا اور حیات کا ہمارے گھر
آنا جانا عام سی بات تھی تو ظاہر ہے کہ آمناسا منا بھی
اکثر ہوتا رہتا تھا۔ حیات اپنی اسٹڈیز کے سلسلے میں

پہنتی ہے۔“ وہ اپنی ٹون میں واپس آچکا تھا اور اب بہت ہی خاص بات عام سے انداز میں کر رہا تھا۔ بات نگاہ سے دل اور دل سے زبان پر آگئی تھی.....

”ہا نہیں۔ ہو سکتا ہے اسے یہی رنگ پسند ہوں۔“ میں نے کندھے اچکائے تھے۔ ”مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ وہ میری کھوجی نگاہوں سے گھبرا گیا تھا۔

”یوں ہی بس، تم سناؤ لاسٹ سمسٹرز کی تیاری کہاں تک پہنچی؟“ اس نے بات بدل دی تھی۔

”چل رہی ہے آل موسٹ کمپلیٹ ہونے والی ہے بس۔“ تب ہی ممتا تیار ہو کر کمرے سے نکلی تھیں۔

”پر سیا آگئی ہو بیٹا! کچن میں دیکھ لینا، چاول دم پر لگے ہیں آپا نے ایک دم ہی بلا بھیجا۔ آفرین بچی نے کھانا تیار کیا ہے۔ تم کھانا کھا کر آرام کرو اور ہاں چولہا یاد سے بند کر دینا۔“

مما مجھے ہدایات دے کر حیات کے ساتھ چلی گئی تھیں۔

اس دن میں نے ایک بار پھر اپنے دل کو ٹٹولا تھا میں نے بتایا تھا نا کہ مجھے حیات سے محبت نہیں تھی۔

آفرین سے حسد یا جلن بھی نہیں تو پھر ایسا کیا تھا جو مجھے بے چین کر رہا تھا۔ مجھے آفرین اور حیات کو ساتھ دیکھ کر عجیب سی الجھن کیوں ہونے لگی تھی۔ کون سا خوف تھا میرے دل میں جو بچے گاڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

”ہار جانے کا خوف۔“

میرے اندر سے آواز آئی تھی۔

ہاں ہار جانے کا خوف، مسترد کیے جانے کا خوف پیچھے رہ جانے کا خوف۔“ مجھ جیسی حسین ترین، ذہین ترین اور طرح دار کزن کو چھوڑ کر حیات کا آفرین کو منتخب کرنا مجھے خاندان بھر میں سبکی کا شکار کر سکتا تھا۔

خیالوں کا جال بنتے عجیب سے دوسووں اور اندیشوں میں ڈوبتے ابھرتے کب آنکھ لگی مجھے پتا ہی نہیں چلا.....

☆☆☆

میرا ماسٹرز کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا اور حسب معمول رزلٹ بورڈ کے ٹاپ پر میرا نام جگمگا رہا تھا۔ بابا نے میرے اعزاز میں ایک پارٹی اریج کی تھی کچھ

پھر اکثر میں نے محسوس کیا کہ حیات احمد کی نظریں اوپری منزل کی سیڑھیوں پر کچھ تلاشتی رہتی ہیں۔ وہ آتا تھا اسی سلسل سے مگر بے قراری اس کی

نگاہوں سے اور بے چینی اس کے وجود سے چھلکتی رہتی تھی۔ بے پناہ دوستی ہونے کے باوجود اس نے اب

تک مجھ سے کوئی بات شیئر نہیں کی تھی..... اس دن میں یونیورسٹی سے لوٹی تو حیات کو کچن کے دروازے

پر استادہ پایا۔ حیات کی میری طرف پشت تھی، وہ دھیمی آواز میں کسی سے مخاطب تھا مجھے لگا کہ ماما ہوں گی

مگر حیرانی مجھے اس وقت ہوئی جب آفرین، حیات کے سائیڈ سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس

کے چہرے پر ٹھہرے ہوئے رنگ اور دھیمی مسکراہٹ آنکھوں کی بڑھی ہوئی جوت مجھے کسی انہونی کا اشارہ

دے رہی تھی۔ حیات سرشار سا مڑا تو ایک اطمینان سا اس کے روم روم سے جھلک رہا تھا۔

”خیریت تم اس وقت کیسے؟؟“ میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا تھا۔

”آں ہاں۔ وہ آفس سے آف کیا تھا آج۔“ وہ سر جھٹک کر بولا تھا یوں جیسے اپنی کیفیت سے لگنا

چاہ رہا ہو۔

”تو؟“..... میں نے ٹٹولتی ہوئی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کی تھیں جہاں ابھی بھی مدہم مسکراہٹ بچی ہوئی تھی۔

”تو یہ کہ آنٹی کو لینے آیا ہوں۔ امی کو بازار جانا ہے ان کے ساتھ۔“ اب کی بار اس نے تفصیل

سے جواب دیا تھا۔

”اچھا آؤ بیٹھو۔“ میں نے لاؤنج کے صوفوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تھا کھویا کھویا سا میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تھی۔

”کہاں گم ہو؟“

”دھنک کے رنگوں میں۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ میں نے سن کر بھی ان سنا کیا تھا۔

”یار یہ تمہاری کزن نے قوس قزح کے سارے رنگوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ سارے رنگ ہی

قریبی فریڈ ز اور فیملیز مدعو تھیں۔ برقی قمقمے لان میں جگہ گارہے تھے۔ میں نے اس دن اپنے لیے کالے رنگ کی خوب صورت سی میکسی کا انتخاب کیا تھا جو میری گوری رنگت پر بے حد بیچ رہی تھی۔

میں بہت خوش تھی اور میری خوشی میں حیات آگے آگے تھا۔ محفل اپنے عروج پر تھی جب آفرین نے تائی جان، نرین اور شرمین کے ساتھ لان میں قدم رکھا تھا۔ آج اس نے دھنک کے ساتوں رنگ چھوڑ کر آٹھواں رنگ زیب تن کیا ہوا تھا۔ سوئے اتفاق اس نے بھی آج سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ سیاہ نیٹ کی لمبی قمیص، چوڑی دار پا جامہ اور نیٹ کا بڑا دوپٹہ شانوں پر پھیلائے وہ عام دنوں سے کچھ مختلف لگ رہی تھی آرائش کے نام پر اس کی آنکھوں میں کاجل کی دھار اور ہونٹوں پر نیچرل لپ لکڑ تھا۔ سنہری مائل بال حسب معمول ڈھیلی سی چوٹی میں قید تھے۔ چند شریر لہجے چوٹی سے آزاد ہو کر گندی چہرے کو سنہرا پن بخش رہی تھیں۔

میں نے حیات کو دیکھا تھا۔ وہ دور قدرے فاصلے پر کچھ رشتہ داروں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا مگر اس کی نگاہیں محتاط انداز میں آفرین پر جمی ہوئی تھیں اور ان میں سچے ستائش کے رنگ مجھے باخوبی نظر آرہے تھے۔ صرف چند سیکنڈ میں ہی مجھے اپنا ہزاروں کا ڈیزائنز ویر بے قیمت ہوتا محسوس ہوا تھا میں نے سر جھٹک کر اپنے اس خاص دن کو انجوائے کرنے کی بہت کوشش کی مگر میرے اندر پلتے خدشات مجھے پوری طرح خوش ہونے نہیں دے رہے تھے۔

سرے سے سر، کڑی سے کڑی ملتی گئی اور میرے دل میں پلتے خدشات پر یقین کی مہر اس دن لگی جب ایک سر د دن میں بیچ کے بعد یونہی چہل قدمی کرتے کرتے خالا کے گھر جا پہنچی۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے میرے لیے دروازہ وا کر دیا تھا۔ لان عبور کر کے میں نے لاؤنج کا دروازہ کھولا تھا اور وہیں میرے قدم دائیں طرف بنے خالہ کے کمرے سے آئی آوازوں نے جکڑ لیے تھے۔

”مما! میں اس معاملے میں سیریس ہوں آپ پلیز جلد سے جلد زرینہ آنٹی سے بات کریں تاکہ وہ انکل اور تائی جان سے بات کر سکیں۔“ آج چونکہ سنڈے تھا۔ حیات گھر پر ہی موجود تھا وہ خالہ سے کس سلسلے میں بات کر رہا تھا، یہ میں جانتی تھی۔“

مگر بیٹا میں کس طرح زرینہ سے بات کروں وہ کیا سوچے گی کہ اس کی بیٹی کے ہوتے ہوئے ہم نے تمہارے لیے کسی اور لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔ بیٹی کی ماں ہے اس کے دل پر ضرب نہ پڑ جائے پھر میری سکی بہن ہے، میں احساس نہیں کروں گی تو کون کرے گا۔“ خالا مجھے کا شکار تھیں۔

”امی! میرے اور پر سیا کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ بے فکر رہیں پھر پر سیا تو بہترین لڑکی ہے اس کے لیے رشتوں کی کیا کمی بھلا۔“ وہ بغد تھا اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

”پر سیا آپنی بہت اچھی ہیں۔ ہماری اپنی ہیں مگر بھائی کے ساتھ آفرین آپنی بہت اچھی لگیں گی، ان کا قد بھی کتنا لمبا ہے، بھائی کے ساتھ ان کا بیئر بہت جچے گا۔ مجھے بھی وہ پسند ہیں، آپ زرینہ آنٹی سے بات کر کے تو دیکھیں۔“ ایمل پر شوق لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔

پتا نہیں پھر خالہ نے کیا کہا..... حیات نے کیا دلائل دیے۔ میں رکی نہیں تھی۔ پلٹ آئی تھی خاموشی سے..... ”تو میں بہت اچھی تھی۔ میں ہر جگہ تھی مگر میں کہیں نہیں تھی مجھے مسترد کیا جا رہا تھا۔ نہیں مجھے مسترد کیا جا چکا تھا، تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی تھی۔ دوسووں اور اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھار کر مجھے از حد بے چین کر دیا تھا مگر میں نے بتایا تھا تاکہ میں بلا کی ذہن لڑکی ہوں۔ میں کبھی نہیں ہاری اور میں ہار ماننے والوں میں سے ہوں بھی نہیں.....

اسی دن چند گھنٹوں کے بعد میں نے اپنی یونیورسٹی کی قریبی دوست ندا کو فون ملا یا تھا۔

”ہیلو ندا! کیسی ہو؟ ابراہیم بھائی کے لیے لڑکی مل گئی یا نہیں۔“ میں نے ڈائریکٹ مدعا پر بات کی

ہی ہی زاماں بیٹھا ہاضب سے سر چہرہ ہے۔۔۔ چہرہ
کر خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔
نکاح کی ساری تیاری مکمل تھی کارڈ بٹ چکے
تھے۔ ابراہیم بھائی جدہ سے آچکے تھے۔
اب حیات کے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا وہ کچھ
بھی کر کے حالات کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا وقت اس
کے ہاتھوں سے ریت کے ذروں کی مانند پھسل گیا تھا
وہ بالکل بے بس تھا..... اور میں مطمئن.....

میں جانتی تھی وقتی کیفیت ہے وہ جلد اس کیفیت
سے نکل آئے گا پھر ایسا ہی ہوا۔ دو مہینے بعد آفرین
رخصت ہو کر جدہ چلی گئی۔ زندگی پھر سے معمول پر
آگئی حیات کو میں نے نارمل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اسی
طرح گھر آتا تھا۔ ہشاش بشاش ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔
گزری ہوئی زندگی کے کسی سانچے کا کوئی عکس
اس کے چہرے پر نظر نہیں آیا۔ چند ماہ بعد ہی خالہ نے
میرا ہاتھ مانگ لیا تھا۔ خوب دھوم دھام سے ہماری
شادی ہوئی تھی اور میں نے کئی بار بتایا تھا نا کہ مجھے
حیات احمد سے محبت نہیں تھی۔ شادی کے بعد مجھے
ادراک ہوا کہ وہ شخص اتنا ہی ضروری تھا میرے لیے
جیسے زندہ رہنے کے لیے سانسوں کی ضرورت ہوتی
ہے۔ مجھے عشق ہوا تھا اور شدید ہوا تھا۔ حیات ایک
اچھا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا شوہر بھی

☆☆☆

میں اپنی شادی شدہ زندگی میں مگن تھی۔ دس
سال گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ دو بیٹے تھے
ہمارے، ہنستی ہنستی خوشحال سی زندگی تھی۔
آفرین اکثر پاکستان آتی ہنستی مسکراتی.....
ابراہیم بھائی کی سنگت نے اسے اور نکھار دیا تھا۔ سب
کچھ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھا ویسے ہی جیسے میں نے
چاہا تھا۔

مگر پھر ایک دن اچانک میری خوشیوں کے
مہکتے ہوئے پھول مرجھا گئے۔ سارے چراغ بجھ گئے
اور ایسی سیاہی ایسی تاریکی چہار سو پھیل گئی جس نے

”نہیں، ابھی تک ان کے مزاج کی لڑکی نہیں ملی
یار۔“ ندا ماپوسی سے بولی تھی۔

وہ کافی دنوں سے اپنے جدہ میں مقیم بھائی کے
لیے گھریلو قسم کی لڑکی کی تلاش میں تھی۔ وہ کئی بار مجھ
سے ذکر کر چکی تھی پہلے بھی میرے ذہن میں یہ
خیال نہیں آیا مگر ابھی چند گھنٹوں میں نے ندا کے مسئلے
کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔

”بس سمجھ لڑکی مل گئی ہے میں تمہیں اپنی کزن کی
تصویریں بھیج رہی ہوں بالکل ابراہیم بھائی کی ڈیمانڈ
کے مطابق ہے گھریلو، مشرقی، سکھڑ، سلیقہ مند.....“
میں نے اسے اطمینان دلا کر فون بند کر دیا تھا
اور آفرین کی دو چار تصویریں بھی اسے وائس اپ
کر دی تھیں۔

دوسرے ہی دن ندا اپنی فیملی کے ساتھ ممبا اور بابا
کے سامنے موجود تھی۔ وہ لوگ آفرین کا ہاتھ مانگنے
آئے تھے ممبا بابا اور خاص کرتائی جان بہت خوش
تھیں۔ ویل آف فیملی تھی میری قریبی دوست تھی ندا،
بابا کی بھی ندا کے فادر سے اچھی دعا سلام تھی۔ دیکھا
بھالا خاندان تھا۔ انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

اگلے ہفتے ابراہیم بھائی نے پاکستان آنا تھا۔
اس لیے نکاح کی تاریخ بھی دو ہفتے بعد کی رکھ لی گئی
تھی۔

آفرین خاموشی تھی میں نے اس کی آنکھوں
کے رنگ پھیکے پڑتے دیکھے تھے۔

”تو کیا ہوا..... حیات نے اس کی ہتھیلی میں
یقین کے جگنو نہیں تھمائے تھے۔ کوئی وعہد و پیاں تو
نہیں ہوئے تھے نا..... اس سے پہلے ہی میں نے اپنی
ذہانت سے حالات کا رخ موڑ دیا تھا۔ بتایا تو ہے۔
مجھے ہارنا نہیں پسند تو پھر کیسے ہار جانی بھلا.....؟“

آفرین کے نکاح کی دعوت دینے میں ممبا کے
ساتھ خود گئی تھی خالہ کے گھر..... کارڈ دیکھ کر حیات
کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ کسی لئے ہوئے مسافر کی
طرح جس کا سارا اثاثہ کوئی لوٹ کر لے گیا ہو وہ ایسے

میری زیست کے سارے خوشی کے رنگ اپنی لپیٹ میں لے لیے.....

☆☆☆

کہیں پڑھا تھا کہ آگہی عذاب ہوتی ہے یہ جملہ آج اپنے پورے مفہوم کے ساتھ مجھ پر آشکار ہوا تھا۔ کہتے ہیں علم ایک دولت ہے مگر کبھی کبھی لاعلمی بھی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے.....“

حیات کے دیرینہ دوست علی شیرازی ایک عرصے بعد جرمی سے لوٹے تھے اور حیات کو سربراہان دینے کی غرض سے آج بلا اطلاع ہی ہمارے گھر موجود تھے۔

انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میں نے حیات کو مطلع کیا تھا جو اپنی اسٹڈی میں موجود تھا وہ ایک دم سے بہت خوش ہو گیا تھا۔ زیر مطالعہ کتاب بند کر کے فوراً ڈرائنگ روم کا رخ کیا تھا اور میں جو اسٹڈی روم کے دروازے سے ہی پلٹنے والی تھی ٹیبل لیپ آن دیکھ کر اندر چلی آئی۔

ٹیبل لیپ آف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا تب ہی میری نگاہ اس کتاب پر گئی جو کچھ دیر پہلے حیات کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کوئی کتاب نہیں تھی، وہ ایک نیلے رنگ کی ڈائری تھی۔ آج سے پہلے میں نے یہ ڈائری نہیں دیکھی تھی، مجھے کتابوں سے کچھ خاص شغف نہیں تھا۔ اس لیے اسٹڈی روم مکمل طور پر حیات کی ملکیت تھا۔ یونہی بے ارادہ ہاتھ بڑھا کر میں نے وہ ڈائری اٹھالی تھی پہلے ہی صفحے پر نظم درج تھی۔

تم وہ پہلی لڑکی ہو.....

جس کو دیکھ کر میری آنکھیں خوابوں سے بھر جاتی ہیں

پیار کی سنہری کرنیں دل کے کمرے میں درآتی ہیں

تم وہ پہلی لڑکی ہو.....

جس سے دھوکا کھانے کو دل کرتا ہے

تم وہ پہلی لڑکی ہو.....

جس کو دیکھ کر میرے دل کی خالی ٹہنی پر

پھول گلابی کھل جاتے ہیں.....
جس کو دیکھ کر مجھ کو اپنی مرضی کے سارے موسم مل جاتے ہیں

جس کو دیکھ کر جھیل کنارے پر اتاری پریاں اپنے ہوش گنوا سکتی ہیں
جس کو دیکھ کر سوئی سوئی لہریں یکدم موج میں آسکتی ہیں۔

تم وہ پہلی لڑکی ہو.....

جس کو دیکھ کر دھوئیں کا ہر ایک ٹکڑا بادل ہو سکتا ہے.....

جس کو دیکھ کر چاند کسی شب پورا پاگل ہو سکتا ہے.....

تم وہ پہلی لڑکی ہو.....

جس کو دیکھ کر ہر ایک پیار کہانی بچی لگتی ہے
جس کو دیکھ کر مجھ کو ساری دنیا اچھی لگتی ہے.....

☆☆☆

تجسس نے مجھے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا صفحہ پلٹنے پر مجبور کر دیا تھا پورے جذبات کے ساتھ وہ ایک ایک دن تحریر تھا..... وہ ڈائری نہیں تھی محبت کی کتاب تھی..... جس میں محبت کی کہانی درج تھی.....

میں نے میز سے چایاں اٹھاتے بس ڈرائنگ اسٹڈی میں پر ڈالی تھی اور فوراً پلٹ بھی گیا تھا مگر اس کی سرسری سی جھلک مجھے بار بار پریشان کر رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیوں اس کا چہرہ میری نگاہ میں بس گیا ہے۔ وہ بچپن والی آفرین نہیں رہی کچھ بدل سی گئی ہے۔ اس کی شخصیت میں مجھے ایک تمکنت سی لگی مجھے اقرار کرنا پڑ رہا ہے کہ میں اسے دوبارہ دیکھنے کا خواہش مند ہوں..... ہاں میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں ایک بار پھر سے.....“

میں نے صفحہ پلٹا تھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے.....

اس کا لباس اس پر بہت بچ رہا تھا..... زرد رنگ سنہاروپ یوں جیسے سرسوں کا پھول..... اس کے بال

بہت خوب صورت ہیں۔ میں نے کسی لڑکی کے اتنے لمبے بال نہیں دیکھے بہت حسین..... یوں جیسے، جیسے سنہرا ریشم، مجھے سمجھ میں نہیں آرہی اپنی کیفیت..... کیا میں اس پر ہورہا ہوں؟“

”کئی دن سے وہ نظر نہیں آئی میری بے چینی سوا ہو گئی ہے میرا دھیان بار بار بھٹک کر اس کی طرف چلا جاتا ہے۔ میں نے کسی سے نہیں کہا مگر خود اپنے آپ سے اقرار کر رہا ہوں میرے دل میں اسے دیکھنے کی اور دیکھتے رہنے کی خواہش پختہ ہو رہی ہے۔“

یہ سب کچھ تو میں جانتی تھی پھر بھی مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی محسوس ہوئی..... اگلے صفحے پر اقرار تحریر تھا.....

آج اچانک سے سامنا ہو گیا اور بے ساختہ میرے دل کی خواہش الفاظ کا روپ دھار گئی۔ میں نے کہہ دیا کہ زندگی کے سفر میں تمہارے ساتھ کا خواہش مند ہوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں..... ایک لمحے کو اس کی نگاہیں اٹھی تھیں جن میں کئی سوال درج تھے مگر اگلے ہی لمحے وہ سر جھکا کر چلی گئی تھی ہاں مگلاں کے چہرے پر کچھ رنگ دیکھے تھے میں نے کھلتے ہوئے خوش رنگ بالکل ویسے ہی جن رنگوں کے وہ لباس زیب تن کرتی ہے..... دھنک کے رنگ.....“

”مجھے نہیں پتا کہ سیاہ رنگ اس پر بیج رہا تھا یا وہ سیاہ لباس میں بیج رہی تھی مگر میرے لیے بڑی مشکل کھڑی ہو گئی تھی نگاہیں پلٹ پلٹ کر اس کا طواف کر رہی تھیں ہاں شاید یہ محبت ہی ہے جو مجھے ہو گئی ہے اس پہیلی سی لڑکی سے۔“

میں نے کئی صفحات ایک ساتھ پلٹ دیے تھے میری آنکھوں کے اس پار کبھی ساری تحریریں دھندلانے لگی تھیں۔ میں نے بے دردی سے اپنی آنکھوں کو رگڑ ڈالا تھا۔

آگے حکایتیں درج تھیں۔ ٹوٹے ہوئے دل کی ساری درد بھری کہانیاں، شدتیں اور غم سے بھری وہ ساری ساعتیں جب محبت رخ موڑ کر چل دی تھی، اپنی الوہی چمک دکھلا کر.....“ میں نے دھندلائی ہوئی

آنکھوں سے اگلے صفحے پر درج اپنا نام دیکھا تھا۔ ”پر سیا میری زندگی میں آنے والی دوسری لڑکی، میری بہت اچھی دوست، ایک اچھی بیوی..... میں اس کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں مگر یہ بات صرف میں جانتا ہوں کہ میرا دل بے ایمانی کر جاتا ہے۔“ میری آنکھیں ایک بار پھر سمندر ہوئی تھیں بھلا کیوں.....؟

میں نے خود ایک محبت کے پارے ہوئے شخص سے شادی کی تھی۔ میں سب جانتی تھی پھر کیوں مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔

نہیں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ وہ محبت ہے جو بار بھی جائے تو اس پر حرف نہیں آتا۔ آج نہیں آتی شاید کچی محبتیں کبھی رنگ آلود نہیں ہوتی ہیں ہمیشہ چمکتی دیکتی رہتی ہیں..... میرے دل کی تکلیف سوا ہوئی تھی..... محبت کی مارتو ایسی ہی ہوتی ہے جناب..... وہ حق پر تھا وہ قصور وار نہیں تھا۔ قصور وار تو میں تھی، وہ حقیقی محبت تھی ایسا کھلتا گلاب جسے میں نے ڈال سے نوج دیا تھا، مسل کر پھینک رہا تھا۔

میں ایک ایسے شیش محل میں کھڑی تھی جس کے ہر ایک آئینے میں مجھے اپنا شکست خوردہ چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں جیت کر بھی ہار گئی.....

میں نے ڈائری کا آخری صفحہ پلٹا تھا۔ ”بنام محبت حیات آفرین“ مہر محبت ثبت تھی.....

”کسی کی آنکھوں سے خواب نوج کے پھینک دینا آسان ہو شاید مگر ان خوابوں کے مدفن پر اپنی خوشیوں کا تاج محل بنانا بہت مشکل ہے۔“

”بنیادیں کچی رہ جاتی ہیں ایسا تاج محل ایک نہ ایک دن ڈھس جاتا ہے۔“

عشق ایک ٹھیل ہے شطرنج سے ملتا جلتا مات ہو سکتی ہے، گردن میں چال آجائے میں نے لیمب آف کیا تھا اور شکست خوردہ قدموں سے باہر کی طرف چل دی تھی ایک باری ہوئی زندگی جینے کے لیے.....

☆

نظیر قاضی

صحیح چوڑ

”نانی اماں! آپ کو کچھ چاہیے؟“ اُنسیہ نے
 کچن میں جانے سے پہلے نانی اماں سے پوچھا۔
 نانی اماں آج صبح ہی ان کی طرف آئی تھیں۔ صبح
 جس وقت وہ پہنچی تھیں، اُس وقت طیبہ اسکول جانے
 کے لیے باہر نکل رہی تھیں۔ اپنی اماں سے ان کی
 کھڑے کھڑے ہی دعا سلام ہوئی تھی۔
 ”نہیں، بیٹے تم رونی ڈال لو۔ طیبہ آجائے تو
 پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔“ انہوں نے ہاتھ میں
 پکڑی تسبیح سیدھی کی اور درود شریف پڑھنے لگیں۔
 اُنسیہ کچن میں چلی گئی۔ ابھی اُس نے آخری رونی
 توڑے سے اتار کر ہاٹ پاٹ میں رکھی ہی تھی کہ اطلاعی
 گھنٹی بجی۔ ”لگتا ہے امی آگئیں، اُنسیہ آپ! آپ کھانا
 لگائیں، میں دروازہ کھولتی ہوں۔“
 صوفیہ دروازے کی طرف گئی۔
 ”السلام علیکم! بچو، جلدی سے کھانا لگاؤ، بہت
 بھوک لگ رہی ہے۔ اسکول میں بھی کچھ کھانے کا
 وقت نہیں ملا، اماں! میں ابھی فریش ہو کر آئی ہوں۔“

”صوفیہ، پلیز جلدی سے سلاد بنا لو، میں تب
 تک روٹیاں ڈال لوں۔ امی بس آنے ہی والی ہیں۔“
 اُنسیہ نے اپنی چھوٹی بہن کو آواز دی۔
 ”بیٹے! طیبہ روز اتنی دیر سے آتی ہے؟“ نانی
 اماں نے اُنسیہ سے پوچھا۔
 ”نہیں نانی اماں، آج اُن کے اسکول میں
 پیرنٹس ٹیچر مینٹنگ ہے، اس لیے دیر ہو گئی ہے۔“ نانی
 اماں کو اُنسیہ کے لہجے میں اپنی ماں کے لیے بڑی نرمی
 اور محبت محسوس ہوئی تھی۔ انہوں نے سر ہلایا۔

ناولٹ





طیبہ نے پہلے بیٹیوں کو مخاطب کیا پھر اپنی اماں کو اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ چادر، بیگ اور دیگر سامان کمرے میں رکھ کر فریش ہونے غسل خانے میں چلی گئیں۔ وہ فریش ہو کر باہر آئیں تو اُنسیہ چٹائی بچھا کر کھانا لگا چکی تھی۔ آلو کی بھجیا، گرم روٹی، سلاد اور راستہ۔ طیبہ بڑی رغبت سے کھانا کھانے لگیں۔

ثانی اماں بیٹی کو دیکھتی رہیں۔ آنکھوں میں نہ جانے کیوں نمی سی آگئی تھی۔

”اماں! آپ کھانا کھائیں نا۔ اس طرح نوالا ہاتھ میں پکڑ کر کیوں بیٹھی ہیں؟“

طیبہ نے کھانے کے دوران ماں کی طرف دیکھا جو ہاتھ میں نوالہ پکڑے اسے نکلے جا رہی تھیں۔

”ہاں، کھا رہی ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ منہ میں ڈال لیا۔ ”اماں! آپ چائے پیئیں گی؟“ طیبہ نے اماں سے پوچھا۔

”نہیں بھئی، میں اس وقت چائے نہیں پیتی، بھول گئی ہو کیا؟“

”نہیں اماں سب یاد ہے مجھے، بس ایسے ہی خیال آیا تو پوچھ لیا آپ سے۔“ طیبہ نے ماں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔

”اُنسیہ بیٹا! پلیز ایک کپ چائے بھی بنا دو۔ میں آج بہت تھک گئی ہوں۔“

اُنسیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

اُنسیہ اور صوفیہ دونوں اپنی سمجھتی ماں کی بڑی فرماں بردار بچیاں تھیں۔ اپنی ماں کے ہر دکھ سکھ کی شریک، جانتی تھیں، ان کی ماں واویلے نہیں کیا کرتی۔

آج واقعی تھک گئی ہیں تو ہی کہہ رہی ہیں ورنہ وہ اپنا ذاتی کام ہی کسی سے کہتی تھیں۔ وہ تو آج کل اُنسیہ ایم۔ ایس۔ سی کے سپرزدے کر فارغ تھی تو کھانا پکانا دیکھ لیتی تھی تاکہ اس کی ماں کا تھوڑا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ ورنہ طیبہ نے کمانے کے ساتھ ساتھ گھر بھی بڑے سلیقے سے سنبھالا ہوا تھا۔

اُنسیہ اور صوفیہ نے مل کر برتن سیٹے اور کچن میں چلی گئیں۔ صوفیہ نے برتن دھوئے تو اُنسیہ چائے بنا کر

باہر لے گئی۔

طیبہ چائے کا کپ لیے ماں کے پاس آ بیٹھیں۔ اور سب کا حال احوال پوچھتے ہوئے چائے پینے لگیں۔

”طیبہ! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔“ طیبہ چائے کی چمکیں تو اماں نے کہا۔

”جی اماں! کہیے۔“ طیبہ کا لہجہ مؤدب تھا۔

جانتی تھیں کوئی ضروری کام ہی ہوگا جو اماں یوں ان کے گھر آئی تھیں، ورنہ وہ اپنی بیٹیوں کے گھر بہت ہی کم جاتی تھیں۔ اماں بات کرنے کے بجائے طیبہ کا چہرہ نکلنے لگیں جیسے بات کرنے کے لیے الفاظ سوچ رہی ہوں۔

”اماں! ایسی بھی کیا بات ہے کہ آپ گہری سوچ میں گم ہو گئی ہیں۔“

چند لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہوئے تو طیبہ نے ماں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ جیسے چونک سی گئیں۔

”وہ عارف نے تمہاری اُنسیہ کے رشتے کے لیے کہا ہے۔“ اماں نے ایک ہی سانس میں بات ختم کر کے بیٹی کو دیکھا۔ اپنی ماں کی بات سن کر طیبہ کے اعصاب یک دم تن گئے۔

”میں نے پہلے حماد سے بات کی تھی مگر.....“

اماں نے بات ادھوری چھوڑ کر مکمل کی بھی گویا۔ طیبہ کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے منع کرنے کے باوجود اماں اسی بات کے لیے خود آ جائیں گی۔

”مگر کیا؟ یہی کہا ہوگا کہ میں ایک منہ زور، اکھڑ مزاج اور اپنی مرضی کرنے والی عورت ہوں۔ اُس کا مجھ پر کوئی بس نہیں چلتا۔ میں اس کے کہے میں نہیں ہوں۔“

طیبہ نے زہریلے لہجے میں کہا تو اماں چپ کر گئیں کہ ان کے داماد کے الفاظ کم و بیش یہی تھے۔ طیبہ نے گہری گہری سانسیں لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”اماں! آپ خود بتائیں، نعمان اور اُنسیہ کا کوئی

”تو کون سے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں تم
میں، جو یوں اڑ رہی ہو۔“ آج اماں کا کڑوا لہجہ بھی
اس کی خوشی کو ماند نہیں کر سکا تھا۔

”اماں! پر ہی لگ گئے ہیں مجھے۔“ وہ اپنے
مستطیل صحن میں گول گول گھومنے لگی۔ چوڑی
سیڑھیوں کے نیچے بچی ہوئی جگہ کو کچن بنایا گیا تھا۔
اماں اس وقت کچن میں تھیں۔

”چل بس کر اب اور اندر آ کر آنا گوندھ۔“
طیبہ نے آج آنا بھی خوشی خوشی گوندھا حالانکہ یہ وہ
واحد کام تھا جسے کرنے سے اس کی جان جانی تھی۔

☆☆☆

”میں کہتی ہوں، اب طیبہ کے بارے میں کچھ
سوچو۔“ رات کو اماں سب کاموں سے فارغ ہو کر
کمرے میں آئیں تو رشید صاحب سے کہا۔
”کیا سوچوں؟“ رشید صاحب کو شاید بات سمجھ
میں نہیں آتی تھی۔

”کبھی تو میری بات سن لیا کریں غور سے۔“
اماں چڑ گئیں۔

”میرا مطلب ہے کہ اب طیبہ کی شادی کی فکر
کریں۔“ اماں نے نروٹھے انداز میں کہا۔

”اچھا، اللہ بہتر کرے گا۔“ رشید صاحب نے
انہیں تسلی دی۔

اماں سیدھی سادھی گھریلو خاتون تھیں جنہیں
اب صرف اور صرف اس کی شادی کی فکر تھی۔ طیبہ سے
بڑا ایک بھائی تھا عارف، پھر دو بہنیں حنا اور ثنا۔
عارف کو پڑھنے لکھنے کا بالکل بھی شوق نہیں تھا۔ ابا کے
بے حد شوق اور کوشش کے باوجود وہ میٹرک بھی پاس
نہیں کر سکا تھا۔ اب ایک موٹر مکینک کے پاس کام
سیکھ رہا تھا۔ حنا اور ثنا بھی پڑھنے میں اچھی تھیں۔ حنا
ایف۔ ایس۔ سی کر رہی تھی اور ثنا میٹرک میں تھی۔
تینوں بہنیں مل کر بچوں کو ٹیوشن پڑھاتیں اور اپنی
پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ
اپنی بہت سی ضروریات بھی خود ہی پوری کر لیتیں۔
زیادہ تر ماؤں کی طرح اماں کو بھی بیٹے سے

جوڑ بنتا ہے؟“ طیبہ نے تحمل سے سوال کیا۔
”بنا تو نہیں مگر ہمارے خاندان میں بیٹی کے
لیے آئے ہوئے پہلے رشتے سے انکار نہیں کرتے۔ بد
شگونئی ہوتی ہے۔“ اماں نے وہی بات کہی جس کی
طیبہ کو توقع تھی۔

”او پلیز اماں! رہنے بھی دیں۔ آپ نے میری
زندگی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ مجھے دیکھ کر بھی آپ کی
سوچ میں ذرہ برابر بدلاؤ نہیں آیا، مگر سب کچھ بھگت
کر میری سوچ میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔ میری طر
ف سے صاف انکار ہے۔“ طیبہ کا لہجہ تو دھیماتھا مگر
اس میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ اس کے اندر غصے کا
اٹھتا اُبال باہر نکلنے کا راستہ مانگ رہا تھا اور اس وقت
وہ اس کو باپ نکلنے کا راستہ نہیں دے سکتی تھی کہ سامنے
اس کی ماں بھی اور ماں کا احترام بہر حال واجب تھا۔

”ابھی میں سونے جا رہی ہوں۔ شام کو آپ
کے ساتھ تفصیل سے بات کروں گی۔ ابھی مجھے بہت
غصہ آرہا ہے۔ میں نہیں چاہتی میری زبان سے کچھ
اُلتا سیدھا نکل جائے۔“ طیبہ اٹھ کر اپنے کمرے میں
چلی گئیں اور اماں ٹھنڈی سانس بھر کر نماز کے لیے اٹھ
گئیں۔

کمرے میں آ کر طیبہ اپنے بستر پر لیٹ
گئیں اور اپنا دایاں بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ آنکھوں
میں جمع پانی دونوں آنکھوں کی سائندوں سے لیکر کی
صورت میں بہہ گیا۔ کیا کچھ نہیں سہا تھا انہوں نے
اپنی پچیس سالہ شادی شدہ زندگی میں۔ ایک فلم سی چلی
تھی۔

☆☆☆

”اماں! میرا بی۔ اے کا رزلٹ آ گیا ہے، یہ
دیکھیں میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو گئی ہوں۔“
طیبہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ وہ اپنے خاندان
کی پہلی لڑکی تھی جس نے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ وہ
بہت خوش تھی آگے پڑھنے کا شوق، آنکھوں میں
سہانے مستقبل کے خواب لیے وہ بہت کچھ کرنے کا
ارادہ رکھتی تھی۔

زیادہ پیار تھا۔ بیٹیوں کے بجائے ہر جگہ اُسے فوقیت دیتیں۔ انہیں اس میں وہ خوبیاں بھی نظر آتی تھیں جو اس میں سرے سے موجود ہی نہ تھیں اور بیٹیوں کے منکوں کو بھی وہ یوں نظر انداز کر دیتیں۔

☆☆☆

”ابا! آگے ایڈمیشن لینا ہے یونیورسٹی میں۔“ ان کی پڑھائی میں ہر ممکن مدد کرنے والے ابا پہلی بار خاموش ہو گئے۔ معمولی سی پرائیویٹ نوکری بھی کیا کرتے بے چارے۔

”میرے پاس وسائل نہیں۔“ رشید صاحب نے تھوڑی دیر بعد دھیمے لہجے میں کہا اور سمجھ دار بیٹی سب سمجھ گئی۔

”اچھا پھر نوکری کی اجازت دے دیں۔ ساتھ ساتھ پڑھ بھی لوں گی۔“ طیبہ نے باپ کا چہرہ دیکھا۔ ”کیا نوکری ملے گی تمہیں؟“

”ابا! یہ جو قریبی سوسائٹی ہے نا، وہاں جو نیا اسکول کھلا ہے، انہیں اسٹاف کی ضرورت ہے۔ اچھے پیسے دیتے ہیں۔ ان کے اسکول کے کچھ بچے میرے پاس ٹیوشن کے لیے بھی آتے ہیں، وہیں اپلائی کروں گی۔“

ابا نے اجازت دے دی کہ وہ بے جا پابندیوں کے قائل نہیں تھے۔ بیٹیاں بھی جانتی تھیں کہ ان کی حدیں کہاں تک ہیں۔ وہ باہر نکل کر بھی باپ کی عزت کی محافظ بنی رہتیں۔ اماں نے البتہ خوب شور مچایا۔

”کیا ضرورت تھی اسے نوکری کی اجازت دینے کی۔“ وہ ابا کے سر ہو میں۔

”کرنے دو اسے اپنا شوق پورا۔“ کم گو ابا کا مختصر جواب اماں کو مطمئن نہ کر سکا۔

”اس کی شادی کا سوچیں اب۔“ ”ہو جائے گا وہ بھی۔“ ابا کا پرسکون لہجہ اماں کو آگ لگا گیا اور اگلا آدھا گھنٹہ وہ بڑبڑاتی رہیں۔

☆☆☆

طیبہ نے اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ شام میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانا بھی جاری تھا۔ ٹیوشن پڑھنے

والے بچوں کی تعداد میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے تعلیمی اخراجات اور دیگر ضروریات کے لیے رقم رکھ کر باقی سب اماں کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ جسے وہ اس کی شادی کے لیے بچا کر رکھ لیتیں۔

طیبہ کو اسکول میں پڑھاتے ہوئے سال ہو رہا تھا۔ اس کا لی۔ ایڈ کا تیسرا سمسٹر شروع ہو چکا تھا۔ وہ اسکول سے گھر آئی تو اس کے ماموں آئے ہوئے تھے۔ طیبہ نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے حسب سابق بڑے پیار بھرے لہجے میں جواب دے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ماموں چلے گئے۔

طیبہ کو آج اماں بڑی خوش لگ رہی تھیں۔ ”اماں کیا بات ہے؟ بڑی خوش لگ رہی ہیں آج؟“ طیبہ نے دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے اماں کو ایک نظر دیکھا۔

”ہاں خوش ہوں میں بہت۔“ ”تو ہمیں بھی بتائیں نا وجہ، ہم بھی خوش ہو لیں۔“ چھوٹی ثنا نے لقمہ دیا۔ ”تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو۔ بتا دوں گی جب وقت آئے گا۔“

اماں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ طیبہ کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اماں کی خوشی کی وجہ اس کے لیے پریشانیوں کا درکھولنے والی ہے۔

☆☆☆

”جلیل بھائی نے اپنے بیٹے حماد کے لیے طیبہ کا رشتہ مانگا ہے۔“ اماں نے رات کو خوشی سے نہال ہو کر بتایا۔ ابا خاموش ہو گئے ان کی بات سن کر، جیسے بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ”پھر گرم ہو گئے ہو کہیں۔“ اماں کی آواز آئی۔

”بڑا فرق ہے ہمارے اور ان کے ماحول میں اور حماد کوئی کام وام بھی نہیں کرتا۔“ ابا تھوڑی ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بھلے غربت میں پالا تھا مگر بڑے لاڈلوں اور اصولوں کے ساتھ پالا تھا۔ اور جلیل بھائی کا گھر تو اللہ جھوٹ نہ

بلوائے عجیب طرح کے لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ جنہیں کوئی تمیز بھی نہ شعور۔

”کوئی فرق نہیں ہے ماحول میں اور رہ گئی بات کام کی تو جلیل بھائی کہہ رہے تھے چند مہینوں میں حماد کی سرکاری نوکری ہونے والی ہے۔“ اماں نے ابا کے کسی اعتراض کو اہمیت نہ دی۔

”میرا دل نہیں مان رہا۔“ ابا نے رائے دی۔
”دل کی تو آپ بات ہی نہ کریں۔“ اماں لٹس سے مس نہ ہوئیں۔

”طیبہ سے پوچھ لیتے ہیں۔“ ابا نے پھر کہا۔
”کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے پوچھنے کی اور ایک بات اور، پہلی بیٹی کے لیے آیا ہوا پیغام جیسا بھی ہو قبول کر لینا چاہیے۔ میری دادی کہا کرتی تھیں کہ انکار کی صورت میں باقیوں کے لیے مسئلہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے خاندان میں تو رائج ہے یہ بات۔“
”یہ کیا منطق ہوئی؟“ ابا اس انوکھی توجیہ پر حیران رہ گئے۔

”بس ہے نا منطق۔ آپ بس ہاں کریں۔“ اماں نے کہا۔

”اچھا سوچیں گے، ابھی تو سونے دو، صبح دفتر جانا ہے۔“ ابا نے چادر تان لی۔
”سوچائیں مگر جواب ہاں میں ہوگا، یہ بات یاد رکھیں آپ۔“

☆☆☆

طیبہ کو معلوم ہوا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اماں کی ڈانٹ پر بائیکاٹ کر دیا۔
”تم جو مرضی کر لو، شادی تو تمہاری حماد سے ہی ہونی ہے اب۔“ اماں طیبہ کے بائیکاٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہتیں۔

”کیوں؟ دنیا میں لڑکے ختم ہو گئے ہیں۔“ طیبہ کا اتنا کہنا غضب ہو گیا۔

”یہ..... یہ بے حیائی سیکھائی ہے تمہیں تمہاری تعلیم نے۔ تم جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو ماں باپ کے سروں میں خاک ڈال کر گھروں سے بھاگ جاتی

ہیں۔“

اماں کے الفاظ پتھر کی طرح طیبہ کے دل پر لگے اور اسے لہو لہان کر گئے۔ طیبہ آنسو بھری آنکھوں سے اماں کو دیکھتی رہ گئی۔

”اماں! کیا آپ مجھے جانتی نہیں یا میرے کردار سے ناواقف ہیں۔“ طیبہ کے دل میں اماں کے لیے شکوہ ابھرا۔

”کان کھول کر سن لو۔ شادی تو تمہاری یہیں ہو گی اور خبردار جو تم نے کچھ ایسا ویسا سوچا تو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا دبا دوں گی۔“ اماں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔

ہر معاملے میں ابا کی رائے کو فوقیت دینے والی سیدھی سادی اماں اس معاملے میں نہ جانے کیوں ضد پراڑ گئیں اور ایسا اڑیں کہ ابا کا سمجھنا اور طیبہ کا بائیکاٹ سب بے کار گیا اور ہوا وہی جو اماں نے چاہا۔ ابا نے طیبہ کے سامنے بے بسی سے ہاتھ جوڑ دیے اور طیبہ کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔

☆☆☆

”منگنی تو آپ لوگوں نے کر دی مگر اب کوئی دو تین سال تک شادی کا نام بھی نہ لے۔ میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گی۔“

طیبہ نے اعلان کر دیا۔ وہ بھی اماں کی بیٹی تھی، اپنی ضد پراڑ گئی تھی۔ پہلے لی ایڈ مکمل کیا۔ پھر ایم۔ اے انگلش کیا۔ اسکول میں نوکری جاری تھی۔ اب تو وہ سینئر شمار ہوتی تھی اور تنخواہ بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی اس کی، محنتی تھی اسکول والے قدر کرتے تھے۔ طیبہ کا بھائی عارف تو پھر کام سیکھ رہا تھا جو ابھی تک مکمل نہ ہو سکا تھا مگر حماد نے تو ایسا بھی کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا، دوستوں کے ساتھ تاش کی بازیاں لگاتا اور مرغے لڑانے کے مقابلے کرواتا۔ ایک سے ایک آوارہ شوق تھے اس کے۔ دو چار مہینے کسی فیکٹری میں کام کر لیتا۔ باقی سارا سال آوارہ گردی اور اس کے فضول شوق کھا جاتے۔
منگنی کے بعد ایک دو بار اس نے طیبہ سے فری

ہونے اور فون پر بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر طیبہ نے دو ٹوک انداز میں منع کر دیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ حماد دوبارہ جرات نہ کر سکا مگر دل میں ٹھان لی کہ شادی کے بعد سارے حساب برابر کرے گا۔ آخر کو طیبہ نے اسے یوں منع کر کے اس کی ”مردانہ غیرت“ کو لکا راتھا۔

☆☆☆

طیبہ اور حماد کی منگنی کو تین سال ہو چکے تھے۔ ان تین سالوں میں طیبہ بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ تعلیم مکمل ہو گئی تھی، اسکول میں اچھی طرح سیٹ ہو گئی تھی۔ اس کی بہنیں بھی اپنے تعلیمی مراحل کی تکمیل کی جانب رواں دواں تھیں۔ ایک نہیں بدلاتھا تو بس حماد نہیں بدلاتھا، وہی آوارہ انداز زندگی تھا اُس کا۔ تین سال ہو گئے مگر اس کی سرکاری نوکری کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ ابا کئی دفعہ ماموں سے دبے لفظوں میں کہہ چکے تھے۔ وہ ہر بار ٹال جاتے۔

”بس سمجھو، نوکری ہو گئی ہے اس کی۔ بس ایک دو ماہ کی بات ہے۔“ ہر بار کی طرح ”دو تین مہینوں“ کا کہہ دیتے اور پھر وہ دو تین مہینے کئی مہینوں پر محیط ہو جاتے مگر نتیجہ صفر ہی رہتا۔

”بھائی جی! اب ہماری امانت ہمارے حوالے کر دیں۔“ طیبہ کے ماموں ایک دن آئے اور اپنا مدعا بیان کر دیا۔

”مگر حماد کوئی کام تو کر نہیں رہا۔“ ابا کا جواب سن کر ماموں مسکرائے۔

”ارے بھائی جی! کام ہی کرنا ہے حماد نے ساری زندگی۔ بس اس کے انٹرویو ہو رہے ہیں سمجھو، اس کی نوکری پکی ہے۔ بس آپ شادی کی تاریخ دے دیں۔“ ابا نے سوچنے کا وقت مانگا۔

”سوچ لیں۔ مگر مجھے جواب ہاں میں چاہیے۔ جب تک حماد کی نوکری نہیں ہوتی، میں طیبہ بیٹی کے سارے خرچے پورے کروں گا۔“ ماموں نے یقین دہانی کروائی۔ یہ سوچے بغیر کہ اپنی اُس محدود تنخواہ میں وہ یہ سب کیسے کریں گے، جس کے چند ہزار روپے ہی

مہینے میں ان کو ملتے تھے وہ بھی وہ جو آنے جانے کے کرایے کی مد میں ہوتے تھے۔

”آپ نے کیا سوچنا ہے جو وقت مانگ رہے ہیں؟ ہاں کریں بس۔“ ماموں کے جانے کے بعد اماں ابا کے سر ہو گئیں۔

”نیک بخت۔ طیبہ بیٹی ہے ہماری۔ تم اتنی کٹھور کیوں ہو رہی ہو؟“ ابا کا دل نہ ٹھہرتا تھا۔

”کٹھور ہونے کی کیا بات ہے اس میں؟ بیٹیوں کی شادی کرنا ہی ہوتی ہے، جلدی کر دے انسان تو اچھا ہے۔“ اماں کے لہجے میں ذرا جو فرق آیا ہو۔

”مگر کہیں تک کر ڈھنگ کا کوئی کام تو کرے حماد۔ ایسے تھوڑی ہوتا ہے، کوئی ذمہ داری کا، کمانے کا احساس نہ ہو اور شادی کر دو بیٹیوں کی، آخر کو انہوں نے پوری ایک فیملی کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ خود کو سنبھالنے کے قابل نہ ہوئے تو اگلوں کو کیا سنبھالیں گے؟“

ابا کی بات میں وزن تھا مگر سامنے بھی اماں تھیں۔

”کر لے گا نوکری بھی۔ اور یہ ادھر بھی تو کام کرتی ہے وہاں بھی کر لے گی۔ مل جل کر ہو جائے گا گزارا۔ آپ بسم اللہ کریں۔“ اماں کا اصرار بڑھتا رہا اور طیبہ کی بے چینی۔ جس کی نظروں میں حماد کا لوفرا نہ انداز ٹھومتا تو اسے اب کافی سی آ جاتی۔

”شادی کے بعد لڑکیوں کے لیے نوکری کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بڑی سپورٹ چاہیے ہوتی ہے اگر نوکری کرنی ہو تو۔“

ابا اب بھی متاثر تھے۔ جان بوجھ کر بیٹی کو مسائل کی بھٹی میں کیسے جھونک دیتے۔

”اچھا! آپ ہاں تو کریں جو طیبہ کے نصیب کا ہو گا وہ مل جائے گا اُسے۔“ اماں کی دلیلیں ختم نہ ہوتی تھیں۔

”بس، میں نے کہہ دیا، جب تک حماد کوئی کام نہیں کرتا۔ میں طیبہ کی شادی طے نہیں کروں گا۔“ ابا نے اس بار صاف الفاظ میں انکار کر دیا تو اماں

خاموش ضرور ہو گئیں مگر ہار نہ مانی تھی انہوں نے۔

☆☆☆

”حماد کے ابا، ایک ہفتہ ہو گیا ہے آپ کو ادھر گئے، مگر ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا انہوں نے۔“
حماد کی امی نے جلیل صاحب سے کہا۔

”ہاں خاموش ہی ہو گئے ہیں وہ لوگ۔“ جلیل صاحب نے کہا۔

”وہ خاموش ہو گئے ہیں، مگر آپ تو چپ نہ بیٹھیں۔“

”لگتا ہے کہ وہ لوگ اپنی شرط پر قائم ہیں۔“
”کون سی شرط؟“

”یہی کہ حماد پہلے کوئی کام کرے، پھر ہی وہ شادی کی تاریخ دیں گے۔“ جلیل صاحب نے رشید صاحب کی کہی بات دہرائی۔

”لو، یہ کیا بات ہوئی؟ اب تو خالد نے بھی اپنے بیٹے کی شادی کر دی ہے، اس کا بیٹا بھی تو فارغ بلکہ ہمیشہ کا ویلا نکما ہے، اس کو بھی تو کسی نے بیٹی دی ہے نا، تو ان لوگوں کو کیا ہے؟ بس میں بتا رہی ہوں حماد کی شادی چھ مہینے کے اندر اندر کرنی ہے مجھے، بتا دیں ان لوگوں کو۔“ حماد کی امی کو غصہ ہی آ گیا تھا، ایک تو لڑکی والے دوسرے شرطیں رکھیں اپنی۔

”آپ ابھی کے ابھی فون کریں ادھر اور ساری بات کھل کر کہیں۔“ حماد کی امی نے کہا تو جلیل صاحب نے موبائل جیب سے نکالا اور نمبر ملا کر فون کان سے لگا لیا۔

”اچھا تو اب میرا فون بھی نہیں اٹھائیں گے۔“
کال ریسیونہ ہو سکی تو جلیل صاحب کو بھی غصہ آ گیا
”دوبارہ کریں کال۔“

”تو اب تم لوگ میرا فون اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتے۔“ دوسری بار نمبر ملانے پر رابطہ ہوا تو جلیل صاحب نے چھوٹے ہی کہا۔

”کیا ہو گیا بھائی! سلام نہ دعا۔“

”سلام دعا بھی ہو جائے گی، پہلے بتاؤ تم لوگوں نے کیا سوچا ہے پھر؟“

”بھائی! طیبہ کے ابا کہتے ہیں، حماد پہلے کوئی کام کرے، پھر ہی شادی کی تاریخ دیں گے۔“

”اچھا۔ میں نے اپنے بیٹے کا رشتہ تمہاری بیٹی سے کر کے احسان کیا ہے تم لوگوں پر اور اب تم لوگ میرے سر پر چڑھ کر ناچو گے۔ شرطیں رکھو گے اپنی۔“
”نہیں بھائی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ طیبہ کی اماں کو بھائی کا غصہ ہولانے لگا۔

”ایسی ہی بات ہے، اگر تم لوگوں نے ہاں نہ کی تو میری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھو۔“

”بھائی! کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ ایک کام کریں۔ حماد کو کہیں کام پر لگوا دیں عارضی ہی سہی پر لگوا دیں۔ شادی ہو جائے، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“

”اچھا کیا آپ نے یہ گھی میزھی انگلیوں سے ہی ٹکنا تھا۔“ حماد کی امی نے جلیل صاحب کو شاباش دی۔

طیبہ کی اماں بظاہر گہری سوچ میں گم تھیں، اگر واقعی گہرائی میں سوچ سکتیں تو بھائی سے اتنا تو کہہ سکتی تھیں کہ اُن کی بیٹی کون سی لولی لٹلڑی ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کا رشتہ کر کے احسان کیا ہے۔ ان کی گنوں والی بیٹی کے لیے بہت سے اچھے رشتے مل جاتے۔ مگر ان کے سر پر طیبہ کا رشتہ ختم ہونے کا خوف ایسا سوار ہوا کہ انہوں نے ابا کا جینا دو بھر کر دیا مگر ابا اپنے موقف سے ایک انچ نہ ہٹے۔

☆☆☆

”لو بھئی، لگ گیا ہے حماد کام سے۔ اب شادی کی تیاری کرو۔“ اُس شام ماموں مٹھائی کا ڈبائے کر آ گئے۔

”کہاں نوکری لگی ہے اُس کی؟“ ابا نے پوچھا۔
”وہیں ہمارے علاقے میں ایک فیکٹری ہے، ابھی وہیں جا رہا ہے۔ چند ایک ماہ میں سرکاری نوکری بھی ہو جائے گی اس کی، اپنے محکمے میں بات کر لی ہے میں نے۔“

”اب مجھے ہاں میں جواب چاہیے۔“ ماموں

کرنے کا سوچیں کچھ۔“

شادی کے چھ مہینے بعد بھی حماد بے کار تھا۔ شادی کرنے کے لیے چونو کری شروع کی تھی۔ وہ بس شادی کے بعد چھوڑ دی تھی۔ اور اس کی سرکاری نوکری کا بھی کچھ اتنا پتا نہ تھا تو طیبہ کو صاف بات کرنا پڑی۔ ”کر لیں گے نوکری بھی، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“ حماد کے لہجے میں لا پرواہی سی لا پرواہی تھی۔ طیبہ کا خون کھول اٹھا مگر اُس گھولن کو پی کر گہرا سانس لے کر اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

”ہے جلدی۔ میں ذمہ داری ہوں آپ کی، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا آپ کا یوں فارغ رہنا۔“ ”سمہیں تو خیر میں بھی اچھا نہیں لگتا۔“ وہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا اور طیبہ بیٹھی رہ گئی۔ وہ تو لڑکی ہو کر فارغ نہیں رہتی تھی۔ صبح اسکول، شام کو ٹیوشن والے بچے تو اسے حماد کا بے کار اور اس پر لا پرواہ ہونا بُری طرح سے کھلنے لگا۔ وہ اب اکثر اسے ٹوکنے لگی مگر ادھر پروا کسے تھی۔

☆☆☆

کچھ وقت اور گزرا تو طیبہ کا ٹوکنا حماد کو چڑانے لگا۔ شادی کے دسویں مہینے حماد نے اپنا اصل دکھایا اور اس پر ہاتھ اٹھایا۔ ماموں نے حماد کو خوب ذلیل کیا اور ممائی نے ناک بھوں چڑھائی۔ ”کر لے گا کام بھی، تمہارا کون سا خرچہ ہے جو ہم پورا نہیں کرتے۔“

ممائی زہر خند ہوئیں اور طیبہ ان کا چہرہ تکتی رہی۔ ماموں اسے مہینے کا ایک ہزار روپے دیتے تھے۔ اس ایک ہزار کی ”بڑی رقم“ ہاتھ میں لیے سوچتی رہ جاتی کہ اسے کہاں خرچ کرے۔

یہاں وہ بہت کچھ برداشت کر رہی تھی۔ دو وقت کا کھانا جو بھی پیٹ بھر کر اور بھی آدھا پیٹ۔ ماموں کا خاندان بڑا تھا۔ آٹھ بچے تھے۔ کمانے والے صرف ماموں، حماد نکھو، اس سے چھوٹی تین بہنیں پھر تین بھائی اور آخر میں ایک چھوٹی بہن۔

تینوں لڑکیاں مدل کے بعد گھر بیٹھی تھیں۔ وہ

چلے گئے مگر ابا بھی بھی متاثر تھے۔

ہاں اور ناں کے درمیان نزع کا سا عالم ہوتا ہے کہ آخری سالیں زندگی سے جڑے رہنے کی کوشش میں اُلجھ رہی ہوتی ہیں اور موت ان کا بازو تھامے انھیں اپنی طرف کھینچ رہی ہوتی ہے۔ کہ زندگی آخری سانسوں سے رشتہ جوڑے رکھنے کی تیک و دو میں ہوتی ہے مگر وہ موت کی طرف پہلا قدم بڑھا رہی ہوتی ہیں۔ طیبہ بھی اسی عالم میں تھی آج کل۔

مگر اب کی بار اماں نے ابا کو منا کر ہی دم لیا اور طیبہ کے دل کا پوجھ کئی گنا بڑھ گیا۔ نہ جانے اُسے ابا سے کچھ اُمیدی تھی کہ وہ اس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔

”تم میری بیٹی ہو جو باپ کی عزت سنبھالے گی۔“

ابا نے بس یہ چند الفاظ کہے اور اس کے کندھوں پر اپنی عزت کو سنبھالنے کی ذمہ داری رکھ دی۔ باپ تھے، بیٹی کے چہرے کی بے زاری اس کے اندر کی ٹھن پوری جزیات سے دکھائی دے رہی تھی اسی لیے اپنی عزت کی حفاظت کا بھاری طوق اس کے گلے میں ڈال دیا تھا کہ وہ کچھ کرنا بھی چاہے تو بے بس رہے۔

☆☆☆

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ لڑکیاں بھی کتنی پاگل ہوتی ہیں جو میچنگ کے شوق میں دنوں بازاروں کی خاک چھانتی ہیں۔ مگر پھر شادی کے نام پر چپ چاپ ایک بے جوڑ رشتے میں بندھ جاتی ہیں۔ سو وہ بھی بندھ گئی تھی۔ چپ چاپ۔ بجھے دل کے ساتھ۔ برسوں بعد گھر کے صحن میں شہنائی کی گونجنے والی آواز میں اُداسی ایسے کھل رہی تھی جیسے اترتی شام کے سنگ آنے والی اُداسی۔

طیبہ بیاہ کر حماد کے سنگ رخصت ہو گئی۔ بیاہ کر دوسرے شہر گئی تو نوکری چھوڑ دی۔ بڑا فرق تھا اس گھر کے ماحول میں اور اُس ماحول میں جہاں وہ پلٹی بڑھی تھی مگر وہ طبیعت پر جبر کر کے ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”حماد! چھ مہینے ہو رہے ہیں شادی کو۔ اب کام

گھر کے کام کاج کرتیں۔ باقی کا وقت محلے میں پھرتیں۔ نوہ لگانا، لڑائیاں ڈلوانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انھیں صرف یہی شوق تھا کہ کسی طرح ان کی شادیاں ہو جائیں۔ ان سے چھوٹا بھائی بھی حماد کے نقش قدم پر تھا۔ اس کے بعد کے دونوں چھوٹے بھائی اور بہن البتہ پڑھائی میں سنجیدہ تھے۔ ان کو دیکھ کر طیبہ نے ان کی پڑھائی میں مدد شروع کر دی۔ ماموں کا گھر ڈھائی مرلے کا تھا۔ اوپر جلیل ماموں رہتے تھے اپنے آٹھ بچوں کے ساتھ اور نیچے چھوٹے ماموں۔ چھوٹے ماموں کی تین بیٹیاں بیاہی ہوئی تھیں اور دو بیٹے سب اسی گھر میں سمائے ہوئے تھے۔ عجیب چوں چوں، خچ خچ کا سماں رہتا تھا گھر میں۔ طیبہ کا گھر بھی چھوٹا تھا مگر صاف ستھرا اور پرسکون تھا۔ یہاں صفائی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کی ایک وجہ شعور کی کمی اور کاہلی تھی تو دوسری وجہ افراد کی زیادتی۔ پہلی وجہ نہ ہوتی تو شاید دوسری وجہ پر کسی حد تک قابو پالیا جاتا۔

طیبہ اپنے کمرے کو صاف رکھتی تھی جو بس اتنا تھا کہ ڈبل بیڈ، دو کرسیوں اور ڈرائنگ ٹیبل کے بعد ٹیڑھے میٹرھے ہو کر اندر آنے اور باہر جانے کی جگہ تھی۔ ڈسٹنگ کرنی باقی گھر کی بھی دن میں دو دفعہ صفائی کرتی مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہی حال۔ وہ ہر وقت متحرک رہنے والی لڑکی تھی، اسے لگتا تھا وہ یہاں پاگل ہو جائے گی۔ واش روم جانے کے لیے اسے گھنٹوں ہمت جمع کرنا پڑتی۔ گھر اتنا چھوٹا تھا کہ اکثر اس کی نندیں اور دیور آکر اس کے کمرے میں براجمان رہتے اور کمرے کا حشر مزید بگاڑ دیتے۔ وہ دن میں آرام سے اپنے کمرے میں دو گھنٹے سو بھی نہیں سکتی تھی۔ غنیمت تھا کہ رات کوئی اس کے کمرے میں نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

حماد کے رویے سے تنگ آ کر طیبہ نے خود ہی کچھ کرنے کا سوچا۔

”ماموں! میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔“ رات کو سب کاموں سے فارغ ہو کر طیبہ ماموں، ممانی

کے روبرو تھی۔ ”کیوں، تمہیں کیا ضرورت ہے نوکری کی؟“ ماموں تو خاموش رہے لیکن ممانی نے چمک کر کہا۔ طیبہ کا دل تو چاہا کہ کہہ دے آپ کو نظر نہیں آ رہا، مجھے کیا ضرورت ہے نوکری کی۔ مگر وہ پی گئی۔ ”ماموں!“ اُس نے خود کو کنٹرول اور ممانی کو نظر انداز کر کے جلیل صاحب کو یوں مخاطب کیا کہ بتائیں اب۔

”بچے! نوکری کرو گی تو ہماری عزت پر حرف آئے گا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ بہو کو کمانے کے لیے گھر سے باہر نکال دیا۔“

جلیل صاحب کو اپنی عزت اور لوگوں کی باتوں کی فکر تھی مگر اس گھر میں اس کے ساتھ ہونی زیادتی کی کوئی پروا نہیں تھی۔

”ماموں! لوگ آنکھیں رکھتے ہیں اور زبانیں بھی۔ مگر..... وہ ہمارے مسائل کے حل کے لیے آگے نہیں آتے۔ تو پھر ایسے لوگوں سے کیا ڈرنا۔ اپنے مسائل ہمیں خود ہی حل کرنے ہیں۔“ طیبہ انھیں ان کے بیٹے کی نالائقی جتائے بغیر گویا ہوئی مگر بات کے آخر تک پہنچتے پہنچتے اس کے لہجے اور چہرے پر سختی سی آگئی تھی۔ جسے ماموں نے تو نہیں البتہ ممانی نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔

”نہیں۔ تم ہم پر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا رعب ڈالنا چاہتی ہو۔“

ممانی باز دوجے ہائے لڑنے کو تیار ہو گئیں۔ طیبہ نے ایک دفعہ پھر گہری سانس بھری۔ اس گھر میں آکر یہ گہری سانسیں اس کی سگلی ساسھی بن گئی تھیں۔

”ایسا بالکل نہیں ہے۔“ طیبہ نے خشک سے لہجے میں وضاحت دی۔

”بیٹا! ایسا ممکن نہیں ہے۔ تم ایسا کرو گھر پر بچوں کو ٹیوشن پڑھا لیا کرو۔“ ماموں نے نرمی سے کہا۔ جانتے تھے کہ طیبہ کا مطالبہ بالکل جائز ہے۔ مگر وہ بھی مجبور تھے یا شاید ڈرتے تھے لوگوں سے۔

”کہاں پڑھاؤں ٹیوشن؟ گھر میں کہیں جگہ ہے

بر لگا تھا۔ وہ بیٹی سے نظریں نہ ملا پائیں۔ دونوں گھرانوں میں عجیب سا تناؤ اور تکلف در آیا۔ اماں نے غصے سے بھائی کے گھر آنا چھوڑ دیا اور بھائی نے مارے شرمندگی کے۔

وہ جب بھی میسے جاتی، ماں باپ اس سے نظریں چرائے پھرتے۔ اس کے آگے گھانوں اور چیزوں کے ڈھیر لگا دیتے، جیسے اس کی محرومیوں کا ازالہ کر رہے ہوں مگر پھر بھی نہ کر پا رہے ہوں۔ واپسی پر بیگ بھر کر سامان اس کے ساتھ ہوتا۔ مگر وہ کیا کرنی اس سامان کا۔ عورت کو اپنے شوہر کی کمائی پر مان ہوتا ہے، بھلے کم ہی ہو اور طیبہ کے پاس ایسا کوئی مان نہیں تھا۔ اسے اپنا آپ بھکاری جیسا لگتا۔

☆☆☆

طیبہ کی شادی کو سال ہی گزرا تھا کہ عارف ایک دن ایک لڑکی کو نکاح کر کے گھر لے آیا۔ اماں ابا کے سر جیسے بم پھٹا۔

”ارے مالائق، کچھ کمانے لائق تو ہو جاتا۔“ ابا بے چارے اتنا ہی کہہ پائے مگر اماں نے وہ داویلا مچایا کہ الا مان..... مگر سامنے بھی ان کا لاڈ لگتا تھا۔

”میں اور بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، اس کے گھر والے نہیں مانتے تھے اور نہ آپ لوگوں نے ماننا تھا، اس لیے ہم دونوں نے سوچا، خود ہی شادی کر لی جائے۔“

عارف کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔ اماں ابا کی مجبوری تھی کہ وہ اکلوتے بیٹے کو گھر سے نہیں نکال سکتے تھے۔ سو ان جاہی بہو کو برداشت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

طیبہ کی گود ابھی خالی تھی کہ عارف ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ بی نے بے شک گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی مگر وہ عارف سے بہت محبت کرتی تھی اور اماں ابا کو بھی راضی رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ابا تو پھر کسی حد تک نرم ہو گئے تھے مگر اماں کو وہ ایک آنکھ نہ بھائی۔

☆☆☆

چار سال گزر گئے اسی حج حج میں۔ اس دوران طیبہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ عورت جب بچہ پیدا

جہاں بیٹھ کر میں بچوں کو پڑھا سکوں۔“ طیبہ چڑھی گئی۔ آج کل وہ برداشت کی آخری حد پر کھڑی تھی۔ عجیب لوگ ہیں، خود کچھ کرنا ہے نہ دوسرے کو کرنے دینا ہے۔

”ہاں تو کہنا تھا نا اپنے باپ سے الگ گھر دے دیتا تمہیں جہیز میں۔“ ممانی نے طنزیہ کہا اور طیبہ کی برداشت ختم ہو گئی۔

”پہلے اپنے بیٹے کی قابلیت دیکھیں، پھر ڈیمانڈ کریں جہیز میں گھر کی۔ دو وقت کی روٹی تک کمانے کے قابل نہیں ہے آپ کا بیٹا اور باتیں مجھے سنار ہی ہیں۔“ طیبہ بات مکمل کر کے وہاں سے چلی گئی اور ممانی کو جلتی آگ میں جھونک دیا۔ وہ پھر شروع ہوئیں تو کافی دیر تک اس کو کوستی رہیں۔ ماموں نے بڑی مشکلوں سے انھیں ٹھنڈا کیا۔

وہ بہت مضبوط تھی۔ مگر کمرے میں آ کر ٹوٹ کر روئی۔ کچھ لوگ جب روتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ کمزور ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ مضبوط رہتے رہتے تھک جاتے ہیں۔

☆☆☆

طیبہ جیسے ایک سال میں ہی گھل سی گئی تھی۔ اب تو اس کی ماں کو بھی تشویش ہونے لگی۔ ابا بھی دبے لفظوں میں اماں کو قصور وار ٹھہراتے تھے۔ اماں بیٹی کو دیکھ کر کڑھنے لگیں۔ وہ تو سمجھتی تھیں کہ شادی کے بعد حماد بدل جائے گا۔ بھائی بھانج سے بات کی تو بھائی جان تو مارے شرمندگی کے خاموش ہو گئے کہ حماد نے اپنا طرز عمل بدلنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مگر ممانی نے ان کو خوب کھری کھری سنائیں۔

”آپ کو سب پتا تھا کہ ہمارا بیٹا کیا ہے کیا ہے۔ کچھ چھپا ہوا نہیں تھا آپ سے اور نہ کسی نے آپ کو اس رشتے کے لیے مجبور کیا تھا۔ اپنی رضامندی سے بیٹی بیاہی ہے۔ اب زیادہ تماشا لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ممانی کی اس بات پر طیبہ نے مسکرا کر اماں کی طرف یوں دیکھا کہ ان کا دل کٹ گیا۔ طیبہ کی مسکراہٹ میں جانے کیسا طنز تھا جو سیدھا ان کے دل

کرتی ہے تو اس عمل میں اس کی اپنی ذات مر جاتی ہے اور ایک ماں جنم لے لیتی ہے۔ پھر ساری زندگی وہ اپنے بچوں کے لیے جیتی ہے، اپنے کے لیے نہیں۔ اپنی تو خیر بھی مگر اب دو بچوں کے ساتھ اخراجات کی بڑی مشکل تھی۔ چھ مہینے بعد بڑی کو اسکول داخل کروانا تھا اور اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اس نے اپنے کانوں کی بالیاں بیچ کر اس کے ایڈمیشن کا بندوبست کیا۔ جس اسکول میں بیٹی کو داخل کروانا چاہتی تھی۔ وہ اچھے درجے کا پرائیویٹ اسکول تھا۔ جس کی فیس قدرے زیادہ تھی۔

”ایڈمیشن کا بندوبست تو ہو گیا ہے مگر فیس کا کیا ہوگا؟“ لائٹ گئی ہوئی تھی۔ کمرے میں موم بتی جل رہی تھی، طیبہ کی نظریں موم بتی پر تب تک جمی رہیں جب تک وہ گھٹتے گھٹتے بالکل بجھ نہ گئی اور دھواں ایک باریک لکیر کی صورت میں بل کھا کھا کر موم بتی کے نبھنے کا اعلان کرنے لگا۔

”اللہ مالک ہے، کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔“ طیبہ نے سوچوں کو پرے دکھایا۔ ممانی کو ہوتا چلا کہ وہ اپنی بیٹی کو پرائیویٹ اسکول میں داخل کروا رہی ہے جہاں کی فیس ہزاروں میں ہے تو وہ واویلا مچایا کہ الامان۔

”کیا ضرورت ہے، لڑکی تو ہے پڑھ لکھ کر کیا تیر مار لے گی تمہاری طرح۔ یہ پاس ہی گورنمنٹ اسکول ہے، وہاں داخل کروادو۔“

”کیوں؟“ طیبہ کے اس کیوں نے ممانی کو ایک لمحے کے لیے چپ کروایا تھا۔

”اتنا خرچا ہوگا، کون کرے گا؟“

”ان کا باپ تو ظاہر ہے نہیں کرے گا، اسے عادت نہیں ہے کچھ کرنے، تو میں ہی کچھ کروں گی۔ مگر اپنی بیٹیوں کے ساتھ میں کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ یہ بات آپ سب لوگ کان کھول کر سن لیں۔“

طیبہ اپنی بیٹی کا ایڈمیشن کروانے گئی تو کچھ سوچ کر اس نے اپنی تعلیم اور تجربے کا ذکر کرتے ہوئے نوکری کی بات کی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسکول کو

اساتذہ کی ضرورت تھی۔ پرنسپل صاحبہ نے اسی وقت اس سے ڈیمولیا۔ وہ ڈیمو میں کامیاب ہو گئی۔

”آپ کل اپنے ڈاکومنٹس کے ساتھ آئے گا۔“

طیبہ نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا اور اگلے روز دونوں بیٹیوں کو تیار کیا اور خود بھی ذرا اچھے سے تیار ہوئی اور اپنے ڈاکومنٹس لے کر بیٹی کو چھوڑنے کے بہانے اسکول چلی گئی۔ پرنسپل صاحبہ نے اس کی تعلیمی قابلیت اور تدریسی تجربے کی بنا پر اسے ملازمت دینے کا فیصلہ کر لیا۔

”آپ اگلے ہفتے دوبارہ آئے گا۔ میری طرف سے تو آپ اوکے ہیں۔ میں باقی بورڈ آف گورنرز اور دیگر کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد آپ کو جواب دوں گی۔“

”جی میڈم! میں انتظار کروں اور امید کرتی ہوں کہ آپ کا جواب ہاں میں ہوگا۔“ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر پرنسپل اس کی شکل سے پہچان گئی تھیں کہ اسے ملازمت کی ضرورت ہے۔

”ان شاء اللہ۔“

☆☆☆

اولین بہار کے دن تھے۔ وہ اسکول سے نکلی تو سورج بھی اُسے دیکھ کر مسکرایا اور اُسے یوں لگا جیسے آج قسمت اس کی طرف دار بن کر اس کے ساتھ کھڑی ہے۔ ایک ہفتے بعد طیبہ کو نوکری مل گئی وہ اپنے اللہ کی شکر گزار ہوئی۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے، میں بہت پریشان تھی کہ بچی کو داخل تو کروا دیا ہے، ہر مہینے فیس کہاں سے آئے گی۔“

اوپنی اڑان بھرنے کے لیے پر زیادہ زور سے ہلانا پڑتے ہیں اور طیبہ نے آنے والے وقت کو بہتر بنانے کے لیے محنت کو اپنا شعار بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تنخواہ معقول تھی۔ چھ ماہ بعد وہ مستقل ہو جاتی تو انیسہ کی فیس بھی معاف ہو جاتی کہ اساتذہ کے بچے فری پڑھتے تھے اسکول میں۔ اسکول زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ پانچ منٹ لگتے تھے پیدل اسکول پہنچنے میں۔ ایڈمیشن کی رات وہ پریشانی اور دکھ کی وجہ سے سو نہیں پائی تھی اور آج

تنہائی دس رہی ہے مجھے
درد کے بادلوں نے گھیرا ہے
لو چراغوں کی تیز تر کر دو
شہر دل میں بڑا اندھیرا ہے
☆☆☆

رات کو ماموں کے سامنے اس کی عدالت لگی۔
اس سارے عرصے میں وہ موم کی طرح پھلی تھی اور
پھر پتھر کی طرح سخت ہو گئی۔

”ماموں! میں نے چار سال آپ کی بات کا مان
رکھا۔ مگر اب میں معذرت خواہ ہوں کیونکہ اب ایسا ممکن
نہیں۔ اب یہ میری بچیوں کی زندگی کا سوال ہے، میں ان
کے لیے سب کچھ کروں گی جو مجھے ٹھیک لگے گا۔“ اس کے
ستے ہوئے چہرے اور آواز کو ماموں نے بغور دیکھا اور سنا۔
”ہوں۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکے۔

”یہ رشتہ میرے والدین نے قائم کیا ہے۔
اسے میں مرتے دم تک نبھاؤں گی مگر اپنی شرائط پر۔
اب میں کوئی سمجھوتا نہیں کروں گی۔“

طیبہ کی باتیں بالکل درست تھیں۔ ماموں کو اس
کی بات ماننا ہی پڑی۔ میاں بیوی تو ایک دوسرے کا
لباس ہوتے ہیں۔ ایسا لباس جو ایک دوسرے کے وقار،
زینت اور عزت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ مگر اس
کا یہ لباس اس کے لیے تنگی، بدنمائی اور ٹھٹھن کا باعث بنا
رہتا تھا۔ اس کی مجبوری تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس
جنگ لباس کو اتار کر پھینک نہیں سکتی تھی۔ اب وہ ایلی
نہیں تھی اس کے ساتھ اس کی بیٹیاں بھی تھیں جن کو کسی
آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

”وہ نوکری نہ کرے تو کیا کرے۔ بچوں کے
اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔“ رات کو ممانی نے
ماموں کی کلاس لینے کا ارادہ کیا تو وہ بھڑک اٹھے۔

”ہماری اپنی اولاد بے غیرت ہے، اس سے
چھوٹے دونوں کام پر لگ گئے ہیں مگر اسے شرم نہیں
ہے۔ دو بیٹیوں کی شادیاں کی ہیں۔ دو ابھی بانی
ہیں۔ میں بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور اپنے
بیٹوں کی کمائی تو تم مجھے نہیں دکھائیں تو اس کو کیا

خوشی اسے سونے نہیں دے رہی تھی۔ زندگی ان چاہی اور
مجبوریوں پر دلیرانہ سواری کا نام ہے۔ یہ مجبوریوں کو خود
برسوار کرنے کا نام نہیں ہے۔ زندگی کسی ایک موڑ پر ختم
نہیں ہو جاتی۔ موڑ کے آگے کھلی شاہراہ ہوتی ہے۔ بس
آپ کو وہ موڑ چھوڑ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ کرنا ہوتا ہے
اور طیبہ نے موڑ مڑنے کا حوصلہ کر لیا تھا۔

”کیا ضرورت تھی بچی کو اتنے مہنگے اسکول میں داخل
کروانے کی۔ کسی گورنمنٹ اسکول میں ڈال دیتی۔“ اگلی صبح
حماد نے اسے ٹوکا تو طیبہ نے اسے اس کی ذمہ داریاں گنوا
دیں اور وہ حسب سابق بھڑک اٹھا۔ جب سے انیسہ کو اسکول
میں داخل کروایا تھا، ممانی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ انہوں نے
حسب عادت بیٹے کی حمایت کی۔

”اب میرے بچے کا سر کھانے لگ گئی ہو۔
بتاؤ، کون فیس دے گا اس کی۔“

ممانی کا لہجہ بہت زہریلا تھا۔ مرنے کے لیے تھوڑا
سازر ہر چاہیے ہوتا ہے مگر زندہ رہنے کے لیے بہت سے
زہر پینا پڑتے ہیں۔ سو وہ بھی پی رہی تھی اور جی رہی تھی۔
”اس کی ماں۔ کیونکہ اس کا باپ تو اس قابل
ہے نہیں۔ مجھے نوکری مل گئی ہے انیسہ کے اسکول
میں۔“ طیبہ دونوں ماں بیٹے کے چہرے کو نظروں میں
رکھ کر گویا ہوئی۔

”کیا اب یہ حرافہ نوکری کرے گی۔ میری بے
عزتی کرے گی۔“ حماد کی غیرت جوش میں آئی۔ وہ
طیبہ تک پہنچا اور اس کے بال پکڑنا چاہے۔ مگر طیبہ
نے اس کا ہاتھ سختی سے دبوچ لیا۔

”ایک بات، مجھ پر اب ہاتھ اٹھانے کی جرات
مت کرنا۔ بہت مار کھالی تمہاری۔ تم سکھ نہیں دے سکتے تو
دکھ دینے کا بھی کوئی حق نہیں سمجھیں اور دوسری بات بے
عزتی ان کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہو۔“

وہ اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک کر کمرے میں گئی
اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ نعمت ہوتے ہیں وہ
رشتے جو انسان کو حالات کی تلخیوں سے بچانے کے لیے
چھپر چھاؤں بن جاتے ہیں۔ جو خوف میں امن بن
جاتے ہیں۔ مگر طیبہ کے پاس ایسے رشتے نہیں تھے۔

دیتیں۔“ ماموں نے صاف گوئی کے سارے ریکارڈ توڑے تو ممائی کو مجبوراً چپ ہونا پڑا۔

☆☆☆

”ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اس چھوٹی کوہم میں سے کوئی بھی نہیں سنبھالے گا۔“

لفظ کیسے وار کرتے ہیں۔ یہ تب سمجھ میں آتا ہے جب کسی کے الفاظ ہمیں زخم لگاتے ہیں۔ ممائی کے الفاظ تو طیبہ کے لیے ہمیشہ زخم ہی بنے تھے۔ مگر ابھی تک وہ ان کے لفظوں سے لگنے والے زخموں کی عادی نہیں ہوئی تھی، ہاں بس اتنا ہوا تھا کہ اب اسے سہنا آ گیا تھا۔

”معلوم ہے مجھے۔ اسے بھی ساتھ ہی لے کر جایا کروں گی۔“

اگلے روز طیبہ نے اسکول جوائن کرنا تھا۔ اماں کے دیے ہوئے دو سوٹ اس نے خود بیٹھ کر پیسے تھے۔ ان ہی میں سے ایک وہ استری کر رہی تھی۔ اماں کو اس کی نوکری کا پتا چلا تو اس کے لیے کافی سامان لے آئیں۔ خاص طور پر کپڑے جن میں سے دو سوٹ ان سلعے تھے باقی چھ سوٹ سلعے ہوئے تھے اسٹاکس سے۔ یہ سوٹ اس کی بہنوں کے تھے مگر انھوں نے اسے بھجوا دیے کہ اسکول میں پہننے کے لیے ضرورت ہوگی۔ وہ دونوں اُسی اسکول میں پڑھا رہی تھیں جہاں پہلے طیبہ پڑھاتی تھی۔ وہ بہنوں کے اس خیال پر رودی۔ واقعی اس کے پاس کوئی بھی ڈھنگ کا کپڑا نہ تھا۔

زخم وہی ہوتا ہے جو چھپا لیا جائے گا جو بتایا دکھا دیا جائے وہ تماشا بن جاتا ہے۔ طیبہ نے بھی اپنے سارے زخم چھپا لیے تھے۔ اس کا اسکول شروع ہو گیا اور زندگی بہتری کی طرف بڑھنے لگی۔ چھوٹی کو وہ ساتھ لے جاتی اسکول میں ڈے کیر تھا۔ وہ سارا وقت وہیں ہوتی۔ اُنسیہ اپنی کلاس میں، اسے جلدی چھٹی ہو جاتی تو باقی کے دو گھنٹے وہ وہیں گزارتی۔ طیبہ کا آخری پیریڈ فری ہوتا تھا۔ اس میں وہ بچوں کی کاپیاں وغیرہ چیک کرتی اور ساتھ ہی اُنسیہ کو ہوم ورک بھی کروا دیتی اور چھٹی کے بعد تینوں ماں بیٹیاں اکٹھے گھر آتیں۔ گھر پہنچتی تو کھانے کو ایک نوالہ تک نہ ہوتا۔ طیبہ جلدی سے روٹیاں بناتی، بھی اچار کے

ساتھ کھا لیتی کبھی انڈا بنا لیتی۔ بچوں کو وہ میٹھا پرائیڈ وغیرہ بنا کر کھلا دیتی۔

بس ایک ہی مہینے کی تنگی تھی۔ اس کی تنخواہ آئی تو اس نے سب سے پہلے بچوں کے کھانے، پینے کا کچھ خشک سامان لا کر رکھا۔ اپنی ضرورت کے پیسے رکھے اور باقی تمام پیسوں کی کمیٹی ڈال دی۔ ممائی کو اس بات پر اعتراض تھا۔

”کمانی ہو تو گھر پر بھی لگاؤ۔“ ممائی نے نیا مطالبہ کیا۔

”کما کر گھر پر لگانا آپ کے بیٹے کی ذمہ داری ہے۔ اگر یہ سختی ہوتا تو میں خوشی خوشی مالی مسائل حل کرنے میں اس کا ساتھ دیتی۔ کم کمانا مگر کوشش تو کرتا۔ میں اس کی عزت کرتی، خوش رہتی، مگر یہ جان بوجھ کر ہڈ حرامی کر رہا ہے تو مجھ سے کوئی امید مت رکھیں۔ میں اپنے بچوں کے لیے کمانی ہوں اور میری کمانی ان ہی پر خرچ ہوگی۔“

اس کے دو ٹوک اعلان کے بعد ممائی نے اس کا چولہا الگ کر دیا اور گھر کے بلوں میں بھی اس کا حصہ مقرر کر دیا۔

”بل اپنے بیٹے سے لے لیں۔ چولہا میں جلا لوں گی۔“

طیبہ نے ذرا جو چوں چراں کی ہو آرام سے فیصلہ سنایا اور کمرے کی دیوار کے ساتھ چولہا رکھ لیا۔ بڑی مشکل ہوئی، راستہ تھا۔ آتے جاتے سب پھلانگتے مگر اس کے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ رشتے لوہے سے زیادہ مضبوط بھی ہوتے ہیں اور ششے سے زیادہ نازک بھی۔ نبھنے پر آئیں تو سالوں مضبوط، ٹوٹنے پر آئیں تو کھوں میں ختم۔ لوہے جیسے پائیدار رشتے وہ ہوتے ہیں جن میں ایثار کا ظرف ہو۔ خود غرضی رشتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اور یہاں رشتوں میں خود غرضی ہی خود غرضی تھی۔ کھلاڑی کی ساری توجہ کھیلنے کی طرف ہوتی ہے۔ تماشا کی شور کرتے ہی ہیں۔ انھیں کرنے دینا چاہیے۔ وہ ان کا کام ہے۔ طیبہ نے اپنی ساری توجہ کھیلنے پر مرکوز کر کے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

”خاک اچھی ہے، بھاگ کر آئی ہے اپنے گھر سے۔“
 ”اماں! غلطی ہو جاتی ہے انسانوں سے۔ مگر یہ
 بھی تو دیکھیں کہ ایک غلطی کے بعد وہ باقی غلطیوں
 سے دامن بچا رہی ہے۔ آپ کی، ابا کی عزت کرنی
 ہے، اگر جو وہ منہ پھٹ جھگڑا لو ہونی تو سوچیں آپ
 دونوں کا کیا ہوتا۔ دل کی اچھی ہے۔ میری مانیں تو
 اسے معاف کر دیں اور اپنا رویہ اس کے ساتھ
 اچھا کر لیں، فائدے میں رہیں گی۔“

طیبہ نے بات ختم کر کے چائے کا کپ ہونٹوں
 سے لگا لیا اور باہر کھڑی نمی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس
 پورے کنبے میں طیبہ واحد تھی جو اسے اچھوت نہیں
 سمجھتی تھی۔ اس کے ساتھ اچھے سے بات کرتی تھی۔
 ماں کو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا کہتی تھی۔

طیبہ کی باتوں کا اثر تھا یا شاید اماں کو خود ہی
 احساس ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کا رویہ نمی سے اچھا ہو
 گیا اور نمی اسی پر خوش تھی۔ تین بچے تھے اس کے اب،
 وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی۔ اب اسے یہیں
 رہنا تھا تو مل جل کر رہنے میں کیا برائی تھی۔

☆☆☆

اسکول میں شام کو اکیڈمی شروع ہوئی تو طیبہ نے
 وہاں بھی ایک گھنٹہ پڑھانا شروع کر دیا۔ اچھے پیسے مل
 جاتے تھے۔ وہ اشد ضرورت کے تحت ہی پیسے خرچ
 کرتی، باقی سب بچا لیتی۔ وہ چھوٹا سی الگ گھر بنانا
 چاہتی تھی۔ یہاں اب گزارہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے ایک
 دیور کی چند سال پہلے شادی ہو چکی تھی۔ ماموں ممائی کا
 کمرہ ان کے پاس تھا۔ وہ دونوں دو چار پائیوں کے
 ساتھ برآمدے میں آگئے تھے۔ اب ایک دو سال میں
 دوسرے دیور کی شادی بھی تھی تو وہ اس سے پہلے پہلے
 وہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ گھر بنانا اتنا آسان تھوڑی تھا۔
 سا بھی ساتھ چلنے والے کو کہتے ہیں۔ جو پیچھے رہ جائے وہ
 سا بھی نہیں ہوتا۔ حماد بھی اس کا شوہر ضرور تھا مگر سا بھی
 ہرگز نہیں تھا۔ طیبہ اپنے مسائل سے اکیلی مردانہ وار لڑ
 رہی تھی۔ مسئلے ختم نہیں ہوتے۔ مگر ان مسئلوں میں کوئی
 اپنا قریبی ساتھ کھڑا ہونے والا ہو تو مسئلے، مسئلے نہیں

اسی طرح چار سال مزید گزر گئے۔ انیس اب
 تیسری جماعت میں تھی اور چھوٹی پہلی میں۔ جب
 حماد نے اس سے عجیب و غریب مطالبہ کیا۔
 ”مجھے بیٹا چاہیے۔“ طیبہ اس مطالبے پر طنزیہ مسکرا دی۔
 ”بیٹا چاہیے تو دوسری شادی کر لو، مجھ سے امید
 مت رکھنا۔“ طیبہ نے سر جھٹکا۔

”ارے! کیسی عورت ہے اپنے شوہر کے لیے
 ایک بیٹا پیدا نہیں کر سکتی۔“ ممائی نے حسب عادت
 دخل اندازی کی۔

”نہیں کر سکتی، آپ کا بیٹا تو ایک بچہ پالنے کے
 قابل نہیں ہے، میری تو پھر دو بیٹیاں ہیں اور میں بس
 ان دو کو ہی پال سکتی ہوں۔ آپ کو شوق ہے پوتا
 کھلانے کا، بیٹے کی دوسری شادی کر دیں۔“

طیبہ ہر طرف نا فرمان عورت کی حیثیت سے
 مشہور کر دی گئی مگر اس نے پروا نہ کی۔ بیوی اپنے
 شوہر کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ وہ اسے خوب صورت
 کہے تو وہ نکھرتی جاتی ہے، وہ خدمت گزار کہے تو وہ
 خدمت گزار بن جاتی ہے، وہ اسے گالیاں دے، اس
 کے نقص اُچھالے تو وہ اسی طرح عیب دار بن جاتی
 ہے جیسے طیبہ کو بنایا جا رہا تھا۔ مگر طیبہ نے اب منزل کا
 تعین کر لیا تھا سو اسے راہ میں آنے والی کسی رکاوٹ کی
 کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ایک مضبوط رسی کی طرح اپنی
 بیٹیوں کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھی۔

☆☆☆

طیبہ جب بھی اماں ابا کے گھر جاتی۔ نمی اس کی دل
 سے خدمت کرتی تھی۔ اچھے سے بات چیت کرتی۔ اپنی
 حیثیت کے مطابق کھانے پینے کا بھی خیال رکھتی تھی۔
 عارف اب کسی ورکشاپ پر دیہاڑی پر کام کر رہا تھا۔
 ”طیبہ یہ چائے لے لو، اماں! یہ آپ کی پھینکی
 چائے۔“ نمی نے ٹرے میں دو کپ ان کے سامنے رکھے
 اور ایک کپ کی طرف اشارہ کر کے اماں کو اطلاع دی۔
 اماں نے جواب نہ دیا۔ نمی مڑ کر کمرے سے نکل گئی۔
 ”اماں! نمی اچھی لڑکی ہے، آپ اپنا سلوک اس
 کے ساتھ اچھا کر لیں۔“

دونوں بہنوئی ان کو اکثر اپنے گھر لے جاتے۔
عارف کے مالی حالات تھوڑے کمزور ہی تھے
پھر بھی گزارا ہو رہا تھا کہ بہنیں اس کی کافی مدد کر دیا
کرتی تھیں۔

”السلام علیکم آیا! آج سورج کدھر سے نکلا تھا
بھئی۔“ ہاشم نے حنا سے کہا۔
”مشرق سے ہی نکلا تھا۔“ وہ بھی شرارت سے
گویا ہوئی۔

”ارے نہیں، تم نے ٹھیک سے دیکھا نہیں
ہوگا۔ آج آپا خود ہمارے گھر آتی ہیں۔“ ہاشم کے
انداز میں محسوس کی جانے والی نرمی اور تحریم تھی۔

”السلام علیکم انکل۔“ انیہ اور صوفیہ نے سلام کیا۔
”واہ بھئی۔ آج تو ہماری دونوں بیٹیاں بھی ساتھ
ہیں۔“ ہاشم نے دونوں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”بھئی قاسم، آتے ہوئے بازار سے بچوں کے
لیے بیکری سے چند اچھی اچھی چیزیں لے آنا، مہمان
آئے ہیں گھر میں۔“ ہاشم نے ثنا کے شوہر، اپنے
چھوٹے بھائی قاسم کو فون کیا جو کسی کام کے سلسلے میں
بازار گیا ہوا تھا۔

”حنا اور ثنا آپ دونوں اچھا سا کھانا بناؤ۔ آپا
کی مہارت میں کوئی کمی نہ رہے۔“

”جی، کھانا بس تیار ہے۔“ حنا نے کہا۔
”نہیں ہاشم! کوئی تکلف مت کرو پلیز۔ مجھے تم
سے کام تھا، اس لیے خود آئی ہوں۔“

”سو بار بتائیے گا کام بھی، ان شاء اللہ ضرور
کریں گے آپ کے کام۔ مگر پہلے اچھا سا کھانا
کھائیں گے، پھر بتائیے گا آپ اپنا کام۔“ ہاشم جانتا
تھا، کچھ بہت ضروری ہو گا ورنہ طیبہ کہاں کسی سے اپنی
کوئی ضرورت یا کام کہتی تھی۔

”ہاشم! قاسم! تمہاری نظر میں کوئی چھوٹا سا
مناسب قیمت کا گھر ہو تو بتانا۔“ کھانے کے بعد
سب چائے پی رہے تھے جب طیبہ نے ہاشم سے کہا۔
ہاشم اور قاسم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جیسے نظروں
ہی نظروں میں یہ کام کرنے کا ارادہ کر لیا۔

رہتے۔ مگر طیبہ کا ”بہت قریبی“ ان معاملات میں اس
سے بہت دور تھا۔ اسکول میں اس کی اپنی کو لیگ راشدہ
سے بڑی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ جو اس کے سارے
دکھوں سے واقف تھی۔ وہ جب نرم لفظوں میں طیبہ کو
سمجھاتی اسے حوصلہ دیتی تو طیبہ کو احساس ہوتا کہ لفظ کیسے
مرہم بنتے ہیں۔ یہ بھی تب سمجھ میں آتا ہے۔ جب ہم
تکلیف میں ہوں اور کوئی آکر دو میٹھے بول بول
دے۔ کبھی جو وہ بد دل ہو جانی یا تھک جانی تو راشدہ اس
کی ہمت بڑھاتی۔

”دیکھو طیبہ! تکلیف اٹھائے بغیر اور قربانی
دیے بغیر کبھی کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ آج تم
اپنی بچیوں کے لیے جو قربانیاں دے رہی ہو، دیکھنا
اللہ تمہیں اس کا بہترین اجر دے گا، اس دنیا میں بھی
اور اگلی دنیا میں بھی۔“

راشدہ اپنے شوہر کی مالی معاونت کے لیے
نوکری کر رہی تھی۔ مگر اس کا شوہر بہت سختی تھا۔ دونوں
مل کر اپنے بچوں کو اونچے مقام پر پہنچانے کے لیے
جدد جہد کر رہے تھے۔ دونوں میاں بیوی میں بلا کی
انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ طیبہ کو راشدہ کو دیکھ کر رشک آتا
تھا اور جب بھی ایسا خیال اس کے دل میں آتا وہ
راشدہ اور اس کے میاں کے لیے دعا گو ہو جانی۔

☆☆☆

گز رے وقت میں ابا اللہ کو پیارے ہو گئے، طیبہ
کی دونوں بہنوں کی شادیاں اپنے ہاتھوں سے کر گئے
تھے۔ طیبہ کی دونوں بہنوں کی شادی ایک ہی گھر میں
ہوئی تھی۔ وہ دونوں بیاہ کر طیبہ کے شہر ہی آئی تھیں۔ اس کی
بہنوں کا سسرال کھاچہ پیتا خاندان تھا۔ اس کی دونوں بہنوں
کے تین تین بچے تھے۔ دونوں اپنی زندگیوں میں خوش اور
مگن تھیں مگر وہ اپنی بڑی بہن کو ہر گز نہیں بھولی تھیں۔

کوئی اور طیبہ کے ساتھ کھڑا تھا یا نہیں مگر اس کی
دونوں بہنیں ہمیشہ سے اس کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ان
کے سسرال والے بشمول ان کے شوہروں کے سب طیبہ
کی بہت عزت کرتے تھے۔ جس طرح کے حالات میں
وہ گزارا کر رہی تھی اور بچیوں کو پال رہی تھی۔ اس کے

حماد کو اس بات سے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

”کیوں جانا ہے اتوار کو تمہیں بہنوں کے گھر؟“

”کام ہے کوئی“ طیبہ نے نپا تلا سا جواب دیا۔

”جاننا ہوں تمہارے کاموں کو۔ سائیں کرنی ہوتی

ہیں تمہیں وہاں جا کر میرے اور میرے گھر والوں کے

خلاف۔“ طیبہ کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چار نہیں تھا۔

☆☆☆

طیبہ گھر دیکھ آئی، اسے پسند آیا۔ اس نے اپنے

ساری جمع پونجی نکالی پھر بھی جتنے پیسے چاہیے تھے ان میں

سے چار لاکھ روپے کم تھے۔ اس کا دل بہت دکھا۔ اتنے

سالوں کی محنت کے بعد بھی اس کے پاس اتنے پیسے نہیں

تھے کہ وہ سر چھپانے کو گھر لے جیتی۔ وہ بہت ادا اس تھی۔

راشدہ نے اس کی ادا سی پوری شدت سے محسوس کی۔

”کیا ہوا طیبہ؟“

”کیا بتاؤں راشدہ، یہ زندگی کے مسئلے جینے

دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ ختم ہی نہیں ہوتے یہ

مسئلے۔“ وہ بڑی زور درج ہو رہی تھی جو یوں شکوہ زبان

پر آیا تھا۔ ورنہ وہ شکر صبر کا دامن تھا مے رکھتی تھی۔

”دیکھو طیبہ! مسئلے ختم نہیں ہوتے۔ یہ تو زندگی

کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

پھر وہ ختم ہوتا ہے تو کوئی دوسرا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

تو گویا جب تک زندگی ہے تب تک مسئلے مسائل بھی

ہیں۔ یہ مسائل تب ہی ختم ہوں گے جب زندگی ختم

ہوگی۔ یہم یہ بتاؤ اب کیا ہوا ہے؟“ راشدہ نے حسب

معمول تسلی دی تو طیبہ نے اسے ساری بات بتادی۔

”اگر اگلے مہینے تک انتظار کر سکتی ہو تو کرلو،

میری ایک لاکھ کی کمیٹی نکلتی ہے، وہ تم رکھ لینا۔“ راشدہ

نے خلوص سے کہا۔

”ارے نہیں، راشدہ۔ میں نے اس لیے نہیں

بتایا تھا۔“ وہ گھبرا ہی گئی۔

”جانتی ہوں۔ اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو۔ اللہ کوئی

سبیل نکال دے گا۔“

☆☆☆

”ہاشم! میرا خیال ہے، میں یہ گھر نہیں لے

”جی آپا! ضرور۔“ قاسم نے کہا۔

”اب میں چلتی ہوں۔ تم لوگ کوشش کرنا کہ یہ کام

جلدی ہو جائے۔“ طیبہ نے جاتے جاتے بھی تاکید کی۔

”یار! بڑا حوصلہ ہے طیبہ آپا کا۔“ ہاشم نے اس

کے جانے کے بعد کہا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، جس طرح انھوں

نے وقت گزارا ہے شاید ہی کوئی گزارتا ہو۔“

”مگر ایک بات ہے کہ ہمت نہیں ہاری آپا

نے۔ حالات سے پورا پورا مقابلہ کیا ہے۔“

”اتنی اچھی ہیں آپا اور قسمت کیسی ہے ان کی۔“

ثنا کے لہجے میں ملال تھا۔

”ثنا! ہر بات پر قسمت کو دوش مت دیا کرو۔ امی،

ابو کے غلط فیصلے کا نتیجہ ہے یہ۔“ حنا نے دکھ سے کہا۔

☆☆☆

ہاشم کے پرانے محلے میں ڈھائی مرلے کا ایک

گھر رک رہا تھا۔ سنگل اسٹوری تھا۔ مناسب دام

لگائے گئے تھے۔ ہاشم نے اسے فون کیا۔

طیبہ کمرے میں تھی۔ حماد بھی وہیں تھا۔ جب

ہاشم کی کال آئی۔ طیبہ نے کال ریسیو کی اور موبائل

کان سے لگا لیا۔

”وعلیکم السلام ہاشم، کیسے ہو؟“ حماد کی ساری

حیات متوجہ تھیں۔ اسے اپنی بیوی کے دونوں بہنوں

بہت برے لگتے تھے۔ جو طیبہ کو دیوی کا درجہ دیتے

تھے اور اسے ذرہ برابر عزت نہیں دیتے تھے۔ اسے

اپنی طرف متوجہ دیکھ کر طیبہ کا دل چاہا، اٹھ کر باہر چلی

جائے۔ مگر اس گھر میں وہ نہیں بھی چلی جاتی ہر جگہ یہی

کچھ تھا۔ سو وہ سہولت سے بات کرنے لگی۔

”آپا! ایک گھر رک رہا ہے، آپ دیکھ لیں،

قیمت بھی مناسب ہے۔“ ہاشم کی آواز اُبھری۔

”اچھا! کہاں ہے؟“ طیبہ نے پوچھا۔

”ہمارے پرانے محلے میں ہے۔ اچھا گھر ہے

آپ ایک دفعہ دیکھ لیں چل کر۔“

”ٹھیک ہے میں اتوار کو آتی ہوں تمہاری

طرف۔“ طیبہ نے بات کر کے موبائل آف کر دیا۔

سکوں گی۔“ شام کو طیبہ اپنی بہنوں کے گھر گئی۔
 ”کیوں آیا! بڑا مناسب ہے۔“ ہاشم نے کہا۔
 ”وہ..... وہ.....“ طیبہ کی زبان ساتھ چھوڑ گئی۔
 خوددار تھی۔ خودداری نے زبان بند کر دی۔
 ”کیا بات ہے آپا۔“ چھوٹا بہنوئی قاسم بھی سوال کرنے لگا۔

”کیا بات ہے آپا؟ بتائیں۔ ہم بھی آپ کے بھائی ہی ہیں۔ جو بھی مسئلہ ہے، کھل کر بتائیں ہمیں۔“ ہاشم کو کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیوں پریشان ہے۔
 ”وہ میرے پاس رقم پوری نہیں ہے۔“ طیبہ شرمندہ سے لہجے میں گویا ہوئی۔ آنکھوں میں پانی سا اٹھہرا۔
 ”کتنے پیسے کم ہیں؟“ قاسم نے پوچھا۔
 ”چار لاکھ۔“ طیبہ کی آواز بجھی ہوئی تھی۔
 ”لیں یہ کون سا مسئلہ ہے، ہم دے دیتے ہیں۔“ قاسم نے مؤدب ہو کر کہا۔

طیبہ نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ قاسم سمجھ گیا کہ خوددار عورت کیوں تڑپتی ہے۔
 ”ارے آپا! ادھار لے لیں ہم سے۔“
 ”جی آیا! آپ بسم اللہ کریں۔“
 ”مگر اتنی بڑی رقم قرض۔“

”ارے آپا! آپ آہستہ آہستہ لوٹا دیجیے گا ہم کون سا معاف کر رہے ہیں آپ کو۔“
 ہاشم نے اس کی خودداری کو دیکھ کر ہلکے پھلکے انداز میں مسکرا کر بات ختم کی۔ طیبہ نے گھر خرید لیا۔
 گھر خریدنے کی بات نکلی تو کچھ لوگوں نے تعریف کی، کچھ کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے اور کچھ نے اس کی کردار کشی شروع کر دی۔

”ارے بہت محنت کی طیبہ نے۔“
 ”بڑی میسنی اور چالاک ہے، دیکھا کیسے گھر خرید لیا۔“
 ”ارے ایسے کیسے اکیلی عورت گھر بناتی ہے بھلا۔“
 اس طرح کی عورتوں کے بڑے تعلقات ہوتے ہیں۔“
 طیبہ نے سب سنا اور نظر انداز کر دیا۔
 یوں طیبہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے کی تیاریاں کرنے لگی۔

”ماموں، ممائی! آپ دونوں بھی میرے ساتھ چلیں۔ یہاں جگہ کی تنگی ہے، آپ لوگ وہاں میرے ساتھ سہولت سے رہ لیجیے گا۔“

طیبہ نے دونوں کو مخاطب کیا۔ ماموں خوش تھے کہ اس کا اپنا گھر بن گیا تھا اور ممائی اتنی ہی ناراض۔
 ”ارے جاؤ لی لی۔ بڑا رہ لیا تمہارے ساتھ۔“
 تم یہاں کسی کو نہیں پوچھتی تھیں تو اپنے لے جا کر توڑ ہر ہی دے دو گی، ہم کو۔ تم جیسی خود سر عورت کب کیا کر گزرے، کون جانے۔“

جیسے گدھ کی آنکھ صرف مردار ہی دیکھتی ہے ویسے ہی ممائی کو بھی طیبہ میں عیب ہی عیب نظر آتے تھے۔ آج تک کبھی جو اس کی کوئی خوبی ان کو نظر آئی ہو۔ طیبہ خاموشی سے ان کا چہرہ ٹکنے لگی۔
 ”تم چپ کرو۔“ ماموں نے ممائی کو جھڑکا۔
 ”ہاں ہاں۔ تم تو جاؤ گے اس کے ساتھ۔ ہمیشہ اس کا ہی ساتھ دیا ہے تم نے۔“

”بیٹا! تم جاؤ، اللہ تمہیں وہاں رہنا بسنا نصیب کرے۔ ہمیں یہیں رہنے دو۔“ ماموں ممائی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے سو سہولت سے انکار کر دیا۔
 ”پھر بھی، آپ لوگوں کا جب جی چاہے، آپ میرے پاس آسکتے ہیں۔“

طیبہ نے خلوص سے کہا۔ ماموں کی آنکھوں میں آنسو سے جھلملائے تھے اور ممائی نے ہاتھ جھلا کر ناک پر سے کبھی اڑائی تھی گویا۔
 ”جی آپ چلیں گے ہمارے ساتھ یا آپ بھی یہیں رہنا پسند کریں گے؟“ حماد کمرے میں آیا تو طیبہ نے پوچھا۔

”تم کہتی ہو تو نہیں جانتا۔“ حماد کو ہر حال میں ساتھ ہی جانا تھا۔ طیبہ کے بعد یہاں اس کھٹو کا خیال کون رکھتا۔
 اس کی نظر میں طیبہ لاکھ نافرمان بھی مگر اس کے حقوق کی ادائیگی کرنی بھی یہاں تک کہ بچیاں بھی اس کے ساتھ ادب سے بات کرنی تھیں۔ حالانکہ اس کی نوبت کم ہی آتی تھی پھر بھی وہ اسے عزت سے مخاطب کرتیں۔

حماد کو طیبہ کی خود مختاری سے چڑھتی کہ عورت ہو

کر اس کی مردانگی کو اہمیت نہیں دیتی تھی۔ مردانگی صرف مرد ہونا نہیں ہوتا۔ مردانگی کا مطلب اپنی ماں بہن، بیوی اور بچوں کے لیے سایہ بن جانا ہوتا ہے۔ ہر تکلیف برداشت کرنا ہونی ہے۔ مگر حماد یہ بات نہ سمجھ سکا اور طیبہ سے بدظن ہی رہا۔

☆☆☆

سالوں گزر گئے۔ طیبہ کی ترقی ہو گئی وہ اب سیکشن ہیڈ تھی، تنخواہ بھی بڑھ گئی۔ ماموں ممانی ابھی بھی اپنے پرانے گھر میں تھے۔ طیبہ ہر مہینے ان کی ساری دوائیاں اور کھانے پینے کی کافی چیزیں دے آتی۔ وہ دونوں کو ساتھ لانا چاہتی تھی مگر ممانی کی ہٹ دھرمی نے ایسا نہ ہونے دیا۔ حماد ویسے کاویا تھا۔ نہ ایک انچ کم نہ ایک انچ زیادہ۔

اب اس کی بچیاں جوان تھیں۔ ایک اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھی اور دوسری کی رہی تھی۔ اماں اُنسیہ کے لیے طیبہ کے بھیجے کا رشتہ لانی تھیں۔ طیبہ کو اس میں حماد کا عکس نظر آتا تھا۔ اس نے دبے لفظوں میں انکار کر دیا۔ اماں نے حماد سے بات کی اور حماد نے طیبہ کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بس اتنا بولی۔

”میں نہیں چاہتی، اُنسیہ میرے جیسی زندگی گزارے۔ ویسے ساری زندگی بچیوں کا وجود آپ کے لیے نہ ہونے کے برابر رہا ہے اور اب ان کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے چلے ہیں آپ، واہ بھئی۔“ اور حماد بکتا جھکتا گھر سے چلا گیا۔

”آپ کی بیٹی بڑی خود سر ہے، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ خود آکر اسے مناسکتی ہیں تو منالیں۔“

اس نے پھوپھو کو صاف کہہ دیا۔ پھر اماں آئیں اپنی فلاسفی کو لے کر پہلا رشتہ منع نہیں کرتے اور وہ چڑ گئی کہ ابھی تک ان کی یہی سوچ تھی۔ وہ اماں سے سختی سے بات کر کے آئی تھی۔ اماں کے ساتھ اپنے روئے کا خیال آتے ہی اس کی سوچیں یک دم جھٹکے سے یوں رگ گئیں جیسے پانی میں تیرتی ہوئی کسی اچانک کسی طوفان کے پھیرے سے کناروں کی دلدل میں کھب جائے۔

☆☆☆

رات کو وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر اماں کے پاس آئی اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”اماں! معاف کیجیے گا، میں نے دوپہر کو آپ کا دل دکھایا مگر میں کیا کرتی۔ بس میں نہیں چاہتی، میری بیٹیاں بھی میری جیسی زندگی گزاریں۔ میں چاہتی ہوں، ان کے شوہران کی چھپر چھاؤں ہوں، انھیں گرم ہوانہ لگنے دیں۔ ان کے ساتھ ہمیشہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے رہیں۔ ان کی عزت کریں، ان سے محبت کریں۔“

اس کے لہجے میں اتنی حسرتیں بین کر رہی تھیں کہ اماں بے اختیار نظریں چرا گئیں۔

”میری کو لیگ ہے ناراضہ! اس نے اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے کہا ہے اُنسیہ کے لیے۔ وہ سارے حالات سے باخبر ہے میرے۔ بیٹا انجینئر ہے۔ اچھی جگہ پر کام کر رہا ہے۔ میں نے اسے ہاں کر دی ہے۔ بس اب کوئی تاریخ دے کر رسم کرنی ہے۔“ اس نے اماں کی گود میں سر رکھا تو اماں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

”اور مزے کی بات ہے، راضہ نے آپ سے پہلے رشتہ مانگا تھا تو دیکھ لیں میں نے اپنی بیٹی کے لیے آنے والا پہلا رشتہ ہی قبول کیا ہے۔ انکار نہیں کیا۔“ طیبہ نے آنکھیں موندیں۔

”بہت اچھا کیا بیٹا۔“

”مگر ایک بات بتاؤں اماں! اگر میری بیٹی کے لیے آنے والا پہلا رشتہ اس کے جوڑ کا نہ ہوتا تو میں صاف انکار کر دیتی۔ کیونکہ بیٹی کے لیے آنے والا پہلا رشتہ اسی صورت میں قبول کرنا چاہیے جب وہ مناسب ہو۔ جب وہ واقعی اس کے لیے صحیح جوڑ ہو، پہلا رشتہ ٹھکرانے کی بدشگونی سے بچنے کے لیے اپنی بیٹی کو جلتی بھٹی میں نہیں پھینکنا چاہیے۔“

طیبہ کی بات سن کر اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اُس نے اماں کی گود میں سر رکھ کر سکون سے آنکھیں موند کر گہری سانس بھری اور پھر مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اندھیروں کو وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اب آگے روشنی ہی روشنی تھی۔

☆

شانِ یہ الطافِ ہاشمی

حیاتِ حیات

صفورہ آپا کے گھر سے تو کبھی کسی کو ٹھنڈا پانی
پینا بھی نصیب نہ ہوا تھا اگر جو کبھی کچھ پکاتیں بھی
تو مردہ سے چاول جن میں ایک آدھ بونی چربی ڈال
گر خانہ پری کر لی جانی۔

صفورہ آپا اس کو بھی سخت احسان خیال کرتیں کہ وہ
بڑی محنت سے ٹوٹا چاول کا بھرتہ تیار کر رہی ہیں۔ اپنی



☆☆☆

اس بھری دوپہر جب وہ ان کی مہمان تھی۔ آیا رفعت جو خود کو اللہ کے انتہائی قریب تر محسوس کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے سٹیل کے گلاس میں گرم پانی بھی اس کے کہنے پر اسے دیا تھا اور پھل کے منہ کے زاویے بتاتے تھے کہ وہ ایویں ہی بد صورت اور بدنصیب نہیں تھی غزل کو غصہ آیا اور اسے مزید ٹھنڈا کر گیا تھا۔ اللہ اپنے خوش نصیب بندوں کے حصے میں مہمان نوازی کی صفت رکھتا ہے اور آنے والا تو اپنے نصیب لے کر آتا ہے ہی تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان کو کھانا کھلانے کی تاکید نہیں فرمائی۔

غزل کا دل رسول اللہ سے محبت کرتا تھا تو دماغ بھی اسی رخ پر چل پڑا تھا پر اس جھوٹی کا کیا کیا جائے جو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ رات تک اسے عجیب اٹھا پنچ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اب وہ کیا کرے انہیں سبق سکھانا تو بنتا تھا پھر فیصلہ کیا ذرا سے کھانے کی خاطر جس کا وعدہ رازق نے خود لیا ہے کیا اس کی خاطر؟ وہ سوچ رہی تھی۔ رات ڈھل رہی تھی۔ خلا کی چادر میں ٹنگے چھوٹے چھوٹے ستارے عظیم نیکیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بدی کا اندھیرا انہیں کسی بھی طرح بھی ڈھانپ نہ سکا تھا۔ غزل مثبت لڑکی تھی۔ اچھا سوچتی تھی نیکی کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

☆☆☆

سو کھے سڑے چہرے والی صفورہ آپا کی آمد آمد تھی۔ کھانا کبھی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اللہ کا شکر تھا کہ فریج سارے لوازمات سے بھرا رہتا تھا اور ک لہسن ٹماٹر فروٹ، اللہ سلامت رکھے۔ شاہ زرنے کبھی ختم نہیں ہونے دیے۔

اس گرم دوپہر میں بھی ان کی ہر ادائیہی نرالی تھی۔ عمر نے جیسے جیسے تیزی سے آگے کا سفر طے کیا تھا۔ ویسے ویسے انہوں نے الٹی طرف کو منہ رکھ لیا تھا ان کے لاڈلے چھوٹے بچے کی طرح سے بھی سمجھ میں نہ

بھابیوں سے انہیں سخت نفرت تھی، البتہ ان کے گھروں میں جا کر مزے مزے کے کھانے پکوانے اور کھانے سے انہیں بڑی محبت تھی جب بھی آ کے بیٹھتی کہتیں۔

”فریج میں سیبوں کا انبار پڑا تھا امرود علیحدہ پر کھانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“

غزل کو حقیقت خوب معلوم تھی سستے والے سیب یہ کہہ کر بھابی کے سامنے کاٹتیں۔

”کہ ہیں تو سیب ہی ناں چھوٹے بڑے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

سارے فرق انہیں میکے آ کر خوب دکھائی دیتے تھے۔ لمبی سی سیاہ گردن اکڑا کر دیکھنے لگتیں کہ اب بھلا ان کے بھائی ان کی خاطر مدارت میں کہاں تک جاتے ہیں، شاباشی یا محبت کے بدلے محبت کا تو سوال ہی کیا۔

”لکھ لعنت تیرے کالے نرالے منہ پر۔“

صفورہ آ یا سب سے چھوٹے بھائی سے محبت کا اظہار شروع کرتیں اور بھائی بے چارے کی خون پسینے کی پیمائی کھانے لگتیں۔ پتا نہیں وہ اتنا غصے میں کیوں رہتی تھیں۔ بھلا کوئی پوچھے کہ یہ محبت ہے یا وہ ایسی ہی محبت کر سکتی ہیں۔

غزل انتہائی حساس دل بھابی تھی، دل سے کھانا پکا کر کھلاتی تو تھالی میں چھید کرنا کبھی نہ بھولتیں۔

”بھئی ہے تو ہمارے بھائی کا ناں کیوں نہ پکوا کر کھائیں۔“

پھر غزل کی حساس طبیعت پر نفرت غلبہ پانے لگی جب وہ خود کو بے وقوف سمجھے جانے کے قہے سنی ٹھیک ہے کہ وہ مہمان نوازی مگر اچھائی کے بدلے برائی سن کر تو بڑے دل بھی چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔

اس کی اچھائی کا یہ ہرگز مطلب نہیں لیا جانا چاہیے

تھا کہ وہ بے وقوف ہے یا ان سے ڈرتی ہے، وہ ڈرنے والوں میں سے کبھی نہ رہی تھی ہر قدم سنبھال کر چلنا جانتی تھی مگر صفورہ آپا نے اس کی مہمان نوازی کو اس کی کمزوری خیال کیا تھا غصے سے بیٹھ کر بوٹیاں نوچیں اور دو قدم آگے بڑھ کر نئے الزامات کا طوفان برپا کر دیتیں۔

”میں اور میرا میاں میں اور میرا پیارا صاف ستھرا گھر۔“

”بائی تو سنا ہی دنیا جیسے گھر میں بس رہی ہے۔“ نہ کوئی اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے نہ کوئی بیوی شوہر سے محبت کرتی ہے۔ کبھی کسی دوسرے کی بھی سن لیا کریں آپا۔ مگر انہوں نے بھی سنی ہی نہیں۔ البتہ غزل کے دل میں ننھے ننھے شکوے چھوٹی چھوٹی بے سکونیاں پوری جزئیات سے روشن ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

کئی دنوں سے وہ یہیں تھیں۔
”پتا نہیں ان کا رانجھا انہیں یاد کیوں نہیں کر رہا بے تاب کیوں نہیں؟“ غزل نے سوچا۔

”میں اور میرا وجود بے کار ہیں اس کے لیے ایک سے ایک عورت میرے سامنے..... میں ایک وقت کھا لیتی۔ کسی کٹیا میں بس جاتی مگر بے وفائی تو نہ سہتی۔ اس کا سہنا بہت دشوار ہے میرے لیے۔ میں بے قرار ہوں کہیں قرار نہیں پاتی۔ روز مرتی ہوں کہ مرنے سے ڈرتی بھی نہیں۔ وہ تو اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکیوں کو ایڑی لوڈ کر دیتا ہے ان سے اخلاق سے گری ہوئی بد بودار غلیظ باتیں کرتا ہے وہ بھی میرے سامنے، اسے کسی سے ڈر نہیں لگتا نہ مجھ سے نہ میرے بھائیوں سے میں کیا کروں؟“

وہ یقین نہیں کر سکتی تھی مگر کبھی یقین نہ کرتی جو اگر وہ یہ باتیں اپنے بھائی سے کرتی نہ پکڑی جاتیں۔ ان کا دکھ تو بہت بڑا تھا۔ غم کھا جانے والا تھا۔ ان کے اندر دھواں نہ بھرے تو کیا پھول کھلیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھاوجوں کو زچ کیا کرتیں سکون ملتا تھا انہیں جب ہی تو وہ اندر سے بے سکون ہیں جب ہی تو بے سکونی پھیلا رہی ہیں۔ یہی تو حقیقت ہے باقی سارا تو دکھاوا ہے اور دکھاوا تو جھوٹا ہوتا ہے نا!



آنے والے تھے اس عمر میں تو انہیں خوب میچور ہو جانا چاہیے تھا مگر ان کا حساب الٹا ہی لگتا تھا۔

”میں تو بہت صاف ستھری رہتی ہوں بیڈ پر کبھی ہلکی سی سلوٹ بھی برداشت نہیں کرتی فرش ایسا۔“
”ہاں ایسا کہ جس پر مکھیوں کا پورا قبیلہ آیا د آزاد پھرتا رہتا ہے پتا نہیں کون سی صفائی کا ذکر فرمائی رہتی ہیں۔“

غزل نے کلس کر سوچا اور وہاں سے چلی گئی ٹھیک ہے کہ انہیں دیکھ کر غزل کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ کوئی کہاں تک برداشت کرے آخر اتنی منفی شخصیت کو اس کی غیبت ادھر تو اس کی غیبت ادھر۔

”یہ اللہ یہ کب جائیں گی۔ پتا نہیں کب چپ ہوں گی۔ سکھڑا پا تو وہ ہے جس کی تعریف کوئی دوسرا کرے۔ یہ خود ہی اپنی تعریف۔“

گوشت بھونٹے گرم بھاپ پر اس نے پانی کا چھینٹا دے کر سرخ ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیا اور ایک بوٹی پلیٹ میں نکال لی۔

”اب ان کو سوچ سوچ کر اپنا جی کون جلاتا پھرے جانے دو بس۔“ ایسی کتنی گرم دوپہریں سرد شامیں گزرنے کو تو گزر رہی گئیں مگر دل پر نقش چھوڑ کر گئیں۔

اللہ جس کی چاہے جیسی فطرت بنا دے اور فطرت سے کیا لڑنا مگر وہ اپنی بد فطرتی میں حد سے آگے نکل گئیں۔ وہ میسے گئی تھی جب صفورہ آپا آ گئی تھیں۔ سکھوں سے بھرا گھر یہ غزل نے بڑی محنت سے بھرا تھا۔ چھوٹے چھوٹے برتن، لباس، چھوٹی خوشی میں بڑی راضی رہنے والی غزل پہ صفورہ آپا نجانے کون سا غصہ نکالنے چلی آئی تھیں۔

”میری اور میرے میاں کی محبت کی مثال ایک زمانہ دیتا ہے ہیرا کچھ کی جوڑی ہے ہماری وہ نہ مل سکے اور ہم مل گئے۔ وہ تو مر گئے بے چارے اور آپ

کی جوڑی دوسروں کو مارنے کے لیے زندہ رہ گئی۔“
غزل کو یہ محبت ناے بھی برے لگتے تھے جس میں کسی دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔

پریت کی رویت انوشی

”مجھے نہیں پسند کھانا وانا پکانا۔ خشک کام ہیں سارے۔ میں تو کپڑے دھونے اور صحن وغیرہ دھونے کے کام کر سکتی ہوں۔“

زیمیل نے پاپ اور جھاڑو کوٹنے میں رکھ کر اپنے مزاج کے کام گنوائے۔

”ہاں تو سیدھے سادے لفظوں میں کہو..... تم دھلائی میں ماہر ہو۔“ سمرہ نے کچن کی کھڑکی سے نکال کر کہا تو زیمیل نے اس سے گھور کر دیکھا۔

”بس مجھے پانی سے گہرا لگاؤ ہے۔“ زیمیل نے دھلے صحن کو دیکھتے ایک ادا سے کہا۔

”یہ پانی سے لگاؤ تمہیں لے نہ ڈوبے۔“ سمرہ نے ڈرایا۔

وہ ایک ہاتھ میں جھاڑو اٹھائے دوسرے ہاتھ سے پاپ پکڑے شلوار کے پائینچے چڑھائے زور دھور سے صحن دھونے میں مشغول تھی۔

”زیمیل بیٹا! اب بس کر دو، واٹر سپلائی والوں نے پانی بند کر رکھا ہے۔“ اماں نے صحن کے ایک طرف لگے نلکے کو بند کر دیا تو زیمیل کے کام کرتے ہاتھ رک گئے۔

”اماں! ابھی دھونا شروع کیا تھا۔“ زیمیل نے منہ بسور کر احتجاج کیا۔

”تم دو گھنٹے بھی دھوتی رہو گی پھر بھی یہی کہو گی۔ تمہارا دل دھلائیوں میں زیادہ لگتا ہے۔ گھر کے اور کام بھی ہیں۔“ اماں نے بے زار ہو کر اسے گھر کا۔

ناؤلیٹ





”خدا نہ کرے سمرہ! جب بولنا، الٹائی بولنا۔“
اماں نے جھر جھری لے کر ڈانٹا تو سمرہ نے منہ بنا کر
کھڑکی سے سر اندر کر لیا۔
”چلو اب جا کر بہن کا ہاتھ بناؤ کھانا بنانے
میں۔“

اماں نے زمیل کو رسانیت سے کہا تو وہ منہ
بناتی اندر کچن میں چلی آئی۔ جہاں سمرہ سندھی بریانی
کا مسالا تیار کر رہی تھی۔
”واہ! خوشبو تو بہت اچھی آرہی ہے۔“ زمیل
نے لباسانس کھینچ کر کہا تو سمرہ نے اچھٹی نظر اس پر
ڈالی۔

”برائے مہربانی آپ اپنی تشریف کاٹو کر باہر
رکھیے۔“ سمرہ کے کہنے پر چولہے پر دھرے دیگچوں
کے ڈھکن اٹھاتی زمیل نے منہ پھلایا۔
”ہاں جی۔ سرالیوں کے لیے اہتمام ہو رہا
ہے۔ سو مہارانی ہمیں کہاں لفٹ کروائیں گی۔“
اس کی بات پر سمرہ کے چہرے پر گلال
چھا گیا۔

”تم کام کم اور گند زیادہ کرتی ہو۔ اسی لیے باہر
جاؤ۔“
”گند اور میں؟ مجھ سا صفائی پسند کہیں دیکھا
ہے؟“ زمیل نے اپنی بڑی سی آنکھیں پھیلا کر
پوچھا۔

”اچھا صفائی کی دیوی! مجھے تنگ مت کرو اور
جلدی سے اپنا حلیہ درست کر لو چاچی والے پہنچتے ہی
ہوں گے۔“

سمرہ نے غلٹ میں ہاتھ چلاتے کہا تو زمیل
نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا جو پانی سے گیلے ہو کر جسم
سے چپک رہے تھے۔ حلیہ درست کرنا ناگزیر تھا، سو وہ
شرافت سے کچن سے نکل آئی۔ پھر کمرے میں آ کر
الماری سے ایک جوڑا نکالا اور ہاتھ روم میں مٹس گئی۔

☆☆☆

وہ نہا کر نکلی تو باہر سے آوازیں سنائی دے رہی

تھیں۔
”شاید چاچا والے آ گئے۔“ زمیل نے سوچا
اور بالوں میں برش پھیر کر باہر آ گئی۔

”ارے میری شہزادی! آ، میرے پاس۔“
چاچی جو برآمدے میں سمرہ کو لپٹائے کھڑی تھیں،
زمیل کو دیکھ کر بولیں۔

وہ آگے بڑھی تو پاس کھڑے چاچا نے سر پر
ہاتھ رکھا اور چاچی نے زور سے لپٹا لیا۔ اب چاچی کی
دونوں بانہوں میں یہ بہنیں لپٹی کھڑی تھیں۔
”ماشاء اللہ، میری دھی رانیاں کتنی پیاری ہوتی
جاری ہیں نجمہ!“

وہ اماں کو مخاطب کر کے بولیں تو سمرہ کچھ شرما
گئی کہ شاہنواز بالکل سامنے آنکھوں میں پیار لیے
اسے دیکھ رہا تھا۔

دوسری طرف زمیل نے کچھ بے چینی محسوس کی
کہ پاس کھڑا شاہ زوار بھی نگاہوں کو اس پر فوکس کیے
کھڑا تھا۔

”اللہ نصیب بھی پیارے کرے۔“ اماں نے
بے اختیار کہا۔

”کیوں نہیں، ان شاء اللہ۔ میری رانیوں کے
نصیب آسمان پر تاروں کی طرح جگمگائیں گے۔“
چاچی نے پیار سے باری باری دونوں کی پیشانی
چومی۔

”آمین۔“ اماں نے دل سے کہا۔
”اماں! زمیل باجی سے ہمیں بھی ملنے دو۔“

شہرام اور عروہ نے شور مچایا تو بہ مشکل چاچی نے
اپنی بانہیں ڈھیلی کیں اور دونوں بہنیں آزاد ہوئیں۔

چاچی کا پیار روایتی اور دیہاتی قسم کا تھا۔
زمیل اس پیار کے اظہار سے گھبراتی تھی۔ اب بھی
آزادی ملنے پر ایک بڑا سا سانس لیا اور اپنے چھوٹے
کزز کو زناکت سے چھو کر پیار کیا جبکہ وہ دونوں گلے
لگنے کو بے تاب تھے۔ خیر یہ حسرت انہوں نے سمرہ
سے مل کر پوری کی۔

اب بھی کھانے کے بعد چائے سے لطف اندوز ہوتے دونوں بھائی نہ ختم ہونے والی کچہری میں مصروف تھے۔ ساتھ بیٹا یادگار وقت، ملکی حالات، گھریلو پریشانیاں سب ان کی باتوں کا حصہ تھیں۔ شاہنواز اور شاہ زوار دونوں دوپہر کی نیند لینے بیڈروم میں چلے گئے تھے۔ جبکہ شہرام اور عروہ بے چین سارے گھر میں پھر رہے تھے۔ چاچی اور اماں کی الگ محفل جمی تھی، ایسے میں سمرہ اور زمیل بھی آرام کی غرض سے کمرے میں چلی آئیں۔

”زمیل! تمہارا رویہ بہت خراب ہوتا جا رہا ہے چاچی والوں سے۔“ سمرہ نے تنہائی میں اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”ہم سے کوئی سلام دعا نہیں۔“ شاہنواز نے گلا کھنکار کر کہا تو سمرہ نے مسکرا کر سلام کیا۔

”کیسے ہو شاہنواز ادا؟“ زمیل دوپٹا ٹھیک کرتی آگے بڑھی تو شاہنواز نے اپنا ہاتھ حسب روایت اس کے سر پر رکھا۔ پاس کھڑے شاہ زوار نے کندھے پر بڑی اجرک دوسرے کندھے پر منتقل کی۔ زمیل نے اچھتی نظر اس کے کسرتی سراپے پر ڈالی۔ وہ براؤن کلر کی شلوار قمیص میں لمبوس براؤن آنکھوں میں دلچسپی لیے زمیل کی طرف ہی متوجہ تھا لیکن زمیل نے اسے دانستہ نظر انداز کیا اور آگے بڑھ گئی۔

”خوش ہو ادا؟“

سمرہ آگے بڑھ آئی تو اس کے سر پر ہاتھ رکھتے شاہ زوار کی آنکھوں کے بجھتے دیے اس سے چھپے نہ رہ سکے۔

”ادی کچھ لوگ خوش نہیں ہونے دیتے۔“ شاہ زوار نے پھینکی مسکراہٹ سے کہا۔ شاہنواز نے بھائی کے کندھے پر بازو پھیلا کر جیسے اس کی ہمت بندھائی۔

”اب اندر بھی چلو، یہیں ساری کچہری کرنی ہے۔“ چاچی بھاری وجود کے ساتھ زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکیں۔

”سمرہ بیٹا! تم بہن کے ساتھ مل کر کھانا لگاؤ تب تک تمہارے بابا بھی آجائیں گے۔“ اماں نے سمرہ کو کہا تو وہ سر ہلاتی کچن کی جانب مڑی۔ زمیل کو کہنا بے کار تھا۔

☆☆☆

بابا کے آفس سے آتے ہی خوش گوار ماحول میں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ وہ اپنے بھائی کی آمد پر بہت خوش تھے۔ گاؤں کی زمین داری کے بکھیڑوں میں اچھے چاچا اور شہر کی دوڑتی بھاگتی زندگی کا ساتھ دیتے بابا جب کافی وقت بعد ایک دوسرے سے ملتے تو دونوں کی عید ہو جاتی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناؤز

زرد موم راحت جبین 1000/-

حساب دل رہنے دو نبیلہ عزیز 400/-

محبت من محرم سمیرا حمید 400/-

ایک تھی مثال رخسانہ نگار عدنان 500/-

یہ گلیاں یہ چوہارے فائزہ افتخار 400/-

دست میجا نگہت سیما 400/-

گل کہسار فرح بخاری 400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ زمیل صاف مگر گئی۔

”ایسی ہی بات ہے۔ چاچی کس قدر پیار سے تمہیں گلے لگا رہی تھیں اور تم منہ بنا کر ایسے مل رہی تھیں، جیسے احسان کر رہی ہو۔“

”میرا دم گھٹتا ہے ایسی قربت سے۔“

زمیل کے کہنے پر سمرہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”وہ اتنی سادہ ہیں کہ تمہارا رویہ بھی محسوس نہیں کرتیں لیکن مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ اتنی گرم جوشی کا جواب ایسے دیا جاتا ہے اور شاہ زوار کو بھی تم اتنا نظر انداز کرتی ہو۔ کزن ہے وہ۔ ڈھنگ۔ سہ سلام بھی نہیں کرتیں۔“

سمرہ کی بات پر زمیل نے لب بھینچ لیے۔

”وہ کزن کے علاوہ ایک اور رشتہ بنانے کا خواہش مند ہے جو ممکن نہیں۔“

”کزن سے ہٹ کر تم سے ایک رشتہ بندھا ہوا ہے اس کا زمیل! تم اس کی بچپن کی منگ ہو۔“ سمرہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”میں نہیں مانتی بچپن کے طے شدہ رشتوں کو۔“ زمیل پھر اٹھی۔

”کیا کی ہے شاہ زوار میں؟ تعلیم یافتہ نہیں، خوب صورت نہیں، پیسے والا نہیں۔“ سمرہ بھی غصہ ہوئی۔

”وہ میرا آئیڈیل نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی تھی۔ سمرہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”اور تمہارا آئیڈیل کیا ہے؟“ اس نے زمیل کو گھورتے پوچھا۔

”میرا آئیڈیل زمین داری میں الجھا ہوا، گاؤں میں رہائش پذیر، شلوار میس میں ملبوس ایک ایسا شخص نہیں جو کسی لڑکی سے محبت کے اظہار کی ہمت بھی نہ رکھتا ہو۔“ زمیل نے تسخراں انداز میں کہا تو سمرہ حیرت میں پڑ گئی۔

”یعنی تمہیں بے باک اور منہ پھٹ لڑکے پسند ہیں، جو نہ بڑوں کا لحاظ کرتے ہوں، نہ معاشرے کی حدود کا خیال؟“

سمرہ کے سوال پر زمیل چپ رہی۔

”بابا بیس سال پہلے اپنا اور ہم بہنوں کا مستقبل سنوارنے دیہی زندگی کو خیر باد کہہ کے شہر آئے تھے تا..... تو اب ہم دونوں کو اس ماحول کا عادی بنا کر، اتنی تعلیم دلوا کر پھر اسی گاؤں کی زندگی میں کیوں جھونکنا چاہتے ہیں؟“ کچھ توقف کے بعد جب وہ بولی تو لہجے میں ٹھہراؤ اور آنکھوں سے بغاوت جھلک رہی تھی۔

”تم صرف اپنی بات کرو زمیل! کیونکہ مجھے شاہنواز سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔“ سمرہ نے اسے ٹوکا تھا۔ ”آج سے پہلے تمہاری روئے اور بے زاری کو میں صرف تمہارا بچپنا سمجھ رہی تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اس حد تک متنفر ہو شاہ زوار سے۔ اس کے لائف اسٹائل اور اس منگنی سے۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے تمہاری سوچ پر، وہ ایک پڑھا لکھا بندہ ہے۔ اپنی زمین داری سے اتنا سٹیمبلش ہے کہ اس کو ہزاروں روپے کی نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔ رہی بات لباس کی، تو یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ وہاں گاؤں میں پینٹ شرٹ پہنے شخص کو عجیب نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔“ سمرہ نے تفصیل سے بات کی، پر زمیل پر سر مو فرق نہ پڑا۔

”مجھے شاہ زوار سے شادی نہیں کرنی اور میں یہ بابا کو کہہ دیتی ہوں تاکہ وہ اس رشتے کو ختم کر دیں۔“ وہ اونچی آواز میں بولتی اٹھنے لگی تو سمرہ نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھایا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ یہ کیا کرنے چلی ہو۔ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہو؟“ سمرہ کا دل چاہا وہ زمیل کو چاٹنا مار دے۔ ”بابا کو صدمہ دو گی۔ اپنے بھائی کے گھر دونوں بیٹیوں کا نصیب جوڑ کر وہ مطمئن ہیں۔ تم کیوں باپ کی خوشی کو منی میں ملا رہی ہو۔“ وہ بچی آواز میں سمجھانے لگی تو زمیل نے لب بھینچ لیے۔

”لیکن مجھے شاہ زوار سے شادی نہیں کرنی۔“ وہ بچوں کی سی ضد سے بولی تو سمرہ نے سر پکڑ لیا۔

وہ اپنی بہن کی لاابالی طبیعت سے واقف تھی۔ اس کی فطرت میں ضد اور بچپنا تھا۔ بابا کے بے جالاڈ پیار نے اسے بگاڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں بیٹیوں سے بے

وہ بی اے کر کے فارغ تھی اور زیمیل کے بچپلرز کا فائنل ایر چل رہا تھا جو دو ماہ میں مکمل ہو جانا تھا۔
”میں نے تمہارے بابا سے دو ماہ بعد کی تاریخ دینے کو کہا۔ زیمیل بھی تب تک امتحانوں سے فارغ ہو جائے گی۔“

اماں یہ کہتے خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ سمرہ ان کو دیکھتی رہی۔ ”اداد اور نے کہا کہ لڑکیاں بری کے کپڑے زیور بھی مرضی کے بنوالیں۔ تمہاری چاچی کو تو نئے زمانے کا فیشن کا پتا نہیں۔ سو وہ بری کے لیے روپے ہمیں دے جائیں گے۔“
اماں مکن انداز میں بتاتی رہیں تو وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

☆☆☆

حسب توقع زیمیل نے یہ بات سنی تو فوراً بھڑک اٹھی۔

”میں نے کہا نا سمرہ! مجھے شاہ زوار سے شادی نہیں کرنی۔ تم نے بتایا کیوں نہیں امی کو۔“ وہ سمرہ پر چڑھ دوڑی۔

”کیا بکواس لگا رکھی ہے زیمیل! شاہ زوار سے شادی نہیں کرنی تو کس سے کرنی ہے؟ آخر ایسا کون سا شہزادہ دیکھ رکھا ہے تم نے۔ جو بڑھ چڑھ کر انکار کیے جا رہی ہو۔“ سمرہ کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ زیمیل کو جھنجھوڑ کر پوچھ بیٹھی۔

”میں صارم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“
زیمیل نے جواب دیا تو سمرہ کچھ دیر ساکت رہ گئی۔
”کون..... کون ہے صارم؟“ اس نے حیرت پوچھا۔

”رویحا کا کرنز۔ امریکا سے آیا ہے، ویل ایجوکیٹڈ اور ویل اسٹبلش۔“ زیمیل نے اپنی یونیورسٹی فرینڈ کا حوالہ دیا۔

”رویحا وہ ہائی کلاس کی آزاد خیال لڑکی۔“ سمرہ نے بھنویں سکھیں۔ ”اس کے امریکا ملٹ کزن سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟ اور تم نے اپنی ممکنگی کا رویحا کو نہیں بتایا؟“ سمرہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

انتہا محبت کرتے تھے اور جتنا ہو سکتا ان کے خمرے اٹھاتے۔ سمرہ اس کے باوجود حساس اور ذمہ دار نکلی جبکہ زیمیل ضدی اور غیر ذمہ دار ہو چکی تھی۔ ہر بات میں اینٹھنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا اور اس کی ہر ضد مان لینا بابا کا فرض۔ لیکن اس بار اس کی بے جا ضد ان کا دل دکھانے والی تھی۔

سمرہ نے پریشان ہو کر زیمیل کو دیکھا جو اس کا چین تباہ کر کے اب موبائل میں مصروف ہو چکی تھی۔

☆☆☆

چاچا اور ان کے گھر والے دو دن رہ کر واپس چلے گئے۔ بابا نے ان کے لیے دفتر سے چھٹی لے لی۔ مہینوں بعد چاچا والوں کا آنا اتنا ہی اہم ہوا کرتا تھا۔ اماں بھی دل و جان سے مہمانوں کی خدمت میں لگی ہوئی تھیں۔ ایک زیمیل بی بی تھیں جو یونیورسٹی سے آ کر منہ سر پلٹ کر پڑی رہتیں۔

سمرہ شاہنواز سے بات چیت کرتی تھی، ان کا رشتہ محبت کی ڈور میں بندھا ہوا تھا۔ شاہ زوار ان کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتا کیونکہ زیمیل شروع سے اس کو رتی بھراہیت نہیں دیتی تھی۔

شاہ زوار سادہ فطرت لڑکا تھا۔ اس کو اپنی چرب زبانی سے کسی کا دل جیتنا نہیں آتا تھا۔ اس کی آنکھیں چاہت کا اظہار کرتیں لیکن زیمیل کو یہ اظہار قبول نہیں ہوا تھا، وہ اکیسویں صدی کی لڑکی تھی۔ جس میں لڑکا اظہار محبت کے لیے لڑکی کو ڈیٹ پر لے جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے اندر ایسی جذباتیت ابھارنے والی اس کی یونیورسٹی کی سہیلیاں تھیں۔ جو ہائی کلاس گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور بوائے فرینڈز اور منگیتروں سے اتنی بے تکلف تھیں، جتنا کسی بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ایسے میں زیمیل نے کسی کو اپنے اس پینڈو سے منگیتر کی ہوا بھی نہ لگنے دی تھی ورنہ رویحا اور انم وغیرہ نے اس کا بینڈ بجا دینا تھا۔

اس بار چاچا کی آمد کا مقصد شادی کی تاریخ لینا تھا۔ جب یہ بات اماں نے بتائی تو سمرہ ڈھنگ سے خوش بھی نہ ہو سکی کہ زیمیل کے تیور تصور میں آ گئے۔

”وہ اکثر رویحا کو پک اینڈ ڈراپ کرنے یونیورسٹی آتا ہے۔ وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ مجھے صارم سے ہی شادی کرنی ہے۔“ زیمیل نے گول مول جواب دے کر ضدی لہجے میں کہا۔

”اماں بابا کی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی۔ جو تم ان راہوں پر چل پڑیں۔“

سمرہ نے افسوس سے بہن کو دیکھا۔

”مجھے اپنی زندگی پسند سے گزارنے کا پورا حق ہے۔ اب تم میری یہ بات اماں تک پہنچانی ہو یا میں ان خود بناؤں۔“ زیمیل نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

”جب اتنا بڑا کارنامہ انجام دے ہی چکی ہو تو اب بھی خود پہنچاؤ۔“ سمرہ نے صاف جواب دیا تو وہ پیر پختی خود ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔

پھر کچھ ہی دیر میں اماں کی پکار پڑنے لگی تو سمرہ دوڑتی باہر نکلی۔ لاؤنج میں آئی، اماں زیمیل پر چیخ رہی تھیں اور بابا صدمے میں گھرے اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھ رہے تھے جس نے کچھ دیر پہلے ان کے سر پر آکر بم پھوڑا تھا۔ جس سے ان کے اعتماد کی کرچیاں اڑ گئی تھیں۔

”ارے سمرہ! سمجھاؤ اپنی بہن کو۔ کیا بکے جا رہی ہے۔ شاہ زوار کے ہوتے کسی اور سے شادی کی بات کر رہی ہے۔ ارے، تمہارے بابا کیا منہ دکھائیں گے ادا اور کو۔ اس بے حس کو کچھ خیال نہیں۔“ اماں نے سمرہ کو دیکھ کر فریاد کی۔ سمرہ کی نظریں شرم سے جھک گئیں۔

”تو کس نے مشورہ دیا تھا آپ کو کہ کم سنی میں ہماری نسبتیں طے کر دیں۔ ضروری ہے کہ جوان ہو کر ہمیں وہ بندہ پسند ہی آجائے۔ غلطی آپ دونوں کی ہے۔“ زیمیل بے خونی سے انہماک سے کہہ رہی تھی۔

سمرہ نے گھبرا کر بابا کو دیکھا، وہ اب بھی خاموش تھے۔

”دیکھا آپ نے یہ کیسے بات کر رہی ہے، میں نے کہا تھا لڑکی ذات کو اتنا سر پر نہ چڑھاؤ لیکن آپ

مانتے نہیں تھے۔“ اماں بابا پر بگڑیں۔

”زیمیل! تم رویحا کی فیملی اور اس کے کزن کو مجھ سے ملنے کا کہو تا کہ شادی کی بات آگے بڑھائی جاسکے۔“ اتنی دیر بعد بابا نے کہا بھی تو یہ۔ اماں نے بے یقینی سے ان کو دیکھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ ہم ادا اور بھا جائی کو عین وقت پر کیا جواب دیں گے۔“

”دے دوں گا جواب میں اپنے بھائی کو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے تھے۔ اندر کی ٹوٹ پھوٹ ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

زیمیل تو یہ سن کر ہی خوش ہو گئی اس کو بابا کا پھیکا پڑتا چہرہ نظر نہیں آیا تھا لیکن سمرہ اپنے بابا کو نم آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

اگلے دن رویحا اور اس کا اسمارٹ سا کزن صارم اور رویحا کی ماما، زیمیل کا ہاتھ مانگنے چلے آئے۔ رویحا کے والد حیات نہ تھے چونکہ صارم کی ساری فیملی امریکا میں رہائش پذیر تھی اسی لیے صارم نے اپنے پاپا سے فون پر بات کروادی۔ بقول اس کے کہ کچھ ضروری معاملات نمٹا کر وہ زیمیل کو بھی امریکا لے جائے گا۔

بابا نے اسی وقت ہاں کرنا مناسب نہ سمجھا، ایک دو دن کی مہلت لینی چاہی لیکن رویحا اور اس کی امی بضد ہو گئیں اور ہاں کروا کر دم لیا۔

ان کے جانے کے بعد بابا متفکر سے دکھائی دینے لگے جبکہ زیمیل ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

بابا نے زیمیل کے ساتھ سمرہ کی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔ انہوں نے چاچا کو کیا کہا۔ شاہ زوار کس دل سے اپنی منگیتر سے دستبردار ہوا۔ زیمیل کو پتا چلا نہ اس نے جاننے میں دلچسپی لی۔ اس کو اپنی خوشی کے آگے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

☆☆☆

دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ سمرہ اور اماں بظاہر زیمیل کے ساتھ شادی کی شاپنگ میں مصروف تھیں مگر وہ زیمیل سے کام کی بات کے علاوہ کچھ نہ بولتیں۔ بابا بھی خاموش

تھے۔

دھڑکا پھر اس نے اپنا آپ اس بے خود بندے سے
چھڑایا اور دور جا کھڑی ہوئی جبکہ وہ وہیں بت بن کر
کھڑا رہ گیا تھا۔
پھر رخصتی ہونے تک وہ دانستہ اسٹیج سے دور
رویحا کے ساتھ بیٹھی رہی۔

☆☆☆

زیمیل شہزادیوں کی آن بان کے ساتھ پارلر
کے آئینے میں اپنی صورت کا عکس دیکھ رہی تھی۔ ماہر
بیوٹیشن کے ہاتھوں نے اسے ایک شاہکار بنا دیا تھا۔
میرون کلر کے گولڈن نفیس کایم سے مزین عروسی
جوڑے میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ بیوٹیشن نے بھی
کئی بار سرگوشی میں اس کی تعریف کی تھی۔

پارلر سے سیدھا اس کو شادی ہال پہنچا دیا گیا۔ اسٹیج
پر بیٹھی وہ لطیف جذبات کے ساتھ فوٹو سیشن کروا رہی
تھی۔ بارات آچکی تھی اور اب نکاح متوقع تھا۔

اچانک ہال میں کھلبلی سی مچی۔ رویحا جو اس کے
ساتھ بیٹھی تھی، کسی سے میل پر بات کر کے بے چین ہو کر اسٹیج
سے اتر گئی۔ اتنے میں سرہ بدحواسی زیمیل کے پاس آئی
اور اس کے قریب بیٹھ کر آہستہ آواز میں کچھ بتایا۔ زیمیل
نے بے یقینی سے بہن کو دیکھا۔

”یہ جھوٹ ہو گا تم کفرم تو کرو۔“ زیمیل نے
دھڑکتے دل سے کہا۔

”تم صارم سے خود بات کرلو۔ مردانہ سائنڈ پر
اس کی انگریز بیوی نے ہنگامہ مچایا ہوا ہے، دوپچے بھی
ساتھ ہیں۔“

سرہ نے اس کے پرس سے موبائل نکال کر اس
کو دیا۔

زیمیل نے لرزتے ہاتھوں سے نمبر دیا۔ پہلی
بار ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

”یو چیٹ..... ہاؤڈرٹو اور میرج۔“

ایک نسوانی آواز انگریزی بولتی زیمیل کے
کانوں سے ٹکرائی۔

”آئم سوری ڈارلنگ۔“

”صارم.....“ اس نے بے چینی سے پکارا۔

زیمیل محسوس تو کر رہی تھی لیکن اسے خاص پروا
نہ تھی۔ اس کا من پسند سا بھی اسے مل رہا تھا۔ اس کو
صارم کی کالز اور میسجز سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ صارم
کا اصرار تھا کہ زیمیل اس کے ساتھ مل کر اپنی پسند کی
شاپنگ کرے لیکن اس معاملے میں بابا نے سختی سے
انکار کر دیا۔ جس پر صارم نے زیمیل کو فون پر نیرو
مانڈ ڈگھرانے کا طعنہ دیا جو زیمیل سہہ گئی۔

سرہ کی شادی زیمیل کی شادی سے ایک دن پہلے
تھی۔ چاچا نے شہر میں کرائے کے گھر میں رہائش رکھی۔
وہ وہیں سے بارات لے کر شادی ہال پہنچے۔

زیمیل رویحا کی فیملی کے آگے پچھی جا رہی تھی،
سو چاچی وغیرہ سے دور رہی بلیک کلر کی نفیس اور
دوپٹے پر سلور نازک سا کام اور سلور پاجامہ اس کے
گورے سر پر بے انتہا چمک رہا تھا۔ سیاہ سلکی بالوں کو
اداسے جھٹکتی وہ واقعی حسین ملکہ لگ رہی تھی۔

جس وقت دولہا اور دلہن ہال میں داخل ہوئے
تو زیمیل فوراً ان کی طرف بڑھی اور اپنے اسمارٹ فون
سے تصاویر اتارنے لگی۔ ہال کے برقی قمقمے بجھا دیے
گئے تھے اور صرف کیمروں کی فلیش لائٹس چمک رہی
تھیں۔ دورویہ قطار میں لگی پھلجڑیاں دولہا دلہن کے
قدموں کے ساتھ چھوٹ رہی تھیں۔

شاہنواز کے پیچھے چلتا شاہ زوار اچانک آگے
آیا تو ان کے مقابل لائے پیروں چلتی اور دھڑا دھڑ
تصویریں بناتی زیمیل ایک دم فلور پر بڑی ہوئی کسی تار
میں الجھ کر منہ کے بل زمین پر گر گئی..... شاہ زوار
نے بے اختیار بڑھ کر اس کو اپنی بانہوں میں تھام لیا۔

بلیک کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس بڑھی ہوئی شیو کے
ساتھ شاہ زوار زیمیل کے اتنے پاس آ گیا کہ اس کی
سانس زیمیل کی سانسوں سے الجھنے لگی۔ سب لوگ
اس کے لڑکھڑانے کے سبب رک گئے تھے۔

زیمیل کو سہارا دے کر کھڑا کرنے تک وہ وارنٹی
سے اسے دیکھے گیا۔ آنکھوں میں شکوے اور دیدار کی
پیماس ہلکورے لے رہی تھی۔ زیمیل کا دل زور سے

”پلیز فارگیوی جولی۔“

زیمیل کی خوش فہمی ایک دم ہوا ہوئی۔ وہ اس کے بجائے کسی جولی نامی عورت سے مخاطب تھا۔
”صارم! تم نے یہ کیا کیا میرے ساتھ، اتنا بڑا ہوکا..... تم.....“

”ناؤ آئی ایکسپلین یو۔ پلیز لسن۔ جولی آئی ریلی لو یو۔“ وہ اب بھی زیمیل کے بجائے جولی سے مخاطب تھا۔ اسی سے معافی مانگ کر اپنی محبت کی تجدید کر رہا تھا۔ زیمیل کے ہاتھ سے سیل گر گیا، وہ سفید پڑ گئی۔ سمرہ نے اس کو سہارا دے کر پانی پلایا۔ وہ گہرے صدمے میں سمرہ کے کندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔
مودی میکراپ اسٹیج سے دور ہٹ گئے تھے۔ سارا ماحول عورتوں کی چہ میگوئیوں سے گونج رہا تھا۔ بارانی واپس جا چکے تھے۔

اتنے میں بابا اور چاچا نکاح خواں کے ساتھ اسٹیج پر آئے۔ زیمیل کے ہاتھ میں پن تھما کر کچھ کاغذ میز پر رکھ دیے تھے۔

بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور جھک کر کچھ کہا۔ زیمیل کے کان میں سائیں سائیں کرنے لگے۔

”بیٹا میری عزت رکھ کر ہاں کر دو ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ بہت ذلیل ہوا ہوں۔“

ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ زیمیل نے تڑپ کر باپ کے جھکے کندھوں کو دیکھا۔ پھر مولوی صاحب کے الفاظ سنے۔

”زیمیل بنت خاور! آپ کو حق مہر ایک لاکھ سکہ رائج الوقت کے ساتھ شاہ زوار بن داور کے ساتھ نکاح منظور ہے۔“

”جی منظور ہے۔“ اس کی لرزتی آواز نے بابا میں نئی روح پھونک دی تھی۔

اس کے ایجاب قبول کے بعد مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ بچا ہوا ماحول ایک دم روشن ہو گیا۔ کیمروہ میں پھر سے متحرک ہو گئے۔ شاہ زوار کو اس کے برابر لا کر بٹھا دیا گیا۔ وہ آنکھیں جھکا کر بیٹھی رہی۔ دل اس سانچے پر ابھی تک لرزا ہوا تھا۔

چاچی ان کی بلائیں لے رہی تھیں۔ عروہ اور شہرام بھانجی کے گلے سے لٹکے جا رہے تھے۔
”عروہ! تم ٹھیک سے بیٹھو۔“ شاہ زوار نے بہن کو اس سے بے تکلف ہونے پر ٹوکا۔ ”تمہیں پتا نہیں یہ ایسی محبتیں نہیں کرتیں۔“

اس بار وہ زیمیل کو دیکھ کر بولا تو زیمیل نے اسے دیکھا۔ کریم کلر کی شلوار فیس اور بلیک واسکٹ میں ملبوس وہ ہلکی بڑھی شیو کے ساتھ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔
کھانا کھل گیا تھا، سب کھانا کھانے لگے۔

سمرہ ویٹر سے مختلف ڈشیں میز پر دکھوانے لگی۔ زیمیل کی بھوک اڑ چکی تھی۔ سمرہ کے اصرار پر تھوڑا سا کھا کر اس نے ہاتھ روک دیا۔ شاہ زوار البتہ رنج کے کھارہا تھا۔

پھر روایتی رخصتی کے پرنکس وہ اماں، بابا کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی آئی تھی۔

☆☆☆

اور اب وہ اپنے گھر کے اسی کمرے میں موجود تھی، جہاں اس نے زندگی کے اکیس سال گزارے تھے۔ قسمت نے اس کے اڑان بھرتے پروں کو بے دردی سے کاٹ کر اسے اسی مقام پر لا پھینکا تھا جہاں سے وہ چلی تھی۔ زیمیل نے دکھتے سر کو بیڈ کے کراؤن پر ٹکایا۔

”اللہ کا شکر ادا کر زیمیل! کہ اس نے اتنے بڑے دھوکے سے ہمیں بروقت آگاہ کر دیا۔ نکاح ہو جانے کے بعد صارم کی اصلیت کھلتی تو سوچو کتنا برا ہوتا۔“

سمرہ کے الفاظ کانوں میں گونجنے تو دو آنسو زیمیل کی آنکھوں سے نکل آئے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ خالی نظروں سے اندر داخل ہوتے شاہ زوار کو دیکھنے لگی۔ جولاک بند کر کے اب ہی ادھر ہی آ رہا تھا۔ زیمیل نے سیدھے ہو کر پلکوں پر جھلملاتے اشک صاف کیے۔

”بہتر ہے تم چیخ کر کے آرام سے سو جاؤ۔ آج کے اس اذیت ناک واقعے نے تمہارے ذہن پر برا اثر ڈالا ہوگا۔“ شاہ زوار اسے بغور دیکھتے کہنے لگا تو زیمیل نے بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ طنز

کر رہا تھا یا ہمدردی، زمیل سمجھ نہ پائی۔ بہر حال وہ شرارہ سنبھالتی بستر سے اُتری کہ اپنا روپ اس کے لیے تو سجایا بھی نہیں تھا، جو اچانک ہی جسم و جان مالک بن بیٹھا تھا۔ وہ الماری سے سادہ سوٹ نکال کر ہاتھ روم میں چلی آئی۔ پھر بے دلی سے ایک ایک زیور اتارتے اور اپنا میک اپ صاف کرتے اس کا دل کتنی ہی بار گر لایا۔ صابن کے لیے کتنی بد دعائیں اس کے لبوں پر آ کر دم توڑتی رہیں۔

رودھو کر کافی دیر بعد جب کمرے میں آئی تو ٹائٹ بلب روشن تھا اور شاہ زوار بیڈ کے ایک طرف چت لیٹا اپنا بازو آنکھوں پر رکھے سو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیڈ کے دوسری طرف آ کر لیٹ گئی۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگی پتا ہی نہ چلا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو سر بھاری سا محسوس ہوا۔ کل والا واقعہ ذہن میں پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔ اس نے بستر پر نظر دوڑائی۔ وہاں شاہ زوار موجود نہیں تھا۔ وہ سستی سے اُٹھی اور ہاتھ روم کی طرف بڑھی۔ شاہ زوار اسی وقت ہاتھ روم سے نہا کر نکل رہا تھا۔ وہ دروازے پر اس سے بری طرح ٹکرا گئی۔ اس کا سر شاہ زوار کی ٹھوڑی سے جالگا۔ شاہ زوار کا کندھوں پر پھیلایا، تولیہ گر گیا وہ تشویش سے پیشانی مسلتی زمیل کو دیکھنے لگا۔

”بہت لگی ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ ہٹا کر جائزہ لینے لگا۔

”درد نظر آتا ہے کیا؟“ زمیل نے غصے سے اسے دیکھا جو نامناسب حلیے میں اس کے نزدیک کھڑا تھا۔

قمیص سے آزاد کمرتی وجود شلوار میں ملبوس تھا۔ اس کے جسم سے مردانہ سیمپو اور شیونگ کریم کی ملی جلی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ زمیل اس کو ایک طرف ہٹائی ہاتھ روم میں گھس گئی۔

وہ فریش ہو کر باہر آئی تو سب ناشتے سے فراغت حاصل کر چکے تھے اور اب باتوں میں مصروف تھے بالکل ویسا ماحول نظر آ رہا تھا جو پہلے ان سب کی آمد پر ہوا کرتا تھا۔

”ارے ہماری دھی آئی ہے، آؤ یہاں آ کر

بیٹھو۔“ چاچا نے اس کو پاس بلایا تو وہ ان کے برابر بیٹھ گئی۔

”کیوں خاور! اب ہو گئی نا تمہاری دونوں بیٹیاں ہماری۔“ چاچا کی بات پر بابا ہنس پڑے۔

”بالکل ادا یہ میری لاڈلی دھی بھی تمہاری ہوئی۔“ زمیل نے غور کیا، آج وہ مہینوں بعد خوش نظر آئے تھے۔

سمرہ بہن کے لیے ناشتے آئی۔ وہ رغبت سے کھانے لگی۔ رات بھی غم کے مارے کھایا نہ گیا تھا۔

”اتنی جلدی واپس کیوں جا رہے ہیں ادا! کچھ دن تو ٹھہرتے۔“ اماں نے شکوہ کیا۔

”ادی! وہاں برادری کو دلیہ بھی کھلانا ہے۔ پورا گوشت تو نہیں آیا نا شادی میں۔“ داور چاچا نے قہقہہ لگایا۔

”سامان باندھ دیا نیک بخت۔“ پھر چاچی سے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو کیا اب مجھے بھی گاؤں جانا ہوگا۔“ زمیل کو یہ سوچ کر جھرجھری آ گئی۔

”چلو بابا! گاڑی تیار ہے۔“ اتنے میں شاہ زوار سرمئی شلوار قمیص میں نکھر اُتھر اندر آیا۔

”چلو بھئی، اب اللہ والی۔“ چاچی بھاری جسم سنبھالتے صوفے سے اٹھیں۔ زمیل بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ چاچی نے اس کو خوب پہنچ کر پیار کیا۔ چاچا نے سر پر ہاتھ رکھا۔ سمرہ بھی چادر لپیٹتے قریب چلی آئی۔

”اللہ حافظ۔ زمیل! اپنا خیال رکھنا۔“ اس نے کہا تو زمیل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

تو کیا یہ مجھے لیے بغیر جا رہے ہیں۔ اس کو عجیب سا احساس ہوا۔

اس نے الجھن بھری نظروں سے شاہ زوار کو دیکھا جو اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے دیکھنے پر قریب چلا آیا اور اپنا بھاری ہاتھ اس کی طرف مصافحے کے لیے بڑھایا۔ زمیل کی حیرت دو چند ہو گئی، اس نے اپنا نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔

”او کے زمیل! خدا حافظ۔“ اس نے ہاتھ دبا

خوش تھی پھر بھی ایک تہی دامن کا احساس دل میں

جاگا۔ اس بار وہ بابا، اماں سے بھی خفا ہو گئی جو ایک بیٹی کی خوشی میں دوسری بیٹی کا غم بھولے ہوئے تھے۔

تین مہینے اور دے پاؤں گزر گئے۔ سمرہ کو ڈاکٹر نے آرام کرنے کا کہا تھا۔ سو وہ بھی شہر کا چکر نہ لگا سکی۔ بس فون پر بات ہو جاتی۔ اماں اس کے لیے فکر مند تھیں

اس دن اماں بہت بے چین ہوئیں اور ایک دم ہی سمرہ سے گاؤں جا کر ملنے کا ارادہ کر لیا۔ بابا بھی جیسے تیار بیٹھے تھے، فوراً گاڑی نکال لی۔

”چل زیمیل! بہن سے مل کر آئیں۔ دو دن میں واپس آ جائیں گے۔“ وہ اس کو یقین دلا رہی تھیں شاید اس کے انکار کا خدشہ تھا۔

”اماں! میرا بھی سمرہ سے ملنے کا دل چاہ رہا ہے۔“ زیمیل نے کہا تو اماں خوش ہو گئیں۔

پھر بابا، اماں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی وہ گاؤں جاتے رستوں کو دیکھ کر ماضی کے دنوں کو یاد کرنے لگی۔

بچپن میں وہ کتنا ایکساٹڈ ہوتی تھی گاؤں جانے کے لیے۔ پھر باشعور ہوتے ہی اسے اپنی اور شاہ زوار کی نسبت کا پتا چلا تو وہ چڑنے لگی گاؤں اور شاہ زوار دونوں سے۔ اس کو اس رشتے میں نا انصافی نظر آنے لگی۔

کارا ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ زیمیل کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ کار سے نکل کر دیکھنے لگی۔ پرانے مکان نے جدید بنگلے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دروازہ شاہ نواز نے کھولا۔

”بھلی کرے آیا۔“ وہ تپاک سے ملا تھا۔ ”کیسی ہو بھاجانی۔“ پھر زیمیل کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”آؤ اندر آؤ..... ادا! یہ باؤلا تو تم لوگوں کو وہیں کھڑا رکھے گا۔“ چاچا اندر سے نکل کر آئے اور بھائی سے بغل گیر ہوئے۔

”دیکھیں چاچا! آپ کے داماد کو باؤلا کہہ رہا

کر چھوڑ دیا تھا۔ پھر اماں بابا گیت تک سب کو چھوڑنے گئے جبکہ زیمیل لاؤنج میں ہی کھڑی رہ گئی۔

زندگی میں اتنے ہنگاموں کے بعد اچانک بہت سکوت در آیا تھا۔ ایک تکلیف دہ خاموشی تھی جس نے زیمیل کو اندر باہر سے اپنی لپیٹ میں رکھا تھا۔ گھر بھی وہی تھا، لوگ بھی وہی..... لیکن زیمیل کے لیے بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ پہلی سی زیمیل نہ رہی تھی۔ بابا، اماں اس کی آواز سننے کو بھی ترسنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ بہت کچھ برا ہوا تھا یا بہت کچھ برا ہونے سے رہ گیا تھا۔ وہ سمجھ نہ پاتی۔

والدین کے دل دکھانے کا غم۔ اپنی من مانی کرنے کا پچھتاوا۔ صارم کی بے وفائی کا دکھ اور شاہ زوار کی لا پرواہی پر غصہ۔

پورے تین مہینے ہو چلے تھے اور اس بے حس شخص نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تھا کہ زیمیل کس حال میں ہے۔

ہونہہ! انوار کہیں کا..... بیوی کے حقوق سے نا آشنا۔ اب بھی بابا ہی میری ذمہ داری اٹھا رہے ہیں۔ یہ نکاح کر کے فارغ ہو گیا۔ اس سے رہ رہ کر شاہ زوار پر بے انتہا تاؤ چڑھتا حالانکہ وہ اس کے ساتھ رہتا نہیں چاہتی تھی پھر بھی ایک عجیب کیفیت اس پر طاری تھی۔ سارا دن شاہ زوار کے تصور سے لڑتی رہتی۔

سمرہ اور شاہ نواز دوبار ان لوگوں سے مل کر گئے تھے۔ وہ ہمیشہ خوش آتے اور چلے جاتے۔ نہ کسی تیسرے کی خبر نہ پروا۔ زیمیل کو ان سے بھی شکوہ تھا۔

☆☆☆

ان ہی بے کیف دنوں میں خبر ملی کہ سمرہ ماں بننے والی ہے۔ اماں اور بابا تو فون پر یہ سنتے ہی خوش ہو گئے۔ سب سے باری باری بات کر کے مبارک باد دی اور وصول کی۔

زیمیل دور بیٹھی ان کی خوشی دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے حالانکہ وہ بہن کی خوشی میں

ہے۔“ شاہنواز نے دہائی دی۔

”ہاں تو کہوں گا۔ خاور تمہارے دونوں داماد باؤ لے ہیں۔ یہ تھوڑا کم باؤ لا اور شاہ زوار تو پورا باؤ لا ہے۔ کتنے مہینوں سے کہہ رہا ہوں، میری نوں کو گھر لے آ، سنتا ہی نہیں۔“ چاچا نے شکوہ کیا تو زیمل کا دل دھڑک اٹھا۔

پھر چاچی سے مل کر سرہ کے کمرے میں آئے تو وہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ ان کو سامنے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔

”میں اپنی نوں کو پیر نہیں اتارنے دیتی زمین پر۔“ چاچی نے پیار سے سرہ کو دیکھا۔ اماں بیٹی کو کٹھنی دیکھ کر شاد ہو گئیں۔ وہ سرہ کے کمرے میں ہی بیٹھ گئے۔

پھر زیمل اٹھ کر باہر آ گئی، سارا گھر بہت بدل چکا تھا۔ وہ گھوم پھر کر دیکھتی کچن میں آ گئی، یہاں بھی امریکن اسٹائل کچن اس کو خوش گوار تاثر میں ڈال دیا۔ چاچی دو لڑکیوں کے ساتھ مل کر کھانا تیار کروا رہی تھیں۔

”ارے بچی! تم اندر بیٹھو۔ گرمی میں کیوں آ گئیں۔“ چاچی نے کہا تو زیمل مسکرا دی۔

”نہیں چاچی! مجھے گرمی نہیں لگ رہی۔“ وہ کھانے کی میز کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں شاہ زوار فیض کی آستینیں فولد کرتا کچن میں داخل ہوا اور فریج کھول کر پانی کی بوتل نکال پینے لگا۔

”آج تو بڑی خوشبوئیں آ رہی ہیں اماں! کس خوشی میں اتنے دیکھے چڑھائے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”تیری سسرال آئی ہے بے خبرے۔ دیکھ تیری دلہن بیٹھی ہے سامنے۔“ چاچی نے سر پر ہاتھ مار کر بیٹے کی بے خبری کو کوسا۔

شاہ زوار کے ہاتھ سے بوتل چھوٹنے لگی، اس نے خوش گوار حیرت سے زیمل کو دیکھا۔

”ارے آج تو ہمارے غریب خانے کی قسمت

جاک اٹھی۔ بڑے لوگوں کے قدم پڑے ہیں۔“ وہ مسکرا کر کہتا قریب چلا آیا۔ ”اماں یہ چند روزہ مہمان ہیں، ان کی خدمت میں کمی نہ کرنا ورنہ ناراض ہونے میں دیر نہیں کریں گے۔“

وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل آ بیٹھا۔ نجانے یہ مذاق تھا یا طنز، زیمل الجھن میں پڑ گئی۔

”اب اپنی نوں کو میں نے جانے نہیں دینا۔ سمجھے۔“ چاچی نے ناراضی سے بیٹے کو دیکھ کر اعلان کیا۔

”نوں رہنا چاہے تب نا۔“ وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا۔

”اماں چری ہے، اس کی باتوں پر دھیان مت دینا۔ ہم دیہاتی بہت جذباتی اور پاگل ہوتے ہیں۔ اسی لیے اگلے کارویہ نہیں دیکھتے بس محبت کیے جاتے ہیں۔“ پھر وہ تھوڑا جھک کر سرگوشی میں بولا۔

”چل، اب میں کھانا لگوانی ہوں، میری نوں کو کھانے دے۔ اس کا سر مت کھا۔“ چاچی بیٹے پر بگڑیں۔

”ہاں ہاں کھلاؤ، میں نے کب روکا ہے۔“ وہ ناراض ہوتا اٹھ کھڑا ہوا۔

رات کے کھانے پر چاچی نے بہت اہتمام کیا تھا۔ میز روایتی پکوانوں سے بھر گئی تھی۔ وہ ایک ایک ڈش ان کے آگے رکھ کر کھانے پر اصرار کر رہی تھیں۔ شاہنواز اور سرہ نے کھانا کمرے میں منگوا لیا تھا۔

”میرا بیٹا، میری نوں کا دیوانہ ہے۔“ چاچی نے فخریہ بتایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر بابا، اماں پر سفر کی تھکن سوار ہو گئی تو چاچا نے ان کے لیے کمرہ کھلوادیا۔

چاچی زیمل کا ہاتھ پکڑ کر اس کو شاہ زوار کے کمرے میں لے آئیں۔ وہ واش روم سے ہاتھ پونچھتا باہر نکلا۔

”لے اب سنبھال اپنی دلہن۔ اللہ جوڑی سلامت رکھے۔“ چاچی نے زیمل کو اس کے مقابل لا کھڑا کیا تو زیمل جھینپ سی گئی۔

چاپی دروازہ بند کر لے مرے سے باہر چلی گئیں۔ زیمیل نے نظر اٹھا کر دیکھا، شاہ زوار اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ زیمیل۔“ وہ نرمی سے بولا تھا۔

زیمیل کھڑی رہی۔

”اگر تم میری وجہ سے بے آرامی محسوس کر رہی ہو تو میں کسی اور کمرے میں چلا جاتا ہوں۔“ اس کے کہنے پر زیمیل نے لب بھینچ لیے۔

”بہت خیال ہے تمہیں میرا؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھتی آگے بڑھی۔

”تمہارا ہی تو خیال ہے۔“ وہ محویت سے اسے دیکھ کر بولا۔

”اتنا خیال ہے میرا کہ چھ مہینے سے پلٹ کر ایک بار بھی مجھے نہیں دیکھا۔ نہ میری خیر خبر لی۔ نہ یہ سوچنے کی زحمت کی کہ میں زندہ ہوں کہ مر گئی۔“ وہ جارحانہ انداز میں اس کے قریب آئی اور اپنی مٹھیوں میں اس کی قمیص کا کالر جکڑ لیا۔

”نکاح کیا ہے نا مجھ سے۔ شریک حیات بنے ہو میرے۔ ابھی تک بابا میرا بوجھ اٹھا رہے ہیں اور تم بے حس انسان، منہ چھپا کر بھاگ آئے وہاں سے۔“ وہ اس کو جھنجھوڑتے غصے میں کہہ رہی تھی۔ شاہ زوار اچنبھے سے اسے دیکھنے لگا۔

”رہے نا آخر ایک بزدل دیہاتی۔ اظہار کے معاملے میں چور، فرائض کے معاملے میں چشم پوش۔“ زیمیل نے ناک چڑھا کر طنزیہ کہا تو شاہ زوار تڑپ اٹھا۔

”کیا کہا پھر سے کہنا۔“

اس نے اپنے کالر کو ایک جھٹکے سے چھڑایا اور زیمیل کے دونوں ہاتھوں کو موڑ کر اس کی کمر کے پیچھے کیا۔

”بزدل دیہاتی آ.....“ زیمیل تکلیف سے چیخ اٹھی۔

”چھوڑو مجھے جنگلی انسان.....“ وہ شاہ زوار کی بانہوں کے گھیرے میں چل اٹھی۔ اتنی قربت حواس

سل کرنے لگی تھی۔

”میں نہ اظہار کے معاملے میں چور ہوں، نہ فرائض کے معاملے میں چشم پوش۔“ شاہ زوار نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

زیمیل ایک دم سرخ پڑ گئی۔ تڑپ کر اپنا آپ چھڑایا اور دور جا کھڑی ہوئی۔

”میں نے کہا تھا نا میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔“ شاہ زوار نے دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر کندھے اچکائے۔ ”چلو آؤ ادھر بیٹھو..... اور میری چند باتیں سن لو۔“ اس نے آگے بڑھ کر زیمیل کا بازو تھاما تو زیمیل کو کرنٹ لگا۔

”کچھ نہیں کر رہا۔ اتنا مت گھبراؤ۔ اپنا اختیار استعمال کرنا ہوتا تو پہلی رات ہی کر لیتا۔“ وہ اس کو بیڈ پر بٹھا کر خود پاس بیٹھ گیا پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنی ہاتھوں میں لیے۔

”تمہیں پتا ہے، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔ تو زیمیل کا سر نفی میں ہلا۔

”شعور کی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے بھی تم میرے دل میں بسی ہوئی تھیں۔ بچپن سے یہی سنتا آیا کہ زیمیل، شاہ زوار کی ہے۔ تم جانتی ہو ایسی باتیں اگر کم سنی سے سنی جائیں تو ہمیشہ کے لیے دل میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ تمہاری محبت کی جڑیں میرے اندر پھیلی گئیں اور پھر میرے وجود میں تمہاری چاہت کا شجر تناور ہو گیا۔ اس کے برعکس تمہیں کافی دیر بعد یہ بات پتا چلی تم اس منگنی کو قبول کرنے میں متامل ہوئیں اور مجھ سے چڑنے لگیں۔ تمہاری یہ بے اعتنائی میرے دل پر کیسے گھاؤ لگاتی، تم کبھی جان نہ سکو گی۔ تمہارے رویے کی وجہ سے میں کبھی تم سے اظہار محبت نہ کر سکا۔“ وہ افسردگی سے زیمیل کے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔

”پھر بھی ایک امید تھی کہ تم میری ہی ہو، لاکھ تغافل کرو، ہونا تو تمہیں میرا ہی ہے۔ لیکن وہ امید بھی اس دن ٹوٹ گئی، جب تم نے اپنی پسند سے شادی

دوسری جگہ شادی کرنی چاہی۔ تمہیں معلوم نہیں زیمیل! اس دن میرے دل پر کیا ہمتی۔“ شاہ زوار نے نظریں اٹھائیں تو وہ لہو رنگ تھیں۔

”میں محبت میں زبردستی کا قائل نہیں۔ مشکل سے ہی سہی میں نے دل کو سمجھالیا کہ تمہیں اپنی پسند کو اپنانے کا پورا حق ہے۔ میں نے اپنی انا کا گلا گھونٹ دیا۔ بابا کو سمجھایا کہ یہ تمہارا حق ہے اور یہ کہ بھاجائی کو پیادہ کر لے آئیں۔ میری خیر ہے۔ میری نیت صاف تھی، میرا پیار خود غرض نہیں تھا۔ میں تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو تھا۔ شاید اسی لیے قدرت مجھ پر مہربان ہو گئی اور وہ واقعہ ہو گیا۔ جس نے میرا اپنے رب پر یقین بڑھا دیا کہ وہ سچے جذبوں کو کبھی رانگاں نہیں ہونے دیتا۔“

شاہ زوار کی بات پر زیمیل نے اس کے بے ریا چہرے کو دیکھا۔

”پھر تم میری ہو گئیں حادثاتی طور پر ہی سہی۔ لیکن مجھے صرف تمہارا وجود نہیں چاہیے تھا، میں تمہاری دلی آمادگی کا متنی تھا۔ اسی لیے میں نے تمہیں چھوا تک نہیں۔ اس رات اگر میں تم پر دسترس حاصل کر لیتا، تو اس وقت تو تم مجھے حاصل ہو جاتیں لیکن یہ تعلق زبردستی کا رہتا۔ کیونکہ تمہاری مجھ سے ناپسندیدگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ میں جانتا تھا تم نے چاچا کی عزت رکھنے کو یہ نکاح کیا ہے۔“

شاہ زوار کی بات پر زیمیل نے لب کاٹے۔

”اسی لیے میں تم سے دور چلا آیا کہ تم اچھی طرح سوچو، مجھ اور پھر فیصلہ کرو۔ اس دوران میں تم سے بے پروا نہیں تھا۔ چاچا کے اکاؤنٹ میں تمہارے خرچے کے لیے روپے بھی ڈالتا رہا اور تمہاری خبر بھی رکھی۔ میرے ہی کہنے پر سب نے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ تم سے شادی کی ہے زیمیل! تم سے کیسے بھاگ سکتا ہوں۔ اپنی زندگی سے کون دور ہونا چاہتا ہے۔“ شاہ زوار نے اس کے ہاتھ لیبوں سے لگائے۔

”فیصلہ اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے، مجھے

تمہاری خوشی عزیز ہے۔“

وہ منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

اور وہ حیرت سے اس دنیا سے نرالے عاشق کو دیکھ رہی تھی جو جائز حق رکھنے کے باوجود اس کو، اس کی رضا سے مانگ رہا تھا۔ وہ شاہ زوار اور صارم کا موازنہ کرنے لگی، دونوں میں کتنا فرق تھا۔ وہ فریب کار اس کو تب تک دل بستگی کا سامان بنانا چاہتا تھا جب تک اس کی اصلیت کھل نہ جانی اور یہ اختیار ہوتے بھی اس کے فیصلے کا منتظر تھا۔

”ایسا ہے شاہ زوار کہ تم بالکل پینڈو ہو۔۔۔۔۔“

زیمیل نے یہ کہہ کر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑائے تو شاہ زوار ایک دم بجھ سا گیا۔

”اتنی خالص محبت اتنے عرصے تک اپنے اندر چھپائے رکھی۔ اظہار کیوں نہیں کیا۔“ وہ مصنوعی ناراضی سے کہنے لگی تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

”تمہیں پتا ہے شاہ زوار! میرے جیسی لڑکیاں جو ظاہری چمک دمک کے پیچھے ہوتی ہیں نا ان کے ہاتھ صرف سراب ہی آتے ہیں۔ لیکن مجھے میرے اللہ نے تہی دامنی سے بچالیا۔ اس نے تمہاری صورت مجھے سچی محبت عطا کر دی۔“ زیمیل کی آواز کپکپا کر نکلی تھی۔

”میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے۔“ وہ بے اختیار زوار کے کندھے سے آگلی تو وہ مطمئن ہو کر مسکرا دیا۔

”اور میں بھی اپنے رب کا احسان مند ہوں، جس نے تم جیسی تک چڑھی کے دل میں میرے لیے نرمی پیدا کر دی۔“ وہ اس کو اپنی بانہوں میں بھر کر بولا تو زیمیل بھی مسکرا دی۔

اور لمحہ بہ لمحہ بھیکتی رات ان دونوں کے سچے جذبوں کی امین بن گئی تھی۔





مستقل ہونہ ہو، ادھار طے
دل کی حسرت کو کچھ قرار طے

دو گھڑی ہی سہی پلے آؤ
غم کو پھر سے فدا نکھار طے

ہم کہ سمجھے تھے خود کو ہی یکتا
راہ میں ہم سے بے شمار طے

روز مرتا ہوں کیا تماشا ہے
زندگی بھی تو ایک بار طے

بس میں دنیا نہیں، چلو نہ سہی
خود پہ ہم کو تو اختیار طے

اس کی تنہائیوں کا مت پوچھو
جس کو نفرت ملی نہ پیار طے

وہ جو مجھوں پہ مٹا ہنساکرتا
آج ابرکت وہ زار زار طے
اتباف ابرکت

دشت میں قیس نہیں، کوہ پہ فر باد نہیں
سہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں

ڈھونڈنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلبے جسے اپنا بھی پتا یاد نہیں

روح بلیل نے خزاں بن کے اجاڑا گلشن
بھول کہتے رہے ہم بھول ہیں صیاد نہیں

حسن سے چوک ہوئی اس کی ہے تاریخ گواہ
عشق سے بھول ہوئی یہ مجھے یاد نہیں

لاڈاک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

سافر نظامی



وہ ہمیں ادب و تہذیب سکھاتے ہیں
معاشرے میں اچھا انسان کہلانے لائق بناتے ہیں
وہ پختہ تراش کر ہیرا بناتے ہیں
اصل میں وہ بیٹے کا طریقہ سکھاتے ہیں
بہت عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں شرف استاد ملتا ہے
باعزت باوقار رتبہ ان کو ملتا ہے

وہ جو انہوں نے سیکھا ہمارے لیے وقف کر دیتے ہیں
وہ استاد ہی تو ہوتے ہیں جو بہت شفیق ہوتے ہیں
یہ تو وہ لوگ ہیں جو بنا کسی لالچ کے ہم پر ہر ملن ہو رہے ہیں
یہ تو ہم سے خفا بھی ہمارے ہی لیے ہوتے ہیں
بہت عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں شرف استاد ملتا ہے
باعزت باوقار رتبہ ان کو ملتا ہے

یہ جو اپنے آپ کو ہمارے لیے بدل لیتے ہیں
ہمیں ماہ دکھانے کے لیے خود اس پر چل پڑتے ہیں
برائی سے روکتے ہیں اور اچائی کی طرف راغب کرتے ہیں
یہ وہ لوگ ہیں جو پڑھائی کی اُلفت بیدار کرتے ہیں
بہت عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں شرف استاد ملتا ہے
باعزت باوقار رتبہ ان کو ملتا ہے
اُمّ ربیعہ

کئی خواب مجھے بچھڑے سرشام پھر سے میرے
کئی نقش پا ہوئے ہیں کہ دوام پھر سے میرے

یہ جو کرچیاں ہیں پھیلی، یہ ثبوت دے رہی ہیں
کہ ہیں پتھر قل کی زمیں، دوام پھر سے میرے

تجھے اذن دے دیا تھا کہ بگاڑ دے تو بستی
تو سنوار کیوں رہا ہے بھی کام پھر سے میرے

یہ معاملہ جو سلجھے تو یہ کس طرح ہو ممکن
کہ پیام جا رہے ہیں ترے نام پھر سے میرے

شب و روز تیرے مانا ہیں تم جہاں کے لیکن
ہو کوئی تو شام ایسی، جو ہونا م پھر سے میرے

انعم سجیل



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنی ایک رشتہ دار انصار لڑکی کی شادی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا۔
”تم لوگوں نے لڑکی کو رخصت کر دیا؟“
انہوں نے کہا: ”جی ہاں“
فرمایا: ”کیا تم نے اس کے ساتھ کسی کو بھیجا ہے جو گیت گائے؟“

ام المومنین رضی اللہ عنہا نے کہا: ”جی نہیں“
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انصار لوگ گیت وغیرہ پسند کرتے ہیں۔ (بہتر ہوتا) اگر تم اس کے ساتھ (کسی کو) بھیجتے جو کہتا۔
ترجمہ: ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔ ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔ ہمیں بھی مبارک، تمہیں بھی مبارک“
(صحیح بخاری)

عجیب اتفاق،

چاروں خلفائے راشدین کے نام حرف عین سے شروع ہوتے ہیں۔ یعنی عتیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بنو امیہ میں سے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام بھی اسی حرف سے شروع ہوتا ہے۔

خلیفہ اقل اپنی کنیت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عوام افتاد تاریخ میں زیادہ مشہور ہوئے۔ بہت کم لوگوں نے انہیں عتیق کے نام سے پکارا۔ انہیں چھوڑ کر باقی چاروں عظیم ہستیوں شہادت

کے بلند مرتبے پر فائز ہوئیں۔
حضرت عمر کو غیر مسلم ابو لوی فیروز کے ہاتھوں جام شہادت پینا نصیب ہوا۔
حضرت عثمان اور حضرت علی مسلمانوں کی تلوار کا نشانہ بنے۔
حضرت عمر بن عبدالعزیز کو بنو امیہ کی سازش سے ان کے اپنے غلام نے ذہر مار دیا۔

نری اور شفقت سے،

ایک شخص سے کہا گیا۔
”تیرا بھائی اللہ کی نافرمانی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اور تو نے اس سے قطع تعلق نہیں کیا؟“
اس نے جواب دیا۔

”میرے اس دوست کو آج میری دوستی اور بھائی چاہیے کی بہت ضرورت ہے کیونکہ وہ غلط کام میں پھنس گیا ہے، میں اس حالت میں اس کے ساتھ کس طرح علیحدگی اختیار کر سکتا ہوں۔ میں نری اور شفقت کے ساتھ اسے دوزخ کے راستے سے ہٹاؤں گا اور اس کی دستگیری کروں گا۔“

لفظ لفظ موتی،

۱۔ زبان بند رکھنا سب سے اچھی عبادت ہے۔
۲۔ گناہ اندھیرا ہے اور توبہ چراغ۔
۳۔ سخی کا کھانا دلو کہ ہے اور کجوس کا کھانا مرض

ہے۔
۴۔ سوچیں گہری ہو جائیں تو فیصلے کمزور پڑ جاتے ہیں۔
۵۔ اگر انسان کی یقین کرنے کی نیت نہ ہو تو وہ

قریبی میسر پر بیٹھی دو عمر رسیدہ جرمن خواتین نے ان نوجوانوں کو آواز دی اور ان کو صوفیہ سے زیادہ کھانا طلب کرنے اصرار کیا۔ کھانے کے ضائع ہونے پر۔ تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان لوگوں نے کہا۔

”ہم نے تمام کھانے کھائے ہیں ادا کر دیے ہیں اور ہماری مرضی ہم جتنا بھی کھانا کھا لیں۔“ یہ بات سن کر خواتین نے کسی کو میلی فون کیا۔ تقریبی دیر میں ہی ایک باوردی شخص آگیا جو کہ سوئٹل سیکورٹی محکمے کا ایک اہلکار تھا۔ اس نے تمام صورت حال سن کر پچاس مارک کا جرمانہ عائد کیا اور موقع پر ہی وصول کیا اور ساتھ ہی نصیحت کی۔ ”آئندہ جب بھی جرمنی میں کھانا طلب کرو، اتنا ہی منگواؤ جتنا کھا سکتے ہو۔ تمہارے پاس بے شک پیسوں کی بھرمار ہے مگر وسائل معاشرے کی امانت ہیں۔ ان کا بے مددی سے استعمال جرم ہے۔“

دوسرا دروازہ

ایک آدمی کسی شادی پر موجود تھا۔ جب وہ ہوٹل پہنچا تو اس نے دیکھا دروازے ہیں۔ لکھا تھا۔

- 1۔ دلہن کے رشتہ دار 2۔ دلہا کے رشتہ دار۔ اسے ہنسی آئی اور دلہا کے رشتے دار والے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ آگے پھر دو دروازے نظر آئے۔
- 1۔ خواتین کے لیے 2۔ مردوں کے لیے۔ وہ مزید ہنسنے لگا کہ یہ کیا تماشا ہے اور دوسرے دروازے سے اندر چلا گیا۔ آگے پھر دو دروازے تھے۔

- 1۔ وہ لوگ جو تھکے کر آئے ہیں۔
- 2۔ وہ جو بغیر تحفے کے آئے ہیں۔ اب تو ہنس ہنس کے اس شخص کا حال بُرا ہو گیا۔ بغیر تحفے کے تھا اس لیے دوسرے دروازے سے اندر چلا گیا۔ اچانک ہنسی رُک گئی کیونکہ اب وہ

بڑے سے بڑے ثبوت کو جھٹکا دیتا ہے اور اگر یقین کرنا چاہے تو فقط دل کی گواہی کافی ہوتی ہے۔

انسان خود غرض ہو جائے تو اچھے برے کی تمیز بھلا بھٹکا ہے۔

اگر تم انسان ہو تو دلیں کو فتح کرنا سیکھو۔ جو تمہیں بتا دے، اس سے جھوٹ بولنا سخت ترین خیانت ہے۔

طوبی ممتلا۔ کورنگی کراچی

محنت

آدمی کی دس انگلیاں اس کی بہترین دوست ہیں۔ اگر ہم محنت میں تو کبھی فاقہ کشی میں مبتلا نہ ہوں گے کیونکہ محنتی شخص کے گھر میں یہ صرف باہر سے جاکتی ہے، اندر داخل نہیں ہو سکتی۔

نوجوانوں کو نصیحت کے لیے میرے پاس تین انگلی ہیں۔ کام، کام اور کام۔

نمرہ عاقب۔ گرین سٹی

زبان کی حفاظت

ایک مرتبہ تیس بن سادہ اور اکثم بن صیفی کی ملاقات ہوئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

”آپ نے آدمی میں کتنے محبوب پائے؟“

جواب ملا۔ اتنے جن کی گتھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں ایک ایسی خصلت بھی جانتا ہوں کہ اگر وہ آدمی میں ہو تو اس کے سارے عیب دھکے ہیں گے۔“

پوچھا گیا۔ ”وہ کیا؟“

کہا۔ ”زبان کی حفاظت۔“

جرم

جرمنی کے ایک ریستورنٹ میں کچھ نوجوان کھانا کھانے کی غرض سے داخل ہوئے۔ جھوک کی شدت کی وجہ سے نوجوانوں نے کھانے کا آرڈر فراغ دلی سے دیا۔ کھانا لگیا اور تناؤ بھی کر لیا گیا۔

بل کی ادائیگی کے بعد جب یہ لوگ جانے لگے تو

بھروہاں کھڑا تھا، جہاں سے ہوٹل میں داخل ہوا تھا۔

فیس معافی کی درخواست

بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب! اسکول گورنمنٹ ہائی اسکول

جناب عالی!

بات یہ ہے کہ میرے ابو نے مجھے فیس کے لیے پانچ سو روپے دیے تھے۔ سو روپے کی دوستوں کے ساتھ فلم دیکھ لی۔ ایک سو پچاس کے بونٹل اور سو کے کھلے۔ پچاس روپے کا آب کی بیٹی کو لڑی نوڈ کر دیا۔ دو سو روپے انگلش والی میں پر شرط لگ گیا میں سمجھتا تھا کہ ان کا صرف ریاضی ملے سر کے ساتھ چکر ہے، پر ان کا تو آب کے ساتھ بھی چکر ہے۔

اب آب کے پاس دو سو پستے ہیں۔ یا تو میری فیس معاف یا آب کا راز فاش۔

آپ کا فرماں بردار
پتو

ذمہ دار

ایک عورت ماہر نقیسات کے پاس گئی اور کہا میں شادی نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میں بڑھی لکھی ہوں۔ خود کماتی ہوں اور خود مختار ہوں اس لیے مجھے خلوند کی ضرورت نہیں ہے مگر میں بہت پریشان ہوں کیونکہ میرے والدین شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟

ماہر نقیسات نے کہا: بے شک تم نے بہت کامیابیاں حاصل کر لیں لیکن بعض دفعہ تم کوئی کام کرنا چاہو مگر نہ کر سکو، کبھی تم سے کچھ غلط ہوگا، کبھی تم ناکام ہو جاؤ گی، کبھی تمہارے پلان ادھوڑے رہ جائیں گے۔ کبھی تمہاری خواہشیں پوری نہیں ہوں گی۔ تب تم کس کو قصود ملے پھر اڑکی؟ کیا اپنے آپ کو قصور ظن قرار دے گی؟

لڑکی: "نہیں بالکل نہیں، اپنے آپ کو کیوں دوں گی؟"

ماہر نقیسات: "بالکل بھی وجہ ہے کہ تمہیں ایک خاوند کی ضرورت ہوگی جسے اپنی غلطیوں کا ذمہ دار ٹھہرا سکو"

ہمارے لوگ

میں پہلی بار نائن اسٹاپ ٹرین میں سوار ہوا اور پہلے سے موجود مسافروں سے پوچھا۔

"اوکاڑہ کب آئے گا؟ مجھے وہاں اترنا ہے؟" مسافروں نے بتایا: "بھائی! یہ نائن اسٹاپ گاڑی ہے۔ اوکاڑہ میں نہیں رکتی۔ اوکاڑہ سے گزرے گی مگر رے کے گی نہیں؟" یہ سن کر میں گھبرا گیا۔

مسافروں نے کہا: "گھبراؤ نہیں۔ اوکاڑہ میں روزیہ ٹرین سلو ہو جاتی ہے۔ تم ایک کام کرنا، جسے ہی ٹرین سلو ہو تو تم جلدی سے ٹرین سے اترنا اور آگے کی طرف بتاؤ کہ دوڑتے ہوئے کچھ ٹھہر جانا جس طرف ٹرین جا رہی ہے اس طرف ہی دوڑنا تو تم گروہ کے نہیں؟"

اوکاڑہ آنے سے پہلے ہی مسافروں نے مجھے گیٹ پر کھڑا کر دیا۔

اب اوکاڑہ آتے ہی میں ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پلیٹ فارم پر کودا اور کچھ زیادہ ہی تیزی سے دوڑ لگا دی۔ اتنا تیز دوڑا کہ اگلے ڈبے تک جا پہنچا۔ اس دوسرے ڈبے کے مسافروں میں کسی نے میرا ہاتھ پکڑا تو کسی نے شرٹ پکڑی اور مجھے کھینچ کر ٹرین میں چڑھا لیا۔

اب ٹرین رفتار پکڑ چکی تھی اور سب مسافر کہہ رہے تھے۔

"تیرا نصیب اچھا ہے، تجھے یہ گاڑی مل گئی۔ مدد نہ یہ نائن اسٹاپ ٹرین ہے اور اوکاڑہ میں نہیں رکتی؟"

فاکھ ہیل۔ کراچی





طوبی، ردا ————— کراچی
 اپنے ہاتھوں کی لکروں پہ بگر جلتے ہیں
 ہم تو یاگل ہیں ہوائوں سے بھی جلتے ہیں
 ہم بضد ہو کہ جلو ساتھ ہمارے لیکن
 ہم مسافر ہیں بہت جلد پھر جلتے ہیں

ارد کمال ————— فیصل آباد
 موسم کو بدلنا ہے بدل ملے گا آخر
 سوچ رہے کوئی شخص تو دھل جائے گا آخر
 آنکھیں ہیں تو ہو جائیں گی بے آب کسی روز
 دل ہے تو کسی روز سنبھل جائے گا آخر

نادیہ یاسر ————— گوجران
 عمر گزری ہے مناب جاں بہتے
 دھوپ میں زیر آسمان بہتے
 ہم ہیں انسان یا ستوں کے کچھ
 جو کسی کو بھی کچھ نہیں کہتے

اقصی نامر ————— گلستان جوہر
 سچ کہوں مجھ کو یہ عنوان برا لگتا ہے
 ظلم سہتا ہوا انسان برا لگتا ہے
 کس قدر ہو گئی معروف یہ اپنی دنیا
 ایک دن پھرے تو مہمان برا لگتا ہے

آسیہ جاوید ————— (بارہندی) علی پور چٹہ
 آیا ہوں کہاں سے سرشام نہ پوچھا
 بستی کے چراغوں نے میرا نام نہ پوچھا
 میں نے بھی اسے دیکھ کے رخ پھر لیا تھا
 اس نے بھی مرا حال سرشام نہ پوچھا

عائشہ ————— گوجران
 اس خیال سے تسبیح ہی توندی میں نے فرائض
 کیا گن گن کر اس کا نام لینا جو بے حساب یقیناً

سحر سہیل ————— کراچی
 ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
 عشق کی کون انتہا لایا
 اب تو جاتے ہیں بُت کدے سے میرے
 پھر ملیں گے اگر خدا لایا

فضہ بلال ————— فیصل آباد
 اسے کہے اپنا بھی قاتل
 وہ آخر ہوا کب ہمارا ہے
 جو دیل کے ساتھ بہہ جائے
 وہ تو وہی پھر پھر اکتا رہے

نمرہ عاقب ————— گرین سٹی
 کھڑکیاں دہند ملیں، راتے منان ملے
 اپنی آنکھوں کی طرح شہر بھی دیران ملے

ماریرہ ————— کراچی
 تری خوشی سے مقدم تو کوئی چیز نہیں
 ترے بنا ہی گزر جائے، زندگی ہی تو ہے

صدف عمران ————— کے ڈی اے سوسائٹی
 کیسا کیسا شخص ہے ساری ساری رات
 دیواروں کو درد سنایا کرتا ہے
 رو دیتا ہے آپ ہی اپنی باتوں پر
 اور پھر خود کو آپ ہنسایا کرتا ہے

آسیہ حنیف ————— کورنگی
 ہماری دھج پہ جب بھی غداں اتریں گے
 تمہاری یاد کو اس دل کی ڈھال ہونا ہے

اقرا ————— کراچی
 ہر اک مجلس کے ملتے پرالم کی داستانیں ہیں
 کوئی چہرہ بھی پڑھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

امّت الصبور

حلال کی ڈاڑھی

تو اس کا عہد دوام دکھ ہے
یہ شو کرتی ہوا کا سارا خرام دکھ ہے
ہمیں خبر ہے
تمام دکھ ہے
یہ تم محبت نباہتے ہو

تو اس محبت کا نام دکھ ہے
یہ وصل موسم جو اک مسلسل مغالطہ ہے
تو اس رفاقت کا نام دکھ ہے
اور ایسی وحشت نما فضا میں
خوش رہنا بھی اک سزا ہے
مگر کسی سے کلام دکھ ہے
ہمیں خبر ہے
تمام دکھ ہے

تینم کوثر

بھلے دنوں اظہر فراع کی شاعری پڑھی۔ ان
کی کچھ غزلیں مجھے بے حد پسند آئیں۔ یہ غزل
ان میں سے ایک ہے۔
کوئی سلسلہ نہیں جاوہاں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی
میں تو ہر طرح سے ہوں واپس گاہ ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی
میں یہ چاہتا ہوں کہ عمر بھر رہے تشنگی مرے حلق میں
کوئی جستجو رہے درمیاں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی
مرے ہم نفس تو حرام تھا تجھے کیا خبر مرے حال کی
کہ جیسا لیس کہے دھواں دھواں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

ناہید اسماعیل

کھو ڈاڑھی
زندگی میں دکھ زیادہ ہیں سکھ کم، ان لوگوں کے
لیے جو سوجنے والا دماغ رکھتے ہیں اور درد محسوس کرنے
والا دل۔ خوشی گیسلائی کی یہ نظم ایسے ہی دکھوں کی
عکاس ہے

تمام دکھ ہے

ہمیں خبر ہے
تمام دکھ ہے
یہ زندگی کو جو آسمانوں کی دستوں سے
ہزار صدیوں سے مل رہا ہے
پیام دکھ ہے
جو کا نذر زوال بہتی کو
دھوپ چھاؤں کی آہٹوں سے چلا رہا ہے
نظام دکھ ہے
سحر تو اک مختصر سا غم ہے
طویل دن کی حویلیوں کے
جور استوں میں مٹھ کر گئی ہے
وہ شام دکھ ہے
کہ اس کی شہ پرکھی وڑوں سے
مسافر ان ابد کا ایسے فراق آثار راستوں پر
سفر تو غیر ایک المیہ ہے
قیام دکھ ہے
ہمیں خبر ہے، تمام دکھ ہے
یہ اس دکھ ہے، نرا اس دکھ ہے
ہوا سیل کا لباس دکھ ہے
یہ تشنگی جو عذاب بن کر مٹھ کر گئی ہے
بدن کے بوسیدہ ساحلوں پر

ہوا ہے شرق میں عزق اب سینہ مری
ابھی حشر نہ اٹھاؤ، غبار چھٹنے دو

ملک کی آنکھ بھی حیراں زمین سرگرداں
بھڑک رہا ہے الاؤ، غبار چھٹنے دو

زمانہ جلد ہی سارے نقاب اٹھے گا
کسی سے دل نہ لگاؤ، غبار چھٹنے دو

زمین بوس ہوئی ہے ہر ایک سطرقات
بس آگے دیکھتے جاؤ، غبار چھٹنے دو

یہ ایشیائے جنوبی کی آزمائش ہے
قدم سمجھ کے بڑھاؤ، غبار چھٹنے دو

پہاڑ نعرہ تکبیر سے ہیں بھر گونجے
کئی کا خون نہ بہاؤ، غبار چھٹنے دو

برادران امارت! امتحان ہے یہ
عزفہ میں نہیں آؤ، غبار چھٹنے دو

یہ ترا وصال وصال تھا نہ تری جلدانی ہے
وہی حالت دل بدگماں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

مرے نقش پاتھے دیکھ کر یہ جہل رہے ہیں نہیں بتا
ہے ماسرلح مرا نشان ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

طوبی، ردا
کھو ڈاڑھی سے

وقت گزر جائے تو بہت سی حقیقتیں کہانیاں
بن جاتی ہیں۔ اس غزل کو پڑھیے، ایسے ہی غم و ملالت
کی ترجمانی ہے

وقت بیتا محبت پرانی ہوئی
جو کہانی نہ تھی، کہانی ہوئی

یہو کا عالم ہے کیوں دل کی آفیم میں
کس شہنشاہ کی حکمرانی ہوئی

تھی غم لائیکانی کی فرصت کے
آرزو میں بسر زندگانی ہوئی

سراٹھایا نہ جنبش لبوں کو بھی دی
گفتگو دھڑکنوں کی زبانی ہوئی

حبیبہ خان
کھو ڈاڑھی سے

معروف صحافی محمود شام شاعر بھی ہیں۔ پڑوسی
ملک افغانستان کی ابھی ہوئی صورت حال پر ہم
انہوں نے یہ نظم لکھی ہے جو مجھے بہت پسند آئی۔
آپ سب کی تلمذ۔

غبار چھٹنے دو،

ابھی نہ جشن مناؤ، غبار چھٹنے دو
مرے جھستہ نواؤ، غبار چھٹنے دو

ادارہ خواتین و انجمن کی طرف سے بیویوں کے لیے خوب صورت ناول

پسلاطیل

افشاں آفریدی

پسلاطیل

بھی عجیب ہے

قیمت - 400/- روپے

منکوائے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021

8۔ ”تعلیم؟“

”بی کام“

9۔ ”شو بزم میں آمد؟ گھر والوں کا رد عمل؟“

”تھوڑی لمبی کہانی ہے اداکاری کا شوق بچپن سے تھا۔ اور تعلق بزنس کیونٹی سے تھا..... دونوں بالکل الگ پروفیشن ہیں..... لیکن شوق بڑھتا گیا اور جنون کی حد تک جا پہنچا..... پھر سوچ لیا کہ بزنس کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی کرنی ہے۔ بس پھر جدوجہد شروع..... سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فیلڈ تک کیسے پہنچوں..... میں نے ڈرامے دیکھنے شروع کیے اس مقصد سے کہ ان کے ڈائریکٹرز کون ہیں اور پروڈکشن ہاؤسز کون کون سے ہیں..... پھر میں نے ”گوگل“ پر سب کو ڈھونڈا..... اور پھر پہنچ گیا ان سے



معروف ٹی وی فنکار

ابوالحسنہ سے باتیں

شاہین رشید

ملنے..... آڈیشنز دیتا رہا۔ چکر لگاتا رہا..... اور پھر..... آہستہ آہستہ کام ملنا شروع ہوا اور اب — کام کر رہا ہوں..... جہاں تک گھر والوں کے رد عمل کی بات ہے تو 2008 میں انہوں نے مجھ پر چھوڑ دیا تھا کہ آپ جو کرنا چاہتے ہیں کریں..... تو بس بزنس بھی چل رہا ہے اور اداکاری بھی۔

10۔ ”بچپن میں کس سے بہت زیادہ ڈر لگتا تھا؟“

”ابو سے۔“

11۔ ”پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟“

”ایک جاب کی تھی، 15 ہزار ملے تھے..... وہ میں نے اپنے والد صاحب کو دے دیے تھے۔“

12۔ ”بچپن کا پہلا پیار؟“

1۔ ”اصلی نام؟“

”ابوالحسن“

2۔ ”پیار کا نام؟“

”ابول Abul“

3۔ ”تاریخ پیدائش؟“

”14 مئی 1990“

4۔ ”قد / ستارہ؟“

”5 فٹ 9 انچ / ٹور“

5۔ ”مادری زبان؟“

”پنجابی۔“

6۔ ”فیملی ممبر / آپ کا نمبر۔“

”ہم چار بہن بھائی ہیں، میرا نمبر آخری ہے،

اور والدین۔“

7۔ ”شادی؟“

”نہیں ہوئی۔“

”بچپن میں بہت لگاؤ تھا۔ ہر طرح کے کھیل کھیلے۔ اب لگاؤ نہیں رہا۔ کھیلنے کا۔ البتہ دیکھنے میں کرکٹ اور فٹ بال پسند ہیں۔“

22۔ ”زندگی سے کیا سیکھا؟“

”زندگی تو ہر مرحلے میں کچھ نہ کچھ سکھاتی رہتی ہے۔ اور میں نے جو بات سیکھی ہے وہ یہ کہ جو کچھ بھی کرو اپنی سوچ اچھی دکھائی دے گا۔“

24۔ ”کس کی خاطر شوبز چھوڑ سکتے ہیں؟“

”ہا ہا ہا..... اس تصور سے بھی ڈر لگتا ہے مجھے۔“

25۔ ”پہلی بار کس سے ملے؟“

”ایمانداری سے بتاؤں، مجھے کوئی کنفیوژن نہیں ہوا..... میں بہت انجوائے کر رہا تھا۔“

26۔ ”تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟“

”جس دن سارے دوست مصروف ہوں۔“

27۔ ”گھر کی کوئی چیز خراب ہو جائے تو ٹھیک کرانے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟“

”میرا انتخاب انہی کاموں کے لیے ہوتا ہے۔“

28۔ ”زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو آپ کیا واپس لینا چاہیں گے؟“

”اپنی کالج لائف کے دو سال۔“

29۔ ”گھر میں آپ کے فیصلوں پر مداخلت کون کرتا ہے؟“

”کوئی نہیں..... بلکہ تمام فیصلے آپس کی رضا مندی سے ہی ہوتے ہیں۔“

30۔ ”بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟“

”بالکل نہیں..... مجھے ایسا لگتا ہے کہ بیماری کو جتنا زیادہ سیریس لیا جائے وہ اتنا ہی پریشان کرتی ہے۔“

31۔ ”آپ کے اب تک کے ڈراموں کی تعداد / مقبول ترین کون سے تھے؟“

”میں نے 89 ڈرامے کیے ہیں۔ اور مقبول ترین میں ”سوتیلی ماتا“، ”ہنسی پٹی محبت“، ”تھوڑا سا

”آپ اسے پیار نہیں کہہ سکتے، ہاں یہ ضرور تھا کہ ”جس میں گریڈ 7th کا طالب علم تھا تو مجھے ایک لڑکی اچھی لگتی تھی۔“

13۔ ”آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟“

”عام طور پر میں تقریباً دس ساڑھے دس بجے تک اٹھ جاتا ہوں۔ لیکن جس دن شوٹ ہو تو پھر اس کے حساب سے اٹھتا ہوں۔“

14۔ ”صبح کیانہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟“

”چائے۔“

15۔ ”کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟“

”بھوک برداشت سے باہر ہو جائے تو غصہ آ جاتا ہے۔“

16۔ ”پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟“

”ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے پاکستان میں جان پھنسی ہوئی ہے..... اس لیے ہمیشہ سے اس کی ترقی و خوشحالی کے لیے دعا گورہتا ہوں۔“

18۔ ”کس ملک کی شہرت کی خواہش ہے؟“

”نہیں جی..... پاکستانی ہونا میرے لیے باعث فخر ہے۔“

19۔ ”کیا آپ کو رونا کا شکار ہوئے؟“

”ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا؟“

”جی ابھی حال ہی میں، میں کو رونا کا شکار ہوا..... اور قریب نپٹنے میں رہا..... بہت سے ادھورے کام کیے۔ ایک کہانی جو ادھوری تھی اسے دوبارہ سے لکھنا شروع کیا۔ مطالعہ کیا..... البتہ باہر جانا بہت مس کیا۔ اس لیے کہ مجھے تنہائی پسند نہیں ہے۔“

20۔ ”شوبز میں کیا اچھا ہے کیا برا؟“

”اچھا یہ ہے کہ یہاں آپ کے خواب پورے ہوتے ہیں..... اور برا یہ ہے کہ ہمارے یہاں آرٹسٹوں کو ویسی عزت نہیں ملتی جیسی باہر کے ملک میں آرٹسٹوں کو ملتی ہے۔“

21۔ ”کھیلوں سے آپ کا لگاؤ، کون سا کھیل پسند ہے؟“

”اچھا یہ ہے کہ یہاں آپ کے خواب پورے ہوتے ہیں..... اور برا یہ ہے کہ ہمارے یہاں آرٹسٹوں کو ویسی عزت نہیں ملتی جیسی باہر کے ملک میں آرٹسٹوں کو ملتی ہے۔“

21۔ ”کھیلوں سے آپ کا لگاؤ، کون سا کھیل پسند ہے؟“

”کھیلوں سے آپ کا لگاؤ، کون سا کھیل پسند ہے؟“

”کھیلوں سے آپ کا لگاؤ، کون سا کھیل پسند ہے؟“

”کھیلوں سے آپ کا لگاؤ، کون سا کھیل پسند ہے؟“

حق۔

32۔ ”رول کون سے اچھے لگتے ہیں گلیٹو یا

پوزیٹو؟“

”مجھے چیلنجنگ اور ویری ایشن والے رول اچھے

لگتے ہیں..... خواہ گلیٹو ہوں یا پوزیٹو۔“

33۔ ”ادب سے لگاؤ؟ کس کو پڑھتے ہیں؟“

”ادب سے تھوڑا لگاؤ ہے..... پڑھنے کا وقت

نہیں ملتا۔“

34۔ ”کچن سے رغبت؟ کبھی شیف بننے کا

سوچا؟“

”نہیں جی..... کوئی رغبت نہیں..... اور نہ ہی

ایسا سوچا..... مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ بنا ہی لیتا ہوں۔“

35۔ ”کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟“

”ایسا فی الحال تو نہیں ہوا۔“

36۔ ”کبھی سوچا سوسل میڈیا نہ ہوتا؟“

”نہ ہوتا تو زندگی میں زیادہ سکون ہوتا۔“

37۔ ”کس شخص پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں

کر سکتے؟“

”ماں باپ پر۔“

38۔ ”کس کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟“

”میں اپنے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ

ابھی بہت کچھ پانا باقی ہے۔“

39۔ ”ایک نصیحت جو سب کو کرتے ہیں؟“

”کوئی بھی کام کرو پوری لگن اور محنت سے.....

صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں کامیابی ضرور ملے

گی۔“

40۔ ”ملک کی ترقی میں کون رکاوٹ ہے

حکمران یا عوام؟“

”حکمران بھی تو عوام میں سے ہی ہیں۔“

41۔ ”کبھی غربت میں وقت گزارا؟“

”بچپن کے چند سال مشکل میں گزارے اور

اس کا احساس اب ہوتا ہے..... سوچتا ہوں کہ والدین

نے کبھی اجاس نہیں ہونے دیا تھا۔ میرا تعلق ایک

مڈل کلاس فیملی سے ہے۔ ہم نے ہمیشہ اپنی چادر دیکھ

کر پاؤں پھیلانے ہیں۔“

43۔ ”بچپن میں کن مضامین سے بوریت

ہوتی تھی؟“

”کیمسٹری اور فزکس..... کبھی پتے پڑے ہی

نہیں۔“

44۔ ”ڈاکٹر، حکیم، اور ہیومیو پیتھک آپ کا

انتخاب؟“

”ہومیو پیتھک۔“

45۔ ”پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟“

”تعلیم، ملک کی ترقی کے لیے بہت ضروری

ہے۔“

47۔ ”کیا دل سے اتر ا ہوا شخص دوبارہ اپنا

مقام بنا سکتا ہے؟“

”ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ جو رشتہ ہے وہ بچ

جائے لیکن پھر بھی کوئی نہ مانے تو پھر وہ دل سے اتر

جاتا ہے پھر دوبارہ میرے دل میں اپنا مقام نہیں

پاسکتا۔“

47۔ ”اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ

لیتے ہیں؟“

”اپنے والدین سے۔“

48۔ ”موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟“

”نہیں..... کیونکہ بہت زیادہ امیدیں تھیں۔

تبدیلی کی..... لیکن مکمل ہونی نظر نہیں آرہی۔“

49۔ ”مستقل طور پر ملک سے باہر رہنا پڑے

تو آپ کی ایکٹیوٹی کیا ہوگی؟“

”بزنس میں ہوں تو بزنس ہی کروں گا۔“

50۔ ”آپ کی زندگی میں ایسا کون ہے جس کا

روٹھنا آپ سے برداشت نہیں ہوتا؟“

”امی کا۔“

51۔ ”ٹی وی شو کے بہترین اسکرپٹس؟“

”واسع چوہدری۔“

52۔ ”آپ کا رازدار کون ہے؟“

67۔ ”کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے

ہیں؟“

”سونے کے لیے۔“

68۔ ”پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟“

”کراچی ہائی وے۔“

69۔ ”آئیے کوکتنا وقت دیتے ہیں؟“

”بہت کم۔“

70۔ ”کیا شادی ضروری ہے؟“

”بالکل ضروری ہے..... کیونکہ شادی انسان کی

زندگی کو مکمل کرتی ہے؟“

71۔ ”اپنا کل سوچ کر کیا احساسات ہوتے

ہیں؟“

”کل کبھی لگتا ہی نہیں ہے..... کہ وہ کل تھا.....

وہ تو آج کی ہی بات لگتی ہے..... پھر احساس ہوتا ہے

کہ بہت سی چیزیں جو آج کر رہا ہوں وہ کل کر لینی

چاہیے تھیں۔“

72۔ ”سگنل پہ کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ

لیتے ہیں؟“

”یہی کہ کیا حال ہو گیا ہے شہر کا..... نہ پیدل

چلنے کے لیے فٹ پاتھ ہیں..... نہ گاڑی اور بائیک

چلانے کے لیے اچھے روڈ ہیں۔“

73۔ ”بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟“

”عامر خان اور شاہ رخ خان۔“

74۔ ”خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ

رائٹر؟“

”عمیرہ احمد“

75۔ ”بچپن میں کون سے گمز کھیلے؟“

”سب کھیل کھیلے..... بیٹ منٹن، پکڑم پکڑائی،

”چھپن چھپائی“، برف پانی وغیرہ..... کرکٹ بھی

کھیلی۔“

76۔ ”شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں تو پہلے کس کا

خیال آتا ہے؟“

”کہ بہت خرچا ہونے والا ہے۔“

”چند دوست۔“

53۔ ”فیملی پر آپ کا کتنا عجب ہے؟“

”گھر کے چھوٹے سے ایسے سوال نہیں کرتے،

دل دکھتا ہے۔“

54۔ ”کون سی تاریخیں یاد رکھتے ہیں؟“

”صرف شو کی۔“

55۔ ”ایک کھانا جو کسی بھی وقت کھا سکتے

ہیں؟“

”سینڈوچ“

56۔ ”اپنی پرفارمنس میں کیا کمی محسوس ہوتی

ہے؟“

”بہت سے سین دیکھ کر لگتا ہے کہ اس سے بہتر

کر سکتا تھا۔“

57۔ ”اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟“

”یہی کہ اگلے ڈرامے میں کچھ الگ کیسے کرنا

ہے۔“

58۔ ”کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے؟“

”میں زیادہ نیوی نہیں دیکھتا۔“

59۔ ”پہلی فلم جو سینما ہاؤس میں دیکھی؟“

”یاد نہیں شاید کوئی بالی ووڈ کی فلم تھی۔“

61۔ ”کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟“

”راک اسٹار میں رنیر کپور کا کردار کرنا چاہتا

ہوں۔“

62۔ ”آپ کا ناقابل فراموش کردار؟“

”علی کا کردار جو ”سو تیلی مٹا“ میں کیا تھا۔“

63۔ ”کس کردار کو کرنے سے انکار کیا؟“

”جس کا اپنا کوئی ٹریک نہ ہو۔“

64۔ ”کس سیاست دان کا کردار کرنے کی

خواہش ہے؟“

”ذوالفقار علی بھٹو کا۔“

65۔ ”چاند پر پہنچ کر دنیا میں پہلا پتھر کس کو

ماریں گے؟“

”دوستوں کو..... تاکہ وہ جلدی آجائیں۔“

- 77- ”کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے زیادہ خوب صورت نہ ہو جائے۔“
- 87- ”کل کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا آج کی؟“
- ”آج کی کیونکہ میرا کل میرے آج پر منحصر ہے۔“
- 78- ”بھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں ہے۔“
- 88- ”صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟“
- ”بہت سنی ہیں..... ہا ہا ہا۔“
- 79- ”اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتے ہیں؟“
- 89- ”فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟“
- ”بزنس میں..... کاروبار کی رولنگ میں ہی لگ جاتا ہے۔“
- 80- ”ڈ۔تھ سین آسانی سے کر لیتے ہیں؟“
- ”میں..... ویسے تو میں بہت چل (ٹھنڈا مزاج) ہوں۔ لیکن جب پانی سر سے گزر جائے تو بس پھر.....“
- 90- ”فیملی میں کون فراخ دل ہے؟“
- ”ابو۔“
- 81- ”اگر آپ کو کسی سلیمہ بی کا انٹرویو کرنا پڑے تو کس کا کریں گے؟“
- 91- ”بچپن کا کون سا خوب پورا نہیں ہوا؟“
- ”اڑنے کا بہت شوق ہے۔“
- 82- ”نیند کتنی پیاری ہے۔“
- 92- ”پسندیدہ تہوار؟“
- ”عید الاضحیٰ۔“
- 83- ”مجھ سے زیادہ نیند کو میں پیارا ہوں اسی لیے چلی آتی ہے۔“
- 93- ”جانوروں میں پسندیدہ جانور؟“
- ”کتے۔“
- 84- ”آپ کے گھر میں آپ کے علاوہ کون اس فیلڈ سے وابستہ ہے؟“
- 94- ”اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟“
- ”اپنے تجربے سے سیکھتا ہوں۔“
- 85- ”گھر میں کیا پورے خاندان میں کوئی اس فیلڈ سے وابستہ نہیں ہے۔“
- 95- ”کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟“
- ”چائے..... صرف چائے۔“
- 86- ”بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟ گولڈ، پراپرٹی یا پرائز بانڈ؟“
- 96- ”مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟“
- ”بچت ہی تو نہیں ہو پاتی مجھ سے۔“
- 87- ”شادی میں کتنے رسموں کے خلاف ہیں؟“
- ”کسی بھی رسم کے خلاف نہیں..... انسان خوشی جس طرح منانا چاہے یہ اس کا حق ہے۔“
- 88- ”خواتین آئینے کو زیادہ وقت کیوں دیتی ہیں؟“
- 97- ”یہ تو کہنا مشکل ہے..... لیکن شاید ”چار بار“ اور اب تو باہر کا کھانا بھی گھر ہی آ جاتا ہے۔“
- 89- ”اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو وجہ جاننے کی کوشش کروں گا..... غلطی یا کمی کو سدھارنے کی کوشش کروں گا۔“
- 90- ”خواتین اور خوب صورتی دونوں ساتھ ساتھ ہیں اس لیے وہ آئینہ دیکھتی ہیں کہ کہیں کوئی ان سے

وہ جیسی نظر آتی ہیں ویسی حقیقت میں بالکل نہیں۔ ان کے طلاق یافتہ ہونے کے ساتھ زیادہ افسوس اس بات کا بھی ہوا کہ ایک ہی بیٹا ہے وہ بھی ان سے لے لیا گیا۔ لیکن حمیرا بانو جیسی خواتین کی مثالیں ہی ہیں ہمارے سامنے کہ جن کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ ضروری نہیں شادی میں ناکامی ہو تو باقی زندگی کے ہر میدان میں بھی ناکام نظر آئے۔ ان کے بعد غزالہ کیفی بھی اپنے انداز میں بہت اچھی لگیں۔

”سفر تمام ہوا“ پڑھ کر بہت دلی افسوس ہوا۔ اور بہت دل چاہا کہ میں بھی کوئی کہانی پڑھوں ان کی لکھی ہوئی۔ اب دنیا سے جانے کے بعد آپ کے لیے وہ آخری ملاقات بہت خاص رہی ناں، ساری باتیں یاد رہیں۔ پتا نہیں کیوں میں بھی یہ بات سوچتی ہوں کہ جانے والے کی یادوں میں ہمیں صرف آخری ملاقات ہی کیوں اتنی اچھی طرح یاد رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت رخ چوہدری کی مغفرت فرمائے۔ ”ہمارے نام“ میں اس دفعہ تہامید اسماعیل کا تفصیلی خط پڑھ کر کافی مزہ آیا۔

تمام قارئین کی طرف سے ”وہ میرے کیسری پھول“ کی اتنی پذیرائی دیکھ کر تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ بہت اچھی چیز ہی ہے جو میں ابھی بعد میں ہی پڑھوں گی۔ سب کو پسند آیا۔ حیرت ہے۔ سوائے ایک قاری بہن سائرہ سید کے جنہیں اس ناول کا مزہ نہیں آیا۔ باقی سب خطوط دلچسپ تھے۔ ایک مسرت الطاف تھیں، جو کراچی سے خط لکھتی تھیں۔ ہر دفعہ نئے ناموں سے خطوط میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور کمال تو آپ کا ہے اس ادارے کا ہے جو سب کے نام اور غیر حاضری کو یاد رکھتے ہوئے محبتوں کا جواب اتنی محبت سے دیتے ہیں۔

”نفسیاتی الجھنیں“ میں نغمہ کی پریشانی دیکھ کر تو میں بھی ڈر گئی کہ میرے ساتھ بھی اگر ایسے ہوسرال میں تو کہاں سے لائی جائے ایسی برداشت۔ بھلا ہو عدنان بھائی کا جنہوں نے ایک ہی جملے میں سمجھا دیا کہ اس کا ایک ہی حل ہے کہ آپ ان باتوں کی پرواہ نہ کریں۔ تھوڑا وقت دیں ان کو۔ ان لوگوں کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیں۔ خود ہی تھک کر خاموش ہو جائیں گی۔

ہیرا اور عنبر..... ضلع کوہاٹ

کچھ سال پہلے میٹرک میں تھی۔ میری کلاس ٹیچر نے ڈائجسٹ میز پر رکھا اور بھول گئیں اور اسے میں اپنے گھر لے گئی۔ ایک دوست کی مدد سے پچھلے سارے ڈائجسٹ پڑھ لیے اور میں سارے عنبر کو بھجوائی تھی، عنبر میری کزن اور دوست بھی ہے۔ ہمارے گھر میں ڈائجسٹ پڑھنا ممنوع ہے لیکن اتنی بھی سختی نہیں ہے کوئی مارے یا ڈائجسٹ بھاڑے۔ صرف ڈانٹ ملتی رہتی ہے اور ہم ڈھیٹ بن گئے ہیں۔ ہم نے شعاع، اور خواتین باقاعدہ سے پڑھنا 2019 سے شروع کیا۔ اس ماہ کا ڈائجسٹ پورا کا پورا ایڈٹ تھا۔ عنبرہ سید کے والد، شاہین رشید کے بھائی منشا، محسن علی کی دادی کی وفات کا سن کر دل بہت اداس ہوا۔ ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ راحت جمیں نے کیا خوب لکھا۔ ہمیں ہر ماہ پوری شدت سے انتظار ہوتا ہے پلیز اس کے صفحات بڑھادیں۔ ”رنگ ریز میرے“ ہم دونوں کا فیورٹ ہے۔ ہمارے نام میں خط بہت شوق سے پڑھتی ہوں، فائزہ بھٹی کو شادی کی بہت مبارک ہو۔

ج: ہیرا اور عنبر! آپ دونوں دوستوں کو خواتین کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں، آپ نے ہمیں خط لکھا۔ دلی مسرت ہوئی۔ آئندہ بھی ہماری محفل میں شرکت کرتی رہے گا۔

ثناء عابد..... قلعہ احمد آباد

ستمبر کا شمار ہمارے بار بھی دیر سے ہی ملا اور اب کی بار آپ کے کہنے پر مکمل پڑھ کے ہی لکھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے نمرہ احمد کا نیا ناول ڈھونڈا لیکن افسوس نہ کوئی ناول اور نہ ہی نمرہ کا انٹرویو پڑھنے کو ملا۔

کرن کرن روشنی میں کچھلی بار ”سورۃ فاتحہ“ کی فضائل و برکات سے مستفید ہونے کے بعد اس دفعہ نماز عشاء، نفل نمازیں اور روزہ کے بارے میں تفصیل جان کر معلومات میں اضافہ ہوا۔

حمیرا بانو سے ملاقات کافی حیران کن رہی۔ بظاہر

وہ لائم لائٹ میں آگئیں۔ ”شہناز“ (شرکی ماں) پر تو بہت افسوس ہے وہ ماں جو پالنے میں بچے کے اشارے سمجھ جاتی ہے وہ اپنے بچے کی مشکل و مصیبت نہ سمجھ سکی۔ کیا کردار ہے ایسی ماؤں کا؟ اور کیا ماؤں کو اتنا نا سمجھ ہونا چاہیے؟ ماں نا سمجھ ہو تو زندگی پہاڑ بن جاتی ہے۔ جو گزارے نہیں گزرتی اور سب سے اچھا یہ کیا سیدھے نے کہ شرکی اور کیوان کی شادی کروانے کی کوشش نہیں کی۔ نہیں تو یہ ایک روایتی کہانی بن جاتی ایک لڑکے اور ایک لڑکی کہانی، لیکن اختتام پر کہانی کی زیادہ اچھی رہی اور انفرادیت بھی برقرار رہی۔

”مرک“ ایک اچھی ہلکی پھلکی روایتی سی کہانی ”مکرم“ کا کردار ایک اچھا کردار تھا۔

”تلیوں کے پر“ شاملہ والعباد کی ایک ہی مثبت تحریر دونوں کے لیے پیغام ”تلیوں“ کے لیے کہ ”اپنے پروں کی حفاظت کریں“ اور والدین کے لیے کہ احساس ضرور دلائیں غلطی کا لیکن معاف کر دیں۔ ان سے پرواز کا حق نہ چھینیں۔

”زندگی ہم تجھے گزاریں گے۔“ میں زمین کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگئی۔

”رنگبریز میرے“ میں ”حریم“ کچھ کم ظرفی والی حرکت کر گئی۔ کتنی سے تو بہت ہی محبت ہے ہمیں اور ہمدردی بھی ”حریم“ سے جو حماقت ہوگئی اس کا افسوس ہوا۔ مارہ کا کزن تو کچھ سمجھ بوجھ والا ہی لگ رہا ہے، آگے دیکھیں۔

”ہاں اور ناں“ میں چچوں والا سین کچھ مبالغہ زیادہ ہو گیا۔ باقی ”دورخ“ کی کہانی کمزور لیکن مسیج اچھا تھا۔ باقی سب اچھا تھا۔

اور ”پرچھائی“ پہ طارق صاحب (غالبا) نے جو تصویر بنائی۔ بہت پسند آئی، کیا۔ ”خمار آلود“ آنکھیں تھیں۔ سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی۔ اور ترک، کی تصویر فوراً پہچان گئے ہم کہ یہ بھی ان ہی ہاتھوں کا کمال ہے۔ اگر یہ نیکل ہے تو اتنا حسین نیکل۔

☆ پیاری عنبر اور مریم آپ کا اتنا بہترین تبصرہ اس پر موتیوں جیسی لکھائی خط پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ پرواز سے پہلے کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ اس میں ہیرو

مکمل ناول تینوں بہت اچھے تھے۔ نعیمہ ناز کا ناول روپ بہ روپ یہ تو کہانی ہے، خوش گوار اینڈ ہو گیا۔ حقیقت کی کہانیوں کا کیا کہا جائے۔ حقیقی کہانی میں شائد جیسی جوان اولاد کے والدین کو کون سمجھائے کہ وہ اپنے رویوں سے ہی کم از کم زندگیاں بہتر کر لیں۔ پر افسوس، حقیقت میں گھر کے بڑے اتنے اچھے نہیں ہوتے۔

”تلیوں کے پر“ کیا کہوں۔ شروع میں کہانی۔ عام سی لگی۔ پھر آگے آگے پڑھ کے کہانی میں سمجھنے سیکھنے کی باتیں بھی ملیں۔

”بیٹیاں بڑی نازک مخلوق ہوتی ہیں چھوٹی چھوٹی غلطی پر ان کے پر نوچنا ظلم ہے۔“

”والدین جانتے ہیں، ان کے بچے کتنے قابل ہیں۔ کم عمر، کم عقل اور بے روزگار بچوں کی شادی ظلم ہے۔“

”مرک“ صدف ریحان گیلانی کی یہ کہانی اپنے نام انداز و بیان کی وجہ سے کچھ مختلف لگی لیکن کافی اچھی رہی۔ پی ٹی وی کے ڈراموں میں ایسی کہانیاں، رہن بہن دیکھنے کو ملتا ہے۔

افسانے حسب روایت کسی نہ کسی اچھے سبق کے ساتھ بہترین تھے۔

☆ پیاری ثنا.....! آپ کا خط پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ لگتا ہے ایک ایک سطر توجہ سے پڑھتی ہیں اور کہانی میں جو پیغام ہوتا ہے، اسے بھی سمجھتی ہیں۔

عنبر حسین، مریم حسین..... گجرات ”کہنی سنی“ کے فوراً بعد ”کرن کرن روشنی“ سے استفادہ کیا۔ بہت ہی اہم اور نئی معلومات تھیں۔

”انشاء جی“ کی ”کچھ دار“ گفتگو سے بہت محفوظ ہوئے۔ اور پنجابی کا رڈ بہت ہی پسند آیا۔

”شاہین رشید“ شکریہ ”غزالہ کیفی“ صاحبہ سے ملوانے کے لیے۔ ”شاہین رشید صاحبہ“ سے فرمائش ہے کہ ”ڈاکٹر عارفہ سید“ صاحبہ کا انٹرویو بھی کریں۔ ہمیں شدت سے انتظار رہے گا۔

”پرواز سے پہلے“ سیدہ عمیر کے نام سے واقفیت تو تھی پہلے لیکن اس کہانی کے بعد ہمارے لیے

اور ہیر ورن کی شادی نہیں کرائی گئی۔ بے لوث محبت اور بے غرض دوستی کا اپنا مقام ہے۔ آپ کا مسئلہ بیوٹی بکس والوں کو دے دیا گیا ہے۔

منابل بٹ..... گوجرانوالہ

میری عمر تیس سال ہے۔ تین عدد بچے ہیں ماشاء اللہ سے دو بیٹے، ایک بیٹی، ایم اے اردو کی طالبہ تھی کہ شادی ہو گئی۔ خواتین سے تعلق ایسا ہے کہ کبھی جوڑ لیا کبھی توڑ لیا مگر لکھنے پڑھنے سے لگاؤ بہت ہے۔ چھٹی جماعت میں تھی سب سے پہلا ناول ”عمیر احمد“ کا ”من و سلوی“ پڑھا۔ شاید 2005 یا 2006 کی بات ہے۔ اب شوہر صاحب کو کوئی لگاؤ نہیں وہ فالتو سمجھتے ہیں کہانیاں پڑھنا مگر یہ خواتین صرف ایک کہانیوں کا مجموعہ ہی تو نہیں یہ تو زندگی کو سنوارتا اور بھٹکنے سے روکتا ہے۔ بہت طویل ناراضی اور تھوڑی بہت لڑائی کے بعد چار سے پانچ ماہ بعد ستمبر میں آخر انہوں نے رسالہ لا دیا۔ کیسے جتن کر کے منگوایا یہ لمبی کہانی ہے۔

”نفسیاتی الجھنیں“ میں عدنان بھائی نے نغمہ بہن کو جو مشورہ دیا۔ وہ سو فیصد درست ہے۔ صبر سے کام لیں۔ آنے والا وقت بہتر جواب دے گا سسرال والوں کو۔ موسم کے پکوان میں ”سہ رنگی“ سلا د پسند آیا رخ چوہدری کے لیے اظہار افسوس۔ باورچی خانہ صبا شفیق کا بس ٹھیک ہی رہا مگر صبا جی ہم بھی بہت بہت شوقین ہیں باہر کھانے کے مگر شوہر کو پسند نہیں باہر کھانا جو کھانا گھر منگوالیں۔ مگر ہم بھی بڑے بیٹے اور باقی دو کو بھی ساتھ لے کر نکل جاتے ہیں کبھی پیزا کھانے بھی کھانا تو جو موڈ میں ہوا۔ بڑا بیٹا بھی ماں پر گیا بقول میرے شوہر کے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے مگر پر چھائی ”مار یہ کامران“ کا سب کو مات دے گیا۔

ناولٹ ”تلیوں کے پر“ شائلہ العباد کا بہت پسند آیا غلطی پہلی بار ہی بہت سبق دے جاتی ہے، اس لیے ہمیں اپنے بچوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ مرک بس ٹھیک ہی تھا آخر میں اتنا لمبا کر دیا کہ ہمیں بور کر گیا۔ ہمارے نام میں گڑیا جی اتنی ناراضی، مگر یقین کریں ہم نے آپ کی کمی کو فیل کیا۔ گوشتی جمال، ڈاکٹر ہانیہ خان طوبی، صدف اور مقدس ناز کے خط بھی پہلے ڈھونڈتے ہیں۔

☆ پیاری منابل! خواتین کے ساتھ اتنا طویل ساتھ بھانے کے لیے شکریہ۔ آپ کے شوہر بہت اچھے ہیں کہ انہوں نے لڑا جھگڑا کر ہی سہی لیکن آپ کے شوق کا خیال رکھا اور خواتین آپ کو کھلا کر دیا۔

اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

حرور..... ممتاز زولا

سلسلے وار ناولز اچھے جارہے ہیں۔ ”رنگ ریز میرے“ فاطمہ اب پاکستان پہنچ کر نیا پھنڈا ڈالنے والی ہے۔ حیان کھڑوس جلاو، کنجوس اور یہی بنے گا فاطمہ کا آخر میں محبوب، ان شاء اللہ۔ اور میرب کا کڈ نیپ ہونا ہمارے پیروں تلے سے بھی زمین کھسکا گیا۔ ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ راحت جبین، زمین کو کچھ عقل دو۔ ”مرک“ اس بار صدف ریحان گیلانی صاحبہ نے دلچسپ ناول پیش کیا۔ اطراف میں پھیلے اسی کیف و سرور نے ہمیں سنیعہ عمیر سے جاملایا۔ جوں جوں ورق پلٹتے گئے، توں توں عقدے کھلتے گئے۔ ثمرہ کو دکھوں کی سمندر میں دھکیلنے والے خود اس کے اپنے تھے۔ ویسے کیوان کا مطلب کیا ہوا؟ سنیعہ اب جلدی سے دوسرا اچھا سا ناول لے آنا، آئی ایم ویننگ۔ شائلہ العباد ایک سوچ لے کر وار ہوئیں (تلیوں کے پر)۔ اب باری آئی ہے نغمہ ناز کے مکمل ناول ”روپ بہروپ“ کی، اگرچہ قصیم وہی پرانا سا تھا مگر شائستہ انداز اور ہلکی پھلکی تحریر نے خوش گوار اثر چھوڑا۔ ”پر چھائی“ اور ”دور رخ“ اچھے افسانے تھے۔

”آپ کا باورچی خانہ“ صبا شفیق سے مل کر چھاگا (صبا مجھے جہلم کا پل دیکھنے کا بہت شوق ہے)۔ خوشی اور غم، اتنے حاسد لوگ دیکھ چکی ہوں کہ اب لوگوں سے میل ملاپ کا دل نہیں چاہتا۔

☆ پیاری حرور! آپ کا خط شامل ہے۔ بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے۔

کیوان کا مطلب تو ہمیں خود بھی نہیں پتا۔ یہ سنیعہ ہی بتا سکتی ہیں۔

آپ کا مسئلہ عدنان صاحب کو دے دیا ہے، ان شاء اللہ نومبر کے شمارے میں ان کا جواب شامل ہوگا۔



شوبز شخصیات نے بھی اس میں حصہ لیا۔ نادیہ حسین نے ابرار الحق کو تنقید کو نشانہ بنایا تو اشنا شاہ اور زرنش خان نے ابرار الحق کی حمایت کی۔
 ماسر حسین نے کہا کہ کبھی کسی ماں کو نہ پرکھیں کہ وہ بچے کو کیسے پالتی ہے، کیا سکھاتی ہے، کیا سناتی ہے۔ اگر میں نے یہ سب پہلے دیکھ لیا ہوتا کہ ماں کا بچے کو پالنا کتنا مشکل ہے تو میں اپنی ماں سے کبھی آنکھ ملا کر بات بھی نہ کر پاتا۔ (بیوی ماں بنی تو سمجھ میں آیا) ماں کا رتبہ بہت بڑا ہے، آج یا کل ماں ہمیشہ ماں ہے۔“

معیار

پاکستان میں ایوارڈ کی تقسیم ہمیشہ سے متنازعہ رہی ہے۔ عموماً جن کو ایوارڈ نہیں ملتا، وہ ہی اس کی نامزدگیوں پر اعتراض بھی اٹھاتے ہیں۔ معروف



خبریں و پس

واصفہ بیل

فنکارہ سونیا حسین نے بھی حال ہی میں ہونے والے نکلس اسٹائل ایوارڈ کی نامزدگیوں پر مایوسی کا اظہار کیا ہے۔



ذمہ دار

معروف گلوکار ابرار الحق کی جانب سے نئے دور کی ماؤں کی تربیت کے انداز کو تنقید کا نشانہ بنانے پر بحث چھڑ گئی ہے۔ ابرار الحق نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم جب چھوٹے تھے تو اس وقت مائیں بچوں کو گود میں لے کر کلمہ اور اللہ کا نام سنا کر سلا یا کرتی تھیں اور بچے فوراً سو بھی جاتے تھے۔ لیکن آج کل کی مائیں بچوں کو فون تھما دیتی ہیں، جس پر بے بی شارک ڈوڈ وچل رہا ہوتا ہے۔

ابرار الحق کے اس بیان پر کسی نے ان کی حمایت کی تو کسی نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ کچھ نے تو حد ہی کر دی یعنی ابرار الحق کو ان کے ماضی کے گانوں کے بول یاد کروادے۔ ایک خاتون نے کہا کہ بچ پنجا بن گئے۔ بلو دے گھر۔ آ جاتے بے جا سائیکل تے، جیسے گانے گانے والے آج ماؤں کو اس بات پر شرمندہ کر رہے ہیں کہ وہ بے بی شارک جیسی نظمیں سنا کر اپنے بچوں کی اخلاقی پستی کی ذمہ دار ہیں۔



سابق ممبر قومی اسمبلی سمیعہ راحیل صاحبہ کا ریکارڈڈ پیغام دکھایا اور سنایا گیا جس میں انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ خواتین حجاب کے اس سفر میں آگے بڑھ رہی ہیں۔

ممبر صوبائی اسمبلی نصرت سحر عباسی کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا جنہوں نے اپنے شرعی پردہ کرنے کا احوال سنایا۔

تقریب میں اپنی فیلڈ میں نمایاں رہنے والی خواتین کو یادگاری اعزازی شیلڈ دی گئی۔ محترمہ دردانہ صدیقی نے شیلڈ دی۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی امت الصبور صاحبہ بھی یہ شیلڈ وصول کی۔

محترمہ دردانہ صدیقی نے اپنے خطاب میں حیا و حجاب کو اس احساس کا نام دیا جو معاشرے اور خاندان کو پاکیزگی دیتا ہے اور مستحکم کرتا ہے۔

سورج کی مسیت

ماثل فریہ
میک اپ روز بیٹی پالو
فوتو گرائی مسیحہ رضا

سونیا حسین کا کہنا ہے کہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر ایوارڈ کے لیے اچھی کہانیوں پر مبنی ڈراموں کو شارٹ لسٹ کیوں نہیں کیا گیا۔ ایوارڈز کے لیے عوام میں پسند کیے جانے والے اپنے مقبول ڈرامے سراب کو ایک بھی نامزدگی نہ ملنے پر سونیا نے مایوسی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ ہم اچھے اور معاشرے میں بہتری لانے والے مواد کی تیاری کے حوالے سے بات کرتے ہیں مگر ایسے ڈراموں کو ایوارڈ کے لیے نامزد نہیں کرتے، کیا یہ دہرا معیار نہیں۔“

سوچ

آج کل شوہروں کے حوالے سے بہت باتیں ہوتی ہیں۔ شوہز انڈسٹری بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ شوہر کے کام کرنے سے ان کی محبت کا اظہار ہے اور کسی کا خیال ہے کہ کام کرنا ان کی ذمہ داری نہیں، نہ محبت ہے۔ ماڈل و اداکارہ نادیہ حسین کا کہنا ہے کہ شوہر کے کام کرنا عورت کا فرض نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنے شوہر کا کوئی کام نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ میرا بچہ نہیں، میرا لائف پارٹنر ہے۔ میں نے اپنے بچوں کی پرورش بھی اس طرح نہیں کی ہے، جیسا ہمارا معاشرہ چاہتا ہے کہ مرد کے سارے کام عورت کرے۔ اگر بیوی اپنے شوہر کو کھانا دے تو یہ بات غلط نہیں لیکن اگر شوہر حکم دے کر بیوی سے اپنے کام کروائے تو یہ غلط ہے۔ مرد اگر اپنے کام خود کرتا ہے تو اسے برا سمجھا جاتا ہے۔“ (گھر گھر والے مل کر بناتے ہیں دونوں ایک دوسرے کا خیال کر کے ہی گزارا کرتے ہیں)

حجاب ڈے

اس سال ”تہذیب ہے حجاب“ کے عنوان سے ملک گیر سطح پر پروگرامز کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کراچی میں ہونے والی کانفرنس کا انعقاد بھی اسی سلسلے میں تھا۔ جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے معتبر ناموں نے شرکت کی۔ گلابی اسکارف میں لپٹی یہ خواتین مسکراتے ہوئے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھیں۔

موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

چکن فحیتا پیزا

اشیاء:-
پیزا ڈوکے اجزاء:-

میدہ

خمیر

انڈا

خشک دودھ

نمک

تیل

فلنگ کے لیے:-
چکن (بون لیس)

نمک

پسی سفید مرچ

ثابت سفیدہ زیرہ

پسا اورک کہن

دوسر شازر ساس

موزر یلا چیز

چیڈر چیز

پیزا ساس

تیل

پیزا ساس کے اجزاء:-

ٹماٹر

پیاز

تیل

پسا لہسن

نمک

پسی لال مرچ

نمک

اور یگانو

دوکپ

ڈیڑھ چائے کا چمچ

ایک عدد

ایک کھانے کا چمچ

چوتھائی چائے کا چمچ

دو کھانے کے چمچ

آدھا کلو

حسب ذائقہ

آدھا چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

ایک کھانے کا چمچ

سو گرام

سو گرام

آدھا کپ

حسب ضرورت

ایک پاؤ

ایک عدد

ایک کھانے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

حسب ذائقہ

آدھا چائے کا چمچ

حسب پسند

آدھا چائے کا چمچ

تھام

پسی سیاہ مرچ

سرکہ

ٹاپنگ کے لیے:-

ٹماٹر

شملہ مرچیں

ترکیب:-

ڈو بنانے کے لیے ایک پیالے میں خمیر،
انڈے، خشک دودھ، نمک اور تیل اور میدہ ڈال کر مکس
کریں اور سادے پانی سے آٹا گوندھ لیں۔ ایئر
ٹائٹ باکس میں بند کر کے ایک سے دو گھنٹے کے لیے
رکھ دیں تاکہ اچھی طرح خمیر اٹھ جائے۔

فلنگ کے لیے نمک، پسی سفید مرچ بھون کر پسا
ہوا زیرہ، پسا اورک کہن اور دوسر شازر ساس ملا کر
گوشت پر اچھی طرح لگا دیں اور آدھے گھنٹے تک
میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ساس پین میں
تیل گرم کریں اور اس میں میرینیٹ کیے ہوئے
گوشت کو ڈال کر فرائی کر لیں۔ پیزا پین کو چکنا
کر کے ڈوکو تیل کر اس پر پھیلا دیں۔ کانٹے سے
نشان لگائیں۔

پیزا ساس کی ترکیب:

تکسی پٹیلے میں تیل گرم کر کے اس میں پسا
لہسن ڈال کر فرائی کریں، اس کے بعد اس میں پیاز
ڈال کر ساتے کریں۔ ٹماٹر، نمک، پسی لال مرچ،
نمک، اور یگانو، تھام، پسی سیاہ مرچ اور سرکہ ڈال
کر پکائیں۔ جب پیاز گل جائے تو کچپ ڈالیں،
چولہے سے اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے گرائنڈر میں
پیس لیں۔

پیزا کی ٹاپنگ کے لیے:

پیزا بمیں پر پیزا ساس پھیلا دیں۔ اس کے

لال مرچ، پازیرہ، پیادھنیا اور پیسی ہلدی، دہی،
ٹماٹر، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں شامل کر دیں۔
تھوڑی دیر بھونیں، خوشبو آنے لگے تو مزید دو تین
منٹ تک پکائیں۔ آخر میں پچھلی شامل کریں اور
نمک ڈال دیں۔ ڈھکن سے ڈھک کر پندرہ منٹ
تک پکائیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر گارنش
کر کے گرم گرم پیش کریں۔

مکھانے اور کھوئے کے لڈو

اشیاء:-

دو کپ	کھویا
ایک کپ	مکھانے
دو چائے کے چمچے	کھی
تین مکھانے کے چمچے	میدہ
آدھا کپ	چینی
ایک چٹکی	ہر رنگ
ایک چٹکی	پیلارنگ
حسب ضرورت	گلینر چیری
	ترکیب:-

ایک چائے کا چمچ بھی گرم کر کے مکھانے تل
لیں۔ کھویا ڈال کر فرانی کریں۔ چینی ڈال کر مکس
کریں، چینی گل جائے تو کھویا پلیٹ میں نکال لیں۔
سوس پن میں بقیہ بھی گرم کر کے اس میں میدہ ڈال کر
ہلکی آچ پر بھونیں کریں۔ خوشبو آنے لگے تو کھوئے
میں مکس کر دیں۔

کھوئے کے دو حصے کر لیں۔ ایک میں پیلا
رنگ، دوسرے میں ہر رنگ مکس کر لیں۔ پہلے حصہ پر
ہر حصہ رکھ کر بانٹ بتالیں۔ اس کے اوپر مکھانا اور گلینر
چیری چوپ کر کے لگا دیں اور پیش کریں۔



بعد فرانی کیا ہوا گوشت، موزریلا چیز، چیڈر چیز،
ٹماٹر اور شملہ مرچ ڈال دیں۔ اوون کو پہلے سے گرم
کر لیں۔ پیزا پین کو پہلے سے گرم اوون میں رکھ کر
پندرہ سے بیس تک 180c پر بیک کر لیں۔

پنیر پھل جائے اور پیزا کی اوپری سطح سنہری
ہونے لگے تو پیزا ٹرے کو اوون سے نکال لیں۔
مزے دار چکن فلیٹا پیزا تیار ہے، گرم گرم پیش
کریں۔

(اوون نہ ہو تو کسی بڑے تیلے یا توتے پر بھی
بنایا جاسکتا ہے)

فش ریڈ کری

اشیاء:-

آدھا کلو	اشیاء پچھلی
ایک عدد	پاز
تین مکھانے کے چمچے	تیل
ایک انچ کا کلڈا	دار چینی
ایک عدد	تیز پات
دو چائے کے چمچے	پیادورک، لہسن
ایک چائے کا چمچ	نہی لال مرچ
ایک چائے کا چمچ	پاسفید زیرہ
ایک چائے کا چمچ	پیادھنیا
چوتھائی چائے کا چمچ	پیسی ہلدی
آدھا کپ	دہی
تین سے چار کپ	ٹماٹر
دو عدد	ہری مرچیں
دو مکھانے کے چمچے	ہرا دھنیا
حسب ذائقہ	نمک
	ترکیب:-

ایک برتن میں تیل ڈال کر گرم کریں۔ پاز
شامل کریں، پاز کا رنگ سنہرا ہو جائے تو اس میں
پیادورک، لہسن ڈال کر چمچ چلاتے ہوئے مکس
کریں۔ خوشبو آنے لگے تو دار چینی، تیز پات، پیسی

اپ کا باورچی خانہ

حمیرا رضا..... لاہور

ایک عدد
شملہ مرچ
نمک
کالی مرچ
پسا گرم مسالا
لہسن
انڈے
ترکیب:-

چکن کو لہسن ڈال کر ابالیں اور ریشہ کر لیں۔
ایک باؤل میں ابلی ہوئی چکن، ابلے آلو، باریک
کٹی بند گوبھی، شملہ مرچ، نمک، کالی مرچ، پسا گرم
مسالا ڈال کر اچھی طرح کس کریں اور کباب
بنالیں۔ ہر کباب کو انڈے میں ڈپ کر کے شیلو فرائی
کر لیں۔ اب اسے مزے دار چلی گارلک ساس
کے ساتھ مہمانوں کو پیش کریں۔ یہ کٹلس اتنے لذیذ
ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے لوگ باقی چیزیں چھوڑ
دیتے ہیں۔

3- کچن کی صفائی میرے نزدیک بہت زیادہ
اہمیت رکھتی ہے۔ دن میں دو سے تین بار تو کچن لازمی
دھونی ہوں ورنہ ایک عجیب گندگی کا احساس باقی رہتا
ہے۔ روزانہ ہی چولہا صاف کرنی ہوں جس کے بغیر
بالکل گزرا نہیں ہوتا۔ سالوں کے ڈبے اور خاص کر
ان کے ڈھکن کی صفائی کا بے حد خیال رہتا ہے۔
میری کی جانے والی کچن کی ہفتہ وار صفائی کا اندازہ
آپ خود لگا سکتی ہیں، ہا ہا۔

4- صبح کا ناشتہ سارا دن چاق و چوبند رہنے میں
اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہم نہ صرف شوق سے ناشتہ
کرتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر فرمائشی پروگرام بھی چلتا
رہتا ہے۔ ابھی ملک ٹیک تو بھی انڈیا پرائیڈ، بھی سالن

1- کھانا پکاتے وقت مجھے ہر حال میں اپنی
اور شوہر کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ میں تو
کھانا کھا ہی لوں گی، مگر وہ ہرگز، ہرگز نہ کھائیں
گے۔ غذائیت تو اور بھی ضروری ہے، خوش رنگ
کھانا اگر غذائیت کے بغیر ہو تو کس کا جی چاہے گا
پکانے کا۔ انسان صحت کی دولت سے مالا مال ہو تو
زندگی حسین لگتی ہے۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے
میں صحت کا ستیاناس نہیں کر سکتی لہذا صحت پہلے نمبر
پر۔

2- سچی بات ہے مہمانوں کی اچانک آمد
بہت مزادیتی ہے لیکن جیسے جیسے زمانہ ماؤرن ہوتا
جا رہا ہے، یہ روایت دم توڑ رہی ہے۔ اب مہمانوں
کی اچانک آمد لوگوں پر خوش گوار تاثر نہیں چھوڑتی
(معذرت کے ساتھ)۔ مہمان آنے سے پہلے ہی
فون پر اپنی آمد کی اطلاع کر دیتے ہیں۔ میرے
مہمانوں کی آمد کے سلسلے میں میرے ساتھ تو ایک
ولچسپ معاملہ بنتا ہے۔ جب بھی چیزیں بنا کر فریز
کرتی ہوں، اتنے عرصے تک کوئی نہیں آتا اور جیسے
ہی خود کھا پی کر ختم کرتی ہوں۔ مہمانوں کی آمد
شروع ہو جاتی ہے، ہے نا عجیب بات۔ بہر حال
کھانا پکانے کے معاملے میں سکھڑ ہوں، بالکل نہیں
گھبراتی۔

چکن کٹلس

تلنے کے لیے
ایک باؤل
آدھا کلو
آدھا کپ

اجزاء:-
تیل
چکن
آلو
بند گوبھی

اور روٹی۔ غرض مہینے کے تیس دن مختلف طرح کا ناشتا چلتا ہے۔ بدلتے موسموں کے ساتھ ناشتے میں تبدیلی بھی آتی رہتی ہے۔ میرے شوہر کو میرا بنانا ہوا انڈے پیاز کا سالن بہت اٹریکٹ کرتا ہے اور اکثر اس کی فرمائش بھی کرتے ہیں۔

یہ سب ہی کو بنانا آتا ہے، پھر بھی ترکیب حاضر ہے۔

اجزاء:-

انڈے

ثماثر

دو سے تین عدد

دو سے تین عدد

آدھی کٹھی

ایک انچ کا ٹکڑا

حسب ذائقہ

آدھا چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

تین کھانے کے چمچے

ہری مرچیں

ہرا دھنیا

ادرک

نمک

پسی لال مرچ

سوکھا دھنیا

پسی ہلدی

پسا گرم مسالا

تیل

ترکیب:-

ایک پین میں تیل گرم کریں، اب اس میں کٹی ہوئی پیاز ڈال کر ہلکا گلابی ہونے تک تل لیں۔ اس کے بعد اس میں کٹے ثماثر، ادرک، کٹی ہری مرچیں، نمک، پسی لال مرچیں، سوکھا دھنیا، پسی ہلدی ڈال کر پانچ منٹ پکائیں۔ ثماثر نرم ہو جائیں اور تمام مسالے یک جان ہو جائیں تو تین عدد پھینٹے ہوئے انڈے ڈال کر تیزی سے چمچ چلائیں۔ انڈے ایک بار یک ہو جائیں اور تیل اوپر آجائے تو ہرا دھنیا اور پسا گرم مسالا چھڑک کر پرائیڈوں کے ساتھ پیش کریں۔ لذیذ انڈا پیاز تیار ہے۔

5۔ مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے

ہیں۔

سچی بات ہے شادی سے پہلے بہت کم اور

شادی کے بعد بے تحاشا۔ باہر کھانا کھانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں کراچی سے رخصت ہو کر لاہور آئی ہوں، اس لیے بھی لاہور کے روایتی کھانے اور یہاں کی فوڈ اسٹریٹ کا چارم مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں گھر سے باہر کھانا کھاؤں اور کچھ میرے شوہر کا اچھا مزاج اور مجھے کچی لاہورن بنانے کا جنون بھی مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ اسی لیے بھی باہر جا کر کھاتے ہیں اور کبھی پیک کروا کر گھر لے آتے ہیں۔ سالگرہ وغیرہ پر میں اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے کو ترجیح دیتی ہوں اور سب کو کھلا کر داد وصول کرتی ہوں۔

6۔ بالکل کھانا پکاتے وقت موسم کو لازمی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے بے موسمی کھانے بہت برے لگتے ہیں۔ جیسے گرمیوں میں، میں جتنے شوق سے کڑھی چاول کھا سکتی ہوں، سردیوں میں اس ڈش کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔ اسی طرح پائے گرمیوں میں کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

7۔ کھانا محنت کے بغیر کبھی بھی اچھا نہیں بن سکتا۔ اس لیے ہمیشہ بہت لگن اور شوق سے پکاتی ہوں۔

8۔ کچن ٹپ یہی ہے کہ جن لوگوں کے دانت بہت پیلے ہوں اور بہت صفائی کے بھی نہ چمکتے ہوں۔ ایک چائے کا چمچ لیموں کا رس، ایک چمچ کھانے کا سوڈا اور ایک چمچ سرسوں کا تیل لیں اور انہیں اچھی طرح کس کریں اور نو تھ برش پر لگا کر دانت صاف کریں۔ خیال رہے یہ عمل مہینے میں ایک بار کریں پھر آہستہ آہستہ وقت بڑھا کر ہفتے میں ایک بار کرنا شروع کر دیں۔ دانت ان شاء اللہ چمک اٹھیں گے اور حساس دانتوں اور مسوڑھوں والے اس عمل کو نہ کریں۔



عُصْبَان تعلیمی اور طبی تحریک

تمام ماہرین علم اور ماہرین نفسیات محسوس کرنے لگے ہیں کہ نماز، مستحکم مذہبی عقیدہ پریشانی، ڈر، خوف اور اعصابی کشمکش دور کرنے میں مدد دیتا ہے جو کہ ہماری نصف سے زیادہ بیماریوں کے ذمہ دار ہیں۔
”جو شخص صحیح معنوں میں مذہب کا پابند ہوتا ہے، کبھی اعصابی اور ذہنی امراض کا شکار نہیں ہوتا۔“
جہاں تک مسائل کا معاملہ ہے، ہمیں اپنے مسائل پر دھیان تو ضرور دینا چاہیے لیکن پریشان ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ذہنی پریشانیاں دور کرنے کا بہترین حل یہ ہے کہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیں۔ گہرا یقین رکھیں کہ اللہ جو کچھ کرے گا، بہتر کرے گا اور جو کچھ آج تک ہوا ہے۔ اس میں اللہ کی کوئی بہتری ہوگی۔ یہ یقین آپ کی ساری پریشانیاں دور کر دے گا۔

انسان دعا سے زیادہ طاقتور چیز کوئی نہیں پیدا کر سکتا۔

☆☆☆

ممتاز جہاں کراچی

س: سولہ سال کی عمر میں شادی ہوئی تھی میری۔ چوبیس سال شادی کو ہو گئے۔ جاب کرتی ہوں۔ اگر میں جاب نہ کرتی تو پتا نہیں میرا کیا بنتا۔ کیسے بتاؤں آپ کو۔ بہت دل دکھاتی ہیں میری ساس، حالانکہ میں ہر طرح سے ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی ہوں پر وہ خوش نہیں ہوتیں مجھ سے۔ میری بیٹی ماشاء اللہ سے اکیس سال کی ہو گئی ہے۔ میں نے میٹرک کے بعد اپنی بیٹی کو کالج نہیں بھیجا۔ ”بیٹا تم پر انیویٹ پڑھ لو، دادو اب گھر میں اکیلے نہیں رہ سکتیں۔“ میری بیٹی بی بی کام کر رہی ہے۔ صبح نو بجے میں آفس جاتی ہوں۔ شروع کا وقت بھی مشکل تھا لیکن پچھلے پانچ سال سے بہت عجیب صورت حال ہے۔ ساس کے ڈر سے میں اپنے شوہر سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ ہماری ازدواجی زندگی میں بہت مسائل ہیں۔ وجہ میری ساس یعنی اماں کی وجہ سے۔ ہم ساتھ بیٹھ نہیں سکتے۔ کوئی بات نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ ازدواجی رشتے کو بھی چوروں کی طرح نبھانا پڑتا ہے۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ سوئی ہوں اور میرے شوہر اپنی اماں کے ساتھ سوتے ہیں۔ اماں عجیب سوچ کی مالک ہیں۔ شاید چالیس یا پینتالیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اپنی بچوں کو خود کام کر کے یہاں تک پہنچایا ہے۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ میں مانتی ہوں انہوں نے بہت مشکل وقت گزارا لیکن وہ ہمیشہ حاکم ہی رہی ہیں اپنے بچوں پر۔ ان کی مرضی کے بغیر گھر میں پتا بھی نہیں مل سکتا۔ پچھلے کچھ سالوں سے یہ مسئلہ ہو گیا ہے، ہمیں قریب نہیں دیکھ سکتیں۔ اب کیا بتاؤں آپ کو۔ لڑائی بھی اکثر اسی بات کو لے کر شروع ہوتی ہے، پہلے پہل تو بچوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا، لڑائی کیوں ہوئی۔ وجہ کیا تھی۔ اب تو بچے بھی سمجھ گئے ہیں۔ میں اور میرے شوہر شرمندہ ہو جاتے ہیں ان لڑائیوں سے۔ اگر میں ان گزرے سالوں پر لکھنا شروع کروں تو پتا نہیں کتنی کہانیاں بن جائیں، بس زندگی گھر اور آفس کے درمیان تک کی ہے یا پھر کسی نند کے گھر تک جانے کی۔ کم از کم دس سال ہو گئے ہیں ہماری فیملی، ہم سب

اکٹھے باہر نہیں گئے۔ کسی کے گھر جانا ہو تو ہم میاں بیوی اکیلے نہیں جاسکتے۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں بھی جاسکتی ہوں، پر میاں کے ساتھ جانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اول تو میں جاتی نہیں، اگر کہیں چلی گئی تو دو دن ان کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ عجیب ہی منطق ہے، ان کی سمجھ سے باہر اور پھر پوری فیملی میں واویلا مچاتی ہیں۔ یہ لوگ الزام لگاتے ہیں مجھ پر، میں ان پر نظر رکھتی ہوں۔ اتنی عجیب باتیں کرتی ہیں، میں بیان نہیں کر سکتی۔ بس سب یہی تلقین کرتے ہیں صبر کرو اور میں کر رہی ہوں کہ گھر کا ماحول خراب نہ ہو۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ بہت کم جاتی ہوں، اماں گھر میں ہوں تو میں رک جاتی ہوں یا میرے شوہر رک جاتے ہیں یا پھر سب اکٹھے ہی جاتے ہیں۔ کسی نند یا دیور کے پاس یا ان کے گھر جاتی ہیں تو دھیان سارا ہماری طرف ہوتا ہے۔ کہتی ہیں، میں جا رہی ہوں، تم لوگ انجوائے کرنا، فون پر باتیں سناتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم انہیں کہیں جانے کا نہیں کہتے۔ بہت الجھی ہوئی زندگی ہے میری، بس اللہ سے یہی دعا ہے مجھے صبر دے۔ اس سب کو برداشت کرنے کا۔ میری شوہر سے بھی لڑائی نہیں ہوئی اور جب بھی بات ہوتی ہے اماں ہی وجہ رہیں۔ بہت کچھ سہا ہے۔ میں یہ جانتی ہوں، میں نے بھی اماں کا برا نہیں چاہا۔ ان کو خوش کرنے کے لیے خود کو مار دیا ہے میں نے، پر یہ سب کب تک چلتا رہے گا۔

ج: پیاری عائشہ! آپ کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ حسد کو اسی لیے برا کہا گیا ہے کہ یہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ انسان کی ساری نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ آپ کی ساس آپ ہی کے ساتھ برا نہیں کر رہی ہیں، وہ اپنے بیٹے کے ساتھ بھی زیادتی کر رہی ہیں۔ اس کی بہت ساری وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی ملکیت سمجھتی ہیں اور اس میں دوسری عورت کی شراکت برداشت نہیں کر سکتیں۔ منفی جذبے کسی نہ کسی حد تک ہر انسان میں پائے جاتے ہیں لیکن بہت سے لوگ اپنی خامیوں کو سمجھ کر ان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی بہترین رویہ ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل تو ہے لیکن اس پر آپ عمل نہیں کر سکتیں۔ اس کے لیے آپ کے شوہر اور نندوں کا تعاون بہت ضروری ہے۔ وہ اپنی ماں کو پیار محبت سے سمجھا سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ کے شوہر ان کو یقین دلائیں کہ وہ اپنی ماں سے محبت کرتے ہیں اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ ساس کے اس رویہ کی ایک وجہ عدم تحفظ کا احساس بھی ہو سکتی ہے۔

آپ کے لیے مشورہ یہی ہے کہ آپ اپنی زندگی کا خوب صورت ترین حصہ ان پابندیوں کی نذر کر چکی ہیں۔ آپ نے بہت عرصہ صبر و تحمل سے ان کی زیادتیوں کو برداشت کیا ہے۔ اب آپ کا احتجاج کرنا یا کوئی فیصلہ کرنا آپ کی ساری عمر کی ریاضت پر پانی پھیر دے گا۔ بہتر یہی ہے کہ جہاں اتنا عرصہ برداشت کیا ہے، آگے بھی برداشت کر لیں اور اللہ تعالیٰ سے بہتر صلہ کی امید رکھیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے، گزر جاتی ہے اور پتا بھی نہیں چلتا۔ انسان کو زندگی ایسے گزارنا چاہیے کہ اس سے متعلقہ لوگ اسے اچھے لفظوں میں یاد کریں۔

ممکن ہو تو کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں۔ بعض اوقات ذہنی دباؤ بھی مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ انسانی نفسیات بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ کچھ دوائیں ایسی ہیں جو ایسی کیفیت میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

☆



لیموں سے حسن کی حفاظت کیجیے

قدرت نے انسان کے لیے زمین سے جو بھی چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں انسان کے لیے شفا رکھی ہے۔ بہت سے پھل، سبزیاں ایسی ہیں جو انسان کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ ان میں ایک لیموں بھی ہے۔ لیموں کا استعمال یوں تو کھانوں میں ہی ہوتا ہے لیکن اگر آپ اپنے حسن کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں تو آپ کو لیموں کو اپنا ساتھی بنانا ہی پڑے گا۔ اپنے اس کالم میں ہم لیموں کے ذریعے حسن کی حفاظت کے کچھ گرا آپ کو بتاتے ہیں۔

چہرہ تروتازہ ہونا

☆ ایک انڈے کی سفیدی میں بادام کا تیل اور لیموں کا رس ایک چائے کا چمچ ملا کر چہرے پر لگائیں اور آدھے گھنٹے بعد چہرہ صاف کر کے عرق گلاب روٹی کی مدد سے ضرور لگائیں۔

☆ ہاتھوں کی انگلیاں سیاہ ہوں تو آدھا کپ دودھ، ایک بڑا چمچ عرق گلاب، چند قطرے لیموں۔ یہ تینوں چیزیں ملا کر ہاتھوں پر مالش کریں۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہاتھ دھو لیں۔ چند دنوں میں آپ کے ہاتھوں کی سیاہ انگلیاں سفید ہو جائیں گی۔

بالوں کے لیے

☆ لیموں آپ کے بالوں کے لیے ایک بہترین کنڈیشنر بھی ہے۔ نیم گرم پانی میں دو لیموں نیچوڑ کر اس پانی سے بالوں کو کنڈیشنر کیجیے اور صاف پانی سے دھو لیں۔

کہنیاں کالی ہونا

☆ کہنیاں، گھٹنے، انگلیوں کے جوڑوں کے بد

رنگ، کالا ہونے کی شکایت عام ہے۔ اس کا نہایت آسان علاج یہ ہے کہ استعمال کے بعد لیموں کے چھلکوں کو ان جگہوں پر رگڑیں جیسا کہ مساج کرتے ہیں۔ کچھ ہی عرصے کے متواتر استعمال سے آپ کے جسم کے یہ حصے صاف ہو جائیں گے۔

خشک جلد کے لیے

☆ چہرے کی خشک جلد کو نرم بنانے کے لیے ایک چمچ روغن بادام میں ایک چمچ لیموں کا عرق ملا لیں۔ اس آمیزے کی آہستہ آہستہ چہرے پر مالش کریں۔ روزانہ دس منٹ تک اس مساج کو کرنے سے چہرہ شگفتہ ہو جائے گا۔

☆ چہرے کی تروتازگی کے لیے ہفتے میں ایک بار بالائی میں لیموں کا عرق ملا کر چہرے پر لگائیں اور پھر چہرہ کسی اچھے صابن سے دھو لیں۔

جھریوں کے لیے

☆ چہرے کی جھریاں دور کرنے کے لیے چار کھانے کے چمچے شہد میں ایک لیموں کا رس ملا کر رکھ لیں۔ اس کا لپ روزانہ چہرے پر لگائیں اور پندرہ منٹ کے بعد چہرہ دھو لیں۔ پندرہ بیس دن کے متواتر استعمال سے جھریاں دور ہو جائیں گی۔

چکنی جلد کے لیے

☆ اگر آپ کا چہرہ بہت چکنی ہے تو ہفتے میں تین بار کھیرے کے رس میں ایک چمچ لیموں کا رس ملا کر چہرے پر اس آمیزے کو لگائیں۔ پندرہ منٹ کے بعد چہرہ دھو لیں۔ اس سے چہرے پر نظر آنے والا تیل دور ہو جائے گا۔

☆



لیموں سے حسن کی حفاظت کیجیے

قدرت نے انسان کے لیے زمین سے جو بھی چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں انسان کے لیے شفا رکھی ہے۔ بہت سے پھل، سبزیاں ایسی ہیں جو انسان کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ ان میں ایک لیموں بھی ہے۔ لیموں کا استعمال یوں تو کھانوں میں ہی ہوتا ہے لیکن اگر آپ اپنے حسن کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں تو آپ کو لیموں کو اپنا ساتھی بنانا ہی پڑے گا۔ اپنے اس کالم میں ہم لیموں کے ذریعے حسن کی حفاظت کے کچھ گرا آپ کو بتاتے ہیں۔

چہرہ تروتازہ ہونا

☆ ایک انڈے کی سفیدی میں بادام کا تیل اور لیموں کا رس ایک چائے کا چمچ ملا کر چہرے پر لگائیں اور آدھے گھنٹے بعد چہرہ صاف کر کے عرق گلاب روٹی کی مدد سے ضرور لگائیں۔

☆ ہاتھوں کی انگلیاں سیاہ ہوں تو آدھا کپ دودھ، ایک بڑا چمچ عرق گلاب، چند قطرے لیموں۔ یہ تینوں چیزیں ملا کر ہاتھوں پر مالش کریں۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہاتھ دھو لیں۔ چند دنوں میں آپ کے ہاتھوں کی سیاہ انگلیاں سفید ہو جائیں گی۔

بالوں کے لیے

☆ لیموں آپ کے بالوں کے لیے ایک بہترین کنڈیشنر بھی ہے۔ نیم گرم پانی میں دو لیموں نیچوڑ کر اس پانی سے بالوں کو کنڈیشنر کیجیے اور صاف پانی سے دھو لیں۔

کہنیاں کالی ہونا

☆ کہنیاں، گھٹنے، انگلیوں کے جوڑوں کے بد

رنگ، کالا ہونے کی شکایت عام ہے۔ اس کا نہایت آسان علاج یہ ہے کہ استعمال کے بعد لیموں کے چھلکوں کو ان جگہوں پر رگڑیں جیسا کہ مساج کرتے ہیں۔ کچھ ہی عرصے کے متواتر استعمال سے آپ کے جسم کے یہ حصے صاف ہو جائیں گے۔

خشک جلد کے لیے

☆ چہرے کی خشک جلد کو نرم بنانے کے لیے ایک چمچ روغن بادام میں ایک چمچ لیموں کا عرق ملا لیں۔ اس آمیزے کی آہستہ آہستہ چہرے پر مالش کریں۔ روزانہ دس منٹ تک اس مساج کو کرنے سے چہرہ شگفتہ ہو جائے گا۔

☆ چہرے کی تروتازگی کے لیے ہفتے میں ایک بار بالائی میں لیموں کا عرق ملا کر چہرے پر لگائیں اور پھر چہرہ کسی اچھے صابن سے دھو لیں۔

جھریوں کے لیے

☆ چہرے کی جھریاں دور کرنے کے لیے چار کھانے کے چمچے شہد میں ایک لیموں کا رس ملا کر رکھ لیں۔ اس کا لپ روزانہ چہرے پر لگائیں اور پندرہ منٹ کے بعد چہرہ دھو لیں۔ پندرہ بیس دن کے متواتر استعمال سے جھریاں دور ہو جائیں گی۔

چکنی جلد کے لیے

☆ اگر آپ کا چہرہ بہت چکنی ہے تو ہفتے میں تین بار کھیرے کے رس میں ایک چمچ لیموں کا رس ملا کر چہرے پر اس آمیزے کو لگائیں۔ پندرہ منٹ کے بعد چہرہ دھو لیں۔ اس سے چہرے پر نظر آنے والا تیل دور ہو جائے گا۔

☆